قبر کا بھید

اور

صابر حسین راجپوت

A contact loved ones.
ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.
پاکستانی پوائنٹ
www.PakistaniPoint.Com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اوّل ——— جنوری ۱۹۸۱ء
بار دوم ——— اکتوبر ۱۹۸۱ء
بار سوم ——— نومبر ۱۹۸۳ء
بار چہارم ——— دسمبر ۱۹۸۴ء
بار پنجم ——— مارچ ۱۹۸۷ء

قیمت -/۵۰ روپے

● آپ اپنا آرڈر بذریعہ وی پی منگوائیں آدھا ڈاک خرچ ہم ادا کریں گے ● تاریخ کے طالب علموں کیلئے خاص رعایت

مکتبہ دستان پرائیویٹ لمیٹڈ ۲۶ پٹیالہ گراؤنڈ لاہور

فون: 7356541

فہرست

چپیتا انگریز لے گئے	۹
قبر کا بھید	۲۶
پاگل کی ماں	۵۵
شانو کمہار اور مست بھینسا	۸۵
حاجی اور حاجی کا ڈٹو	۱۱۱
ہمارے بھیڑیئے، شاہ جی کے جن	۱۴۴
رکھ سلیمان کی ایشری	۱۸۰
دیوراں کا نیلا	۲۲۳

پیش لفظ

صابر حسین راجپوت کی شکاری کہانیوں کا ایک مجموعہ ـــــ "لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ" ـــــ پیش کیا جا چکا ہے۔ اب آٹھ کہانیوں کا دوسرا مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

جو قارئین صابر حسین راجپوت کی تحریروں سے واقف نہیں وہ شاید ان کی کہانیوں کو عام قسم کے شکار کی کہانیاں سمجھ کر نظریں پھیر لیں۔ ہم ان سے استدعا کریں گے کہ اس کتاب کی صرف ایک کہانی پڑھ لیں۔ یہ آدم خور شیروں کی ترجمہ کہانیاں نہیں، یہ چشم دید واقعات ہیں۔ ان میں آپ کو صرف شکار نہیں بلکہ حقیقی زندگی کے چونکا دینے والے ڈرامے ملیں گے۔ ان کے کرداروں کو آپ اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں۔

والدین کو آج کل یہ مسئلہ پریشان کیے ہوئے ہے کہ بچے چوری چھپے اخلاق سوز کہانیاں پڑھتے ہیں اور اخلاقی، نفسیاتی اور جسمانی تباہی کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔

آپ بچوں اور نوجوانوں کو کہانیاں پڑھنے سے نہیں روک سکتے۔ یہ انسانی فطرت کا ایسا مطالبہ ہے جسے آپ مسترد نہیں کر سکتے۔ انہیں اخلاقی اور جسمانی تباہی

سے بچائے رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انہیں کہانیاں پڑھنے سے نہ روکیں، البتہ انہیں ایسی کہانیاں پڑھنے کو دیں جن میں کہانی کے وہ تمام لوازمات موجود ہوں جنہیں وہ پسند کرتے ہیں لیکن کہانیاں مخرب الاخلاق نہ ہوں۔

یہاں سے یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ ایسی کہانیاں کہاں سے لائیں؟ ــــ اس مسئلے کا حل ہمارے پاس ہے۔ مکتبۂ داستان لمیٹڈ ایسی ہی کہانیاں پیش کرتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ مجموعہ ہے جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ان سچی کہانیوں میں آپ کو پاکستان کی مردانگی کے کارنامے اور جذبات کو جھنجھوڑ دینے والے واقعات ملیں گے۔ یہ کہانیاں اُن نوجوانوں کا لہو گرم رکھنے کے لیے پیش کی جا رہی ہیں جنہیں اخلاق سوز کہانیوں نے برف کے تودے بنا رکھا ہے۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

چیتا انگریز لے گئے

لڑکی نے کہا ــــ "میں اب واپس
چلی جاؤں گی۔ لوگ سچ کہتے تھے کہ
یہ آدمی بزدل اور فریبی ہے۔"

چیتا ہمارے ایک شکاری کتے کو مار کر کھا رہا تھا اور بیس پچیس قدم دور ہمارا ایک نوجوان دوست جو اس کتے کا مالک تھا لہولہان پڑا تھا۔ وہ شاید زندہ نہیں تھا۔ یہ منظر ڈراؤنا خواب ہی ہو سکتا تھا۔ ہم افریقہ کے جنگلوں میں نہیں اپنے پوٹھوہار کے ٹیلوں، ٹیکریوں، گھاٹیوں اور گہرے نشیبوں کے علاقے میں شکار کھیلنے گئے تھے۔ اس علاقے میں صرف ایک درندہ ہوا کرتا تھا جسے ہم اپنی زبان میں بگھیاڑ کہا کرتے تھے۔ اردو میں اسے بھیڑیا کہتے ہیں۔ یہ بھی کم ہی نظر آیا کرتا تھا۔ اس کی صرف آواز سنائی دیا کرتی تھی۔ ہم چونکہ شکاری تھے اس لیے دو تین بار بھیڑیوں سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ آپ کو ان کی کہانیاں سنا چکا ہوں۔ اب تو آبادیاں اور سڑکیں زیادہ ہو جانے کی وجہ سے بھیڑیے ناپید ہو گئے ہیں۔

ہمارے علاقے میں شیر چیتے کبھی نہیں آئے تھے۔ میں نے سرکس میں چیتا دیکھا تھا یا ان لوگوں کے پاس دیکھا تھا جو ایک آنے کے ٹکٹ پر مختلف درندے دکھایا کرتے تھے۔ یہ میلوں میں پنجرے رکھ کر ارد گرد قناتیں اور شامیانے لگا کر خاصے پیسے کما لیا کرتے تھے۔ سکول کی کتابوں میں چیتے کی تصویریں دیکھی تھیں۔ اور اس روز ایک آزاد چیتا ہماری شکاری ٹیم کے ایک کتے کو کھا رہا تھا۔ اس سے پہلے شکار کے دوران ہمارے ایک دوست پر ریچھ نے حملہ

Pakistanipoint.com
Waqar Azeem

کر دیا تھا۔ آپ کو میری کہانی "پوٹھوہار میں ریچھ کہاں" یاد ہوگی۔ ہم اسے جنگلی ریچھ سمجھتے تھے لیکن مار لینے کے بعد دیکھا کہ اس کی ناک میں لوہے کا کڑا اور گلے میں پٹہ تھا۔ یہ ریچھ کا تماشہ دکھانے والوں کا تھا۔ بدمست ہوکر اُس نے اپنے مالک کو زخمی کیا اور بھاگ آیا تھا۔

اگر یہ واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تو ہم چیتے کو چیتا نہ سمجھتے، اسے شرار سمجھ کر بھاگ جاتے۔ میں نے اور میرے اُن دو تین دوستوں نے جنہوں نے سرکس یا درندے دکھانے والوں کے ہاں درندے [illegible] سے بھاگا ہُوا چیتا ہے۔

اُس روز ہم نکلے تو شکار کو تھے لیکن موڈ سیر سپاٹے کا اور وقت گزارنے کا تھا۔ ہم ہنستے کھیلتے گاؤں سے نکل گئے اور پہاڑیوں کا رُخ کر لیا جو آپ راولپنڈی اور جہلم کے درمیان دیکھا کرتے ہیں۔ سورج نکلنے تک ہم دُور نکل گئے تھے۔ علاقہ ٹیلوں اور وسیع اور گہرے نشیبوں والا آ گیا۔ کتّوں کو ہم نے کھلا چھوڑ دیا۔ اچانک ایک تازی کتّا ہوا ہو گیا۔ کتّوں کی پوری ٹیم اُس کے پیچھے دوڑ پڑی۔ ہم نے دُور ایک خرگوش کو انتہائی رفتار سے بھاگتے دیکھا۔ پھر ایک کی بجائے دو خرگوش ہو گئے۔ ہم بھی دوڑ پڑے، اور جب ہم کتّوں تک پہنچے تو ایک خرگوش کے چند ایک بال نظر آئے۔ کُتّے اس کا صفایا کر چکے تھے۔ دوسرا خرگوش کہیں غائب ہو گیا تھا۔ یہی ہمارا شکار ہوتا تھا۔ اس میں سے ہمیں کچھ بھی وصول نہیں ہوتا تھا سوائے تھکن اور پسینے کے، اور کبھی پسینے کے ساتھ خون بھی نکل آتا تھا۔ یہ تو میں نے پہلی کہانی میں بتا دیا تھا کہ لہو گرم رکھنے کا اک بہانہ تھا۔ ہماری ماؤں کا لہو تو اسی وقت گرم ہو جاتا تھا جب ہم شکار کو روانہ ہوتے تھے۔

ہم اور آگے چلے گئے۔ رات کے جانوروں کی بُو کتّوں کو پریشان اور بے چین کر رہی تھی۔ ہر طرف گیدڑوں وغیرہ کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ ہم ایک گہرائی میں اُتر گئے۔ یہ ایک خشک ندی کا پاٹ تھا جسے ہماری زبان میں "کس" یا "کسّی" کہتے ہیں۔ اس کے دونوں طرف مٹی کی بہت اونچی اونچی

دیواریں کھڑی تھیں۔ کس میں کہیں کہیں پانی تھا۔ گاؤں سے نکلے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ ہم ایک ہری بھری جگہ بیٹھ گئے۔ سب نے پراٹھے کھولے اور اکٹھے رکھ کر کھانے اور گپ شپ لگانے لگے۔ اُس زمانے میں ہمیں یہ سہولت حاصل تھی کہ سیاسی پارٹیاں نہیں تھیں۔ شہروں میں ہوں گی دیہاتی لوگ ابھی ان سے محفوظ تھے۔ الیکشن اور پرچیوں کے ہنگامے نہیں تھے۔ ہمارے ہاں کوئی جھوٹے وعدے لے کر پرچیاں مانگنے نہیں آیا کرتا تھا۔ لوگ اُس زمانے میں سچ بولا کرتے تھے۔ ہماری دشمنی اور عداوت میں بھی سچ اور خلوص ہوتا تھا۔ لوگ آمنے سامنے آکر ایک دوسرے کو للکارتے، لڑتے، زخمی اور قتل ہوتے اور زمینیں بیچ کر پولیس کا پیٹ بھرتے اور مقدمے لڑتے تھے۔ دوست دوست ہوتے تھے اور دشمن دشمن۔ دوستی کا دھوکہ دے کر کسی نے کبھی دشمنی نہیں کی تھی اور دشمنی رکھ کر کبھی کسی نے دوست بننے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ ابھی فلمیں اور فلمی گانے بھی نہیں آئے تھے۔ ہم لوگ تانک جھانک اور فلمی عشق بازیوں سے محفوظ تھے، اس لیے ہماری گپ شپ صاف ستھری ہُوا کرتی تھی۔ نہ زرعی اصلاحات کا رونا تھا نہ مصنوعی کھاد کی مہنگائی کا۔ مصنوعی کھاد کا ابھی ہم نے نام بھی نہیں سُنا تھا، اس لیے ہماری کھیتیاں خوب دانے دیتی تھیں۔ چونکہ زرعی قرضوں کا بھی رواج نہیں تھا، اس لیے کسان خوشحال ہوتے تھے۔

ہم نے کھانا کھا کر کس میں ایک جگہ ذرا سا کھودا تو پانی نکل آیا۔ پانی پیا اور باتیں کرتے کرتے سب لیٹ گئے۔ اور تھوڑی دیر بعد سب سو گئے۔ ذرا سی دیر سوتے ہوں گے کہ کتوں نے بھونک کر جگا دیا۔ اُٹھ کے دیکھا تو کُتے سرپٹ بھاگتے کس پار کر چکے تھے۔ کسی نے کہا کہ دو گیدڑ تھے۔ ہم بھی اُٹھ دوڑے۔ یہ تو ہماری عادت تھی۔ اگر ہم سوتے ہوئے ہوتے تو سوتے میں دوڑ پڑتے۔ کس کا دوسرا کنارا بلند اور عمودی مٹی کی دیوار تھی جس میں چوڑا شگاف تھا۔ کُتے اس میں چلے گئے تھے۔ ہم وہاں پہنچے تو وہاں کنوئیں جیسا نشیب تھا۔ اس کے دونوں طرف گھاٹیاں

تھیں۔ کتے اوپر چلے گئے تھے۔ ہم ایک گھاٹی سے اوپر گئے۔ چڑھائی خاصی مشکل تھی۔

اوپر ایسا علاقہ آگیا جو دور سے دیکھنے سے میدان نظر آتا تھا لیکن اس میں جگہ جگہ کنوؤں جیسے نشیب تھے جن میں سے بعض کے منہ بمشکل دو تین فٹ اور بعض کے ان سے وسیع تھے۔ یہ نیچے جاکر غاروں کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ انہی میں گیدڑ، سہہ، لگوہ اور بھیڑیئے رہتے تھے۔ ان میں سانپ بھی ہوتے تھے۔ اس علاقے سے آگے ریتلی سلوں کی چٹانیں اور مٹی کے ٹیلے تھے۔ ان سے آگے وہ پہاڑیاں شروع ہوتی تھیں جو راولپنڈی اور جہلم کے درمیان آپ کو نظر آتی ہیں۔ کتوں کی آواز بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔ وہ شاید کسی گہرے اور تنگ کھڈ میں اتر کر غار میں چلے گئے ہوں گے۔ گیدڑوں کی یہی جگہ تھی۔ کسی غار کے اندر جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہ غاریں پیچدار راستوں بلکہ بھول بھلیوں کی طرح زمین کے نیچے دور تک چلی جاتی تھیں اور اندر گھپ اندھیرا ہوتا تھا۔ میں ایک بار ایسے ایک غار میں چلا گیا اور دو بھیڑیوں سے مقابلہ ہو گیا تھا۔ آپ نے میری کہانی "جیکی بے چاری کا کیا قصور؟" پڑھی ہوگی۔

ہم نے ایسے تمام سوراخ دیکھے۔ کہیں سے بھی کتوں کی آواز نہیں آرہی تھی۔ ہمارے ایک دوست نے کتوں کو دیکھ لیا۔ وہ دور ریتلی سلوں اور ٹیلوں کے پاس چلے گئے تھے۔ ہم ادھر دوڑ پڑے۔ آگے دراصل ایک اور گہرائی تھی کتے اس میں چلے گئے تھے۔ ہم وہاں سے باہر نکلے تو وہ ہمیں نظر آئے۔ ان کے آگے دو گیدڑ بھاگے جا رہے تھے جو ٹیلوں میں کہیں غائب ہو گئے۔ ہم انتہائی رفتار سے دوڑتے ٹیلوں کے عقب میں گئے۔ وہاں کچھ اور ہی منظر دیکھا۔ کتوں نے ایک گوہ کو گھیر رکھا تھا۔ بہت لمبی اور موٹی گوہ تھی۔

اگر آپ نے گوہ نہیں دیکھی تو بتا دوں۔ گوہ چھپکلی اور سانڈے کی قسم کا جانور ہوتا ہے۔ اس کا جسم دو فٹ سے زیادہ لمبا بھی ہوتا ہے۔ عام لمبائی ڈیڑھ فٹ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

جہاں جسم ختم ہوتا ہے وہاں سے دُم شروع ہوتی ہے جو کم و بیش گز بھر لمبی ہوتی ہے۔ یہ آخر میں جا کر بہت باریک ہو جاتی ہے۔ گوہ کا منہ چھپکلی کی طرح چوڑا نہیں پتلا اور ناک تک، نوکدار ہوتا ہے۔ اس کی ٹانگیں اور پنجے بالکل چھپکلی کی طرح ہوتے ہیں، اس لیے اسے رینگنے والا جانور کہا جاتا ہے۔ اس کی کھال مگرمچھ کی طرح سخت ہوتی ہے۔ اینٹ پتھر کی ضرب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اس کا دفاعی ہتھیار اس کی دُم ہے۔ اس پر کوئی حملہ کرے تو دُم ہنٹر کی طرح گھما کر مارتی ہے۔ اس کی چوٹ گھوڑے جیسا طاقتور جانور بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ مَیں نے آپ کو اپنی پہلی کہانی "لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ" میں سنایا تھا کہ ہمارے ایک عزیز دوست، جابر، کو ایک گوہ نے دو بار دُم مار کر جان سے مار ڈالا تھا۔ جابر مرحوم کی بدنصیبی یہ تھی کہ گوہ کو کتوں نے گھیرا تو جابر کسی کتے سے اُلجھ کر گر پڑا تھا۔ گوہ نے اس کے سینے پر دُم کے وار کیے تھے۔

گوہ کے پنجے اتنے سخت ہوتے ہیں کہ اُن دنوں مشہور تھا کہ ڈاکو عام طور پر رسّے کی کمند پھینک کر کسی عمارت کی چھت پر جاتے اور اندر جا کر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ لوگ بتاتے تھے کہ بعض ڈاکوؤں نے گوہ پال رکھے ہیں۔ اس کی کمر کے گرد رسّہ باندھ کر گوہ کو اُوپر پھینکتے ہیں۔ گوہ چھت پر جا کر پنجے جما لیتی ہے اور اس میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ ایک آدمی رسّے سے اُوپر چلا جاتا ہے۔ گوہ کے پاؤں نہیں اُکھڑتے۔ مَیں نے اپنی آنکھوں سے گوہ کی کمند نہیں دیکھی۔ البتہ اس کے پنجوں کی مضبوطی اور قہر دیکھا ہے اس لیے مَیں کہہ سکتا ہوں کہ یہ کمند کے طور پر استعمال ہوتی ہوگی۔ پنجوں سے یہ کھال ادھیڑ دیتی ہے۔ اس کے دانت بہت تیکھے اور خطرناک ہوتے ہیں۔

ہمارے کتوں نے ایک بڑی گوہ کو گھیر رکھا تھا۔ کتے جانتے تھے کہ اس جانور کے دانت بھی خطرناک ہیں اور دُم بھی اس لیے وہ اس کے آگے بھی نہیں آتے تھے اور اس کے پیچھے جانے

سے بھی ڈرتے تھے۔ گوہ بڑی تیزی سے کتوں کے گھیرے میں ایک ہی جگہ گھوم گھوم کر دُم کو اتنی زور زور سے مارتی تھی کہ دُم گھومنے سے زُوں کی اور زمین پر لگنے سے تڑاخ کی آواز آتی اور گرد اُڑتی تھی۔ ہمارے ساتھ ایک حادثہ ہو چکا تھا اس لیے ہم محتاط ہو گئے۔ ہمیں یہ بھی توقع تھی کہ کوئی کُتا بھی ضائع ہو جائے گا لیکن ہم شکار کو بخشنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہم نے کتوں کو للکارا تو وہ اور دلیر ہو گئے۔

وہی ہُوا جس کا ڈر تھا۔ کُتے زیادہ تھے۔ سب مِل کر حملہ کرتے اور گوہ دُم گھماتی تو وہ پیچھے کو بھاگ آتے۔ اس طرح دو کُتے آپس میں ایسے ٹکرائے کہ ایک گوہ کی زد میں آ گیا۔ کتا آخر شکاری کُتا تھا۔ اس نے بھاگنے کی بجائے گوہ کے منہ پر منہ ڈالا اور اس کے ساتھ ہی اس کی چیخیں نکلنے لگیں۔ اس کا منہ کھل گیا اور منہ سے خون ٹپکنے لگا۔ گوہ نے اس کی زبان اپنے دانتوں میں جکڑ لی تھی۔ دوسرے کتوں کو وہ دُم گھما گھما کر دُور رکھ رہی تھی۔ ایک کُتے کی کمر پر دُم پڑی تو وہ چیختا چلّاتا بھاگ اُٹھا۔ اب خطرہ یہ تھا کہ گوہ پنجوں سے کُتے کی آنکھیں نکال دے گی۔ ہمارے کچھ دوست کہتے تھے کہ گوہ کو کلہاڑیوں اور ڈنڈوں سے مار ڈالیں اور باقی کہتے تھے کہ لڑنے دو۔ کتے کا مالک بولا کہ لڑنے دو۔ کتا مرتا ہے تو مر جائے۔

کتے نے جھٹکا دیا تو گوہ اُلٹی ہو گئی۔ اس کا سفید پیٹ اُوپر ہو گیا۔ کتا اس کے اُوپر آ گیا۔ کتے کے پنجے بھیڑیوں کی طرح چیر پھاڑ نہیں کر سکتے۔ اس نے اگلے دونوں پاؤں گوہ کے پیٹ پر رکھ دیے۔ گوہ نے اس کی زبان نہ چھوڑی۔ کُتے نے یہ داؤ کھیلا کہ اپنی زبان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے منہ بند کر لیا۔ اس نے زبان اندر کر لی تھی۔ اس طرح گوہ کا منہ کتے کے منہ میں چلا گیا۔

اتنے میں ہمارے سب سے طاقتور اور خونخوار کتے بُوبلی نے گوہ کے پہلو میں منہ گاڑ دیا۔ گوہ چونکہ اُلٹی تھی اس لیے اس کی دم کا زنّاٹا پورا کام نہیں کرتا تھا۔ بوبلی نے اسے بھنبھوڑا تو اس کا منہ کھل

گیا۔ کتے کی زبان آزاد ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد گوہ کی انتڑیاں بکھر چکی تھیں۔ ہم نے اسے کتوں سے چھڑا کر اس کا سارا پیٹ صاف کر دیا۔ اور اسے اٹھا لیا۔ اس کی کھال کو ہم ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

یہ معرکہ کوئی نصف گھنٹہ لڑا گیا۔ ہمارا اور کتوں کا شور بے پناہ تھا۔ زخمی کتے کو دیکھا۔ اس کی زبان بری طرح زخمی تھی۔ ہم اوپر چلے گئے اور ایک درخت تلے جا بیٹھے۔ کسی نے پوچھا "آشو کہاں ہے؟" ۔۔۔ ہمارا ایک دوست ارشاد جسے ہم آشو کہتے تھے اپنے کتے سمیت لاپتہ تھا۔ کوئی پریشانی والی بات نہیں تھی لیکن کچھ اور وقت گزرنے تک بھی وہ نہ آیا تو ہم اسے آوازیں دینے لگے۔ کوئی جواب نہ ملا۔ دو دوستوں نے اٹھ کر نشیب میں دیکھا۔ وہاں بھی نہیں تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ ہم میں سے کسی نے شک کے لہجے میں کہا کہ ہم نے جب گوہ دیکھی تھی اُس وقت شاید آشو ایک طرف دوڑتا دکھائی دیا تھا۔ کتے دو گیدڑوں کے پیچھے دوڑے تھے۔ ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ گیدڑ کہاں گئے اور گوہ کہاں سے آ گئی۔ آشو کے کتے نے شاید گیدڑ کا تعاقب نہیں چھوڑا ہو گا اور آشو اپنے کتے کے پیچھے چلا گیا ہو گا۔

ہم پریشان سے ہونے لگے۔ یہ ڈر زیادہ تھا کہ وہ کتے کے پیچھے کسی غار میں نہ اتر گیا ہو اور اندر ہی نہ بھٹک گیا ہو۔ میں ان زمین دوز غاروں کی ہیئت اور ان کی اندرونی ساخت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ آپ دیکھ کر ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ حیران کن نہیں تھا کہ ایسے کسی غار کے اندر گیا ہوا آدمی واپس نہ آ سکے۔ اس ڈر کے پیش نظر ہم سب دو دو تین تین کی ٹولیوں میں تقسیم ہو گئے۔ کتے کھلے چھوڑ دیئے اور مختلف سمتوں کو چلے گئے۔ ہر طرف سے آوازیں آ رہی تھیں ۔۔۔ "آشو، اوئے آشو" ۔۔۔ صرف آشو کی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ میں ایک اور حادثے کی خبر سننے اور گاؤں والوں کو سنانے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گیا۔ میں اور راجہ

شاہباز خان اکٹھے تھے ــــ "آشو نہ ملا تو کیا ہوگا؟" ــــ کبھی میرے منہ سے یہ الفاظ نکل جاتے تو شاہباز خان کے منہ سے۔ منہ سے کوئی اور بات نکلتی ہی نہیں تھی۔ زمین پر کئی ایک فراخ سوراخ تھے۔ یہ پانی نے بنا رکھے تھے۔ ساون کی بارشوں کا سیلابی پانی ان میں جا کر زمین کے اندر راستہ بناتا رہتا تھا۔ اسی سے زمین دوز غار اور گلیاں بنی تھیں۔ ہم ایسے سوراخ کے ساتھ کان لگاتے پھر منہ اندر کر کے "آشو۔ آشو" پکارتے مگر کوئی جواب نہ ملتا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ ہمارے دوست کو زمین نے نگل لیا ہے۔

ہم دونوں ٹیلوں اور سلّوں والی چٹانوں کی طرف جا رہے تھے۔ اُدھر سے ہمارے دو ساتھی دوڑتے آئے اور ہمارے پاس آ رُکے۔ ان کی آنکھیں خوف سے پھٹی جا رہی تھیں۔ وہ دونوں ہانپ بھی رہے تھے۔ ایک کے منہ سے صرف اتنا نکلا ــــ "چیتا" ــــ راجہ شاہباز نے اور میں نے اُسے دیکھا۔ ہم "چیتا" کا مطلب سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس علاقے میں چیتے کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ مَیں نے اُس سے پوچھا کہ اُسے کیا نظر آیا ہے۔

"وہ شیر ہے" ــــ دوسرے نے کانپتی ہوئی زبان سے کہا ــــ "اسے شاید چیتا کہتے ہیں۔ صابو! چل کر دیکھو۔"

"اوئے تم تو آشو کو دیکھنے چلے گئے تھے" ــــ شاہباز نے غصّے سے کہا ــــ "کیا دیکھ آئے ہو۔ مرد کے بچے کی طرح بات کرو۔ آشو کہیں نظر نہیں آیا؟"

اُس نے دونوں ہاتھوں سے عجیب سا اشارہ کر کے سر ہلایا اور سرگوشی میں کہا ــــ "وہ گیا۔ آشو مارا گیا۔"

"کہاں"؟ ــــ شاہباز کے اور میرے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"وہاں" ــــ دوسرے نے اشارہ کر کے کہا ــــ "مرا پڑا ہے، خون ہی خون ہے۔"

"اور ایک چیتا یا معلوم نہیں کیا ہے آشو کے کُتّے کو مار کر کھا رہا ہے"۔ اس کے ساتھی نے کہا۔

دہشت کی اس حالت میں وہ اور کچھ بھی نہ بتا سکے۔ وہ ڈرنے والے لڑکے نہیں تھے۔ ان کی حالت بتاتی تھی کہ انہوں نے جن یا چڑیل کو چیتے کے روپ میں دیکھ لیا ہے۔ مَیں جن یا چڑیل کا قائل نہیں تھا مگر یہ دونوں کچھ دیکھ ضرور آئے تھے۔ مَیں نے اور شاہباز نے اِدھر اُدھر دیکھ کر جو بھی ساتھی نظر آیا اُسے بلایا اور ہم اُس جگہ کو چل پڑے جہاں ہمارے یہ دو ساتھی چیتا دیکھ آئے تھے۔ ہم سنبھل سنبھل کر چلے کتّوں کو ہم نے زنجیریں ڈال لی تھیں۔

وہاں ٹیلے تھے اور ان کے پیچھے ریتلی سلوں کی چٹانیں تھیں۔ ایک لڑکا مجھے ٹیلے کی ڈھلان پر لے گیا۔ مَیں نے چھُپ کر دیکھنا مناسب سمجھا۔ لیٹ کر آگے ہُوا۔ چٹان اور ٹیلے کے درمیان ایک جگہ گولائی میں تھی اور کشادہ تھی۔ وہاں مجھے جو کچھ نظر آیا اس پر مَیں یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ایک چیتا جس کے جسم پر گول گول نشان تھے بڑے مزے سے بیٹھا آشو کے کُتّے کو کھا رہا تھا اور اس سے بیس پچیس قدم دُور آشو خون میں نہایا ہُوا پڑا تھا۔ اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ مَیں اسے مرا ہُوا سمجھا۔ دو تین اور دوست میرے قریب سرک آئے۔ انہوں نے بھی دیکھا۔ سب کے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکلیں۔ اپنے علاقے میں چیتا جن چڑیل ہی ہو سکتا تھا لیکن میرے دل سے وہم نکل گئے۔ مَیں نے آپ کو بتایا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے ایک ریچھ نے ہمارے ایک دوست پر حملہ کر دیا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ ریچھ جنگلی نہیں بلکہ ریچھ بندر کا تماشہ دکھانے والوں کا پالے اور بدمست ہو کر بھاگ آیا تھا۔

فوراً مجھے خیال آیا کہ یہ سرکس والوں کا یا درندے دکھانے والوں کا بھاگا ہُوا چیتا ہے مَیں وہاں سے نیچے آیا۔ بہت تیزی سے بولتے ہوئے مَیں نے اپنے حیران و پریشان ساتھیوں

لو بتایا کہ ہم نے کیا دیکھا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ چیتے پر کتے چھوڑ کر ہم صرف یہ حاصل ار سکتے تھے کہ چیتے کو اگر کتے مار لیں یا وہ بھاگ جائے تو ہم آشو کی لاش اٹھا سکتے تھے۔ ہم اس جاہلانہ عقیدت کو قبول کر چکے تھے کہ ہمارا ایک عزیز دوست ہمارے شکار کے خبط کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم میں سے کسی نے کہا "ہو سکتا ہے وہ زندہ ہو۔ تین چار لڑکے آشو کی طرف جائیں۔ پہلے کتوں کو چھوڑتے ہیں۔ جوں ہی کتے چیتے پر حملہ کریں یہ تین چار لڑکے آشو کو اٹھا کر اوپر لے آئیں۔"

ہم سب اکٹھے ہو چکے تھے۔ کتے زنجیروں میں تھے۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ کتوں پر ہی بھروسہ کیا جائے۔ وہ چیتا ہے، کتوں سے مار نہیں کھائے گا۔ ہم سب کلہاڑیوں اور ڈنڈوں سے چیتے پر حملہ کریں گے۔ سب تیار ہو گئے۔ میں نے سب کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ جن چڑیل یا کوئی اسرار نہیں ہے۔ بھاگا ہوا چیتا ہے۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس سے زیادہ چیتے کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ چیتا دنیا کے تمام جانوروں اور درندوں سے زیادہ تیز اور پھرتیلا ہوتا ہے اور یہ گولی کی طرح حملہ کرتا ہے۔

ہم کتوں کو ٹیلے پر لے گئے۔ ان کی توجہ چیتے کی طرف کی۔ کتے غرائے۔ چیتے نے ہماری طرف دیکھا۔ فاصلہ چالیس پچاس قدم ہوگا۔ وہ بھی غرایا۔ ہم سب نے کتوں کے پٹوں سے زنجیریں نکال دیں۔ کتے پوری رفتار سے ٹیلے سے اترے۔ ہم ڈنڈے، کلہاڑیاں اور چاقو اٹھائے ان کے پیچھے گئے۔ چیتا غصے سے غرا رہا تھا۔ وہ اپنا شکار کھا رہا تھا۔ ایسے وقت درندے کا قہر عروج پر ہوتا ہے۔ سب سے پہلے دو بل ٹیریئر اس تک پہنچے۔ چیتے نے ایک کو پنجہ مارا۔ کتا لڑھکنیاں کھاتا دور جا پڑا۔ جب گیارہ کتوں نے چیتے کو گھیرا تو وہ بھاگ اٹھا۔ یوں پتہ چلا جیسے ہوا میں کہیں غائب ہو گیا ہو۔ آگے ٹیلے نے راستہ

روک رکھا تھا۔ دراصل وہاں سے راستہ مُڑ جاتا تھا۔

شاہباز خان اور تین لڑکے آشو کے پاس رُک گئے۔ کُتّے چیتے کے پیچھے گئے۔ ہم بھی تعاقب میں رہے۔ ٹیلے سے گھومے تو آگے کھُلی جگہ آگئی۔ کچھ دُور ایک عمودی ٹیلا درمیان سے پھٹا ہُوا نظر آیا۔ کتّے اس میں داخل ہو رہے تھے۔ چیتا اِدھر ہی گیا ہوگا تمام کُتّے اندر چلے گئے تو دُور سے ایک آدمی سرپٹ بھاگتا نکلا۔ وہ ہماری طرف آنے کی بجائے دوسری طرف ہولیا۔ اُس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ وہ اُونچی نیچی زمین اور ٹیلوں ٹیکریوں میں غائب ہوگیا۔ ہم ٹیلے کے شگاف میں داخل ہُوئے تو یہ ہر طرف سے ٹیلوں میں گھ ہوئی خاصی فراخ جگہ تھی۔ ٹیلے کہیں سے عمودی اور کہیں سے ڈھلانی تھے۔ انہیں ہماری زبا میں "ڈنڈیاں" کہتے ہیں۔

ہم نے چیتے کو دیکھ لیا۔ اُسے بھاگنے کو راستہ نہیں مِل رہا تھا۔ دو تین لڑکے شگاف پ کھڑے ہوگئے۔ ان کے پاس کلہاڑیاں تھیں اور یہ دلیر لڑکے تھے لیکن کُتّے چیتے کو لڑکو کی طرف جانے نہیں دے رہے تھے۔ چیتا گیارہ کتّوں کو تعاقب سے جھٹکنے کی پوری کوش کر رہا تھا مگر وہ چکر کاٹتا تھا تو کُتّے راستہ چھوڑ کر کے اس کے آگے ہو جاتے تھے۔ اس ایک ڈھلان پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن ڈھلان کا زاویہ ایسا تھا کہ وہ پھسل کر نیچے آگ کُتّے شاید اس سے ڈرتے بھی تھے تمام کتّے پیچھے ہٹ گئے۔ سوائے ایک کے جس نے چ کو کُتّا سمجھ کر اس پر حملہ کیا۔ چیتے نے بجلی کی تیزی سے کُتّے کو دونوں پنجوں میں جکڑ لیا! گردن کے اُوپر منہ ڈال کر ایک ہی بار جھنجھوڑا اور اسے پھینک دیا صرف دو سیکنڈ صَرف ہوئے ہوں گے۔ ہمارا کتّا تڑپنے لگا اور کچھ دیر بعد بے حس ہوگیا۔ اس کی گردن کٹ چکی اور پہلوؤں سے جہاں چیتے نے پنجے ڈالے تھے کھال اُتر گئی تھی۔

ہم الماڑیاں لیے آگے بڑھے۔ چیتا بہرحال طاقتور زندہ تھا۔ وہ کتوں کو بھگا بھگا کر
... تھا۔ پھر کتوں کا یہ انجام ہوتا کہ ایک ایک کو چیتا مار ڈالتا۔ آپ کو شاید یہ تجربہ نہیں
... کبھی کر دیکھیں۔ ایک بلی کو کمرے میں بند کر لیں اور اسے مارنے کو دوڑیں۔ وہ اِدھر اُدھر
... گی۔ جب دیکھے گی کہ اس کے نکل بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تو وہ اُچھل کر دروازے
... یا کسی اونچی جگہ چپک جائے گی۔ اُس وقت اُس کا غرانا سنیں مگر وہ وہاں چپکی نہیں
... گی۔ وہاں سے آپ پر گولی کی طرح آئے گی۔ آپ سنبھلنے نہیں پائیں گے کہ اس کے پنجے
... دانت آپ کے چہرے کے گوشت میں یا گردن میں اُترے ہوئے ہوں گے۔ عام طور پہ
... کو پکڑتی ہے۔ پھر آپ کا خدا ہی حافظ ہے۔ بھیگی بلی تو کھمبا نوچا کرتی ہے لیکن زخمی
... بلی آپ کی بوٹیاں نوچ لے گی۔

وہ تو چیتا تھا جو بلی کی نسل کا ہوتا ہے۔ ایک جگہ وہ اتنی زور سے اُچھلا کہ ٹیلے پہ آٹھ دس
... بلندی پر چپک گیا لیکن مٹی میں وہ پنجے نہیں گاڑ سکتا تھا۔ وہ ایک طرف کو تیر کی طرح گیا اور
... نکل گیا۔ ایک عمودی ٹیلے میں غار سی بنی ہوئی تھی جو شاید ایک طرف کو گھوم
... تھی۔ چیتا اس میں چلا گیا۔ اندر سے پہلے تو ایک چیخ سنائی دی پھر ایک عورت اندر سے
دوڑتی نکلی۔ ہم سب ڈر گئے۔ غار میں عورت کا کیا کام؟ یاد آیا کہ اس سے پہلے اس ویلج
... ایک آدمی دوڑتا ہوا نکلا اور غائب ہو گیا تھا۔ وہ اس عورت کے ساتھ ہوگا۔ عورت
باہر آئی تو کتے اندر جا رہے تھے۔ عورت کتوں کی لپیٹ میں آگئی۔ وہ گری اور کتے اس کے
اوپر سے گزر گئے۔

عورت اُٹھ کر بھاگنے لگی تو ہم نے اسے روک لیا اور پناہ میں لے لیا۔ وہ خانہ بدوش
تھی اور نوجوان لڑکی تھی۔ غار کے اندر کتوں کا شور و غل سنائی دینے لگا۔ چیتے کا غرانا

بہت ہی خوفناک تھا۔ ہم اندر نہیں جا سکتے تھے کیونکہ غار کا دہانہ فراخ نہیں تھا۔ جھک کر اندر جایا جا سکتا تھا جو خطرناک تھا۔ زیادہ دیر نہیں گزری ہوگی کہ ہمیں چیتا نظر آیا لیکن بے بسی اور مجبوری کی حالت میں۔ اس کی شدگ کو ہمارے بُوبلی نے منہ میں لے رکھا تھا۔ چاروں ٹانگوں کے ساتھ ایک ایک کُتا چپکا ہُوا تھا۔ باقی کتے اس پر جھپٹ رہے تھے۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ بُوبلی سے وہ اپنی شہ رگ نہیں چھڑا سکتا تھا۔ باہر آ کر کُتوں نے اسے گرا لیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا پیٹ پھٹ چکا تھا۔ اس نے زندہ رہنے کی آخری کوشش کی جو بڑی خوفناک تھی۔ وہ اتنی زور سے جسم کو جھٹکا دے کر اُٹھا کہ کُتے اِدھر اُدھر گر سے۔ وہ دو تین سیکنڈ کھڑا رہا۔ اس کی انتڑیاں نیچے کو لٹک آئیں۔ وہ گرا اور ایک دو خراٹے لے کر مر گیا۔

اسے مرا ہُوا دیکھ کر بھی یقین نہیں آتا تھا کہ ہم نے چیتا مارا ہے۔ ہم تو گیدڑ مارنے والے شکاری تھے۔ خانہ بدوش لڑکی ہمارے ساتھ تھی۔ اس نے ابھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہم اس کے ساتھ بات کرنے کے مُوڈ میں ہی نہیں تھے۔ چیتے کو ہم گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ ہمارا ایک کتا کم تھا۔ ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ غار کے اندر مرا پڑا ہے۔ یہ چیتے کے سامنے آ گیا ہوگا۔ دو کتے مارے گئے۔ تیسرا کتا آشو کا تھا جو آدھا اس چیتے نے کھا لیا تھا۔ ہم نے آشو کو دیکھا۔ وہ زندہ تھا اور ہوش میں آ گیا تھا۔ اس کی قمیض پھٹی ہُوئی اور خون سے لال تھی۔ ہم نے اس کی قمیض اتار کر سارا جسم دیکھا۔ یہ معجزہ تھا کہ اس کے جسم پر کوئی گہرا زخم نہیں تھا۔ چیتے کے پنجے لگے تھے جو صرف بازو پر ایک جگہ ذرا گہرے اُترے تھے۔ وہ دہشت سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہم نے اس کے زخم کپڑے سے صاف کیے اور اس کی پھٹی ہُوئی قمیض کی پٹیاں پھاڑ کر باندھ دیں۔

جہاں ہم تھے وہاں سے سوہاوہ قریب تھا۔ وہاں ایک سرکاری ڈسپنسری ہُوا

ا ں تھی۔ چھ میل پر سرکاری ہسپتال تھا، لیکن وہاں سے بہت دُور تھا۔ چار لڑکوں نے کہا کہ وہ
اسے اٹھا کر سو باوہ تک لے جائیں گے لیکن وہ اپنے پاؤں پر چلنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے
بتایا اس کا کتا ایک گیدڑ کے پیچھے چلا گیا تھا اور وہ اپنے کُتّے کے پیچھے یہاں تک پہنچ گیا۔
اچانک کہیں سے یہ چیتا اُٹھا اور اس کے کُتّے کے پیچھے دوڑا۔ آشو کے پاس مضبوط ڈنڈا
تھا۔ بھاگنے یا ڈرنے کی بجائے اُس نے چیتے پر ڈنڈے سے حملہ کر دیا۔ چیتے نے گھوم کر
اسے پنجے مارے۔ چیتے کو شاید کتا زیادہ پسند تھا۔ کتا چیتے کے پہلے حملے سے ہی تڑپ رہا
تھا۔ آشو نے بتایا کہ چیتا جب اُس پر آیا تو وہ خوف سے ادھ موا ہو گیا۔ پنجوں نے اس کی
کھال چھیل دی۔ وہ گرا اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا۔ پھر اُسے اُس وقت ہوش آیا
جب اس کے دوست اُسے اٹھا رہے تھے۔

اس ہیبت ناک شکار میں دلچسپی اُس آدمی نے پیدا کی جو کلہاڑی اُٹھائے بھاگ
گیا تھا اور اس لڑکی نے جو غار سے نکلی تھی۔ یہ دونوں خانہ بدوش تھے۔ آج کل ایسے
خانہ بدوش کہیں نظر نہیں آتے۔ یہ صحیح معنوں میں خانہ بدوش ہُوا کرتے تھے۔ اپنی طرز کے خیموں
میں رہتے تھے۔ چند دن ایک جگہ رہتے اور خیمے لپیٹ کر کہیں اور چلے جاتے تھے۔ یہ آبادیوں
سے دُور رہتے تھے۔ ان کی اپنی دنیا تھی اور اپنا تہذیب و تمدن۔ ان کے متعلق لوگوں نے
بڑی خوفناک کہانیاں مشہور کر رکھی تھیں۔ انہیں ہماری زبان میں جھگیوں والے کہا جاتا تھا۔

اس لڑکی نے بتایا کہ ان کا قبیلہ یہاں سے پانچ چھ میل دُور خیمہ زن ہے۔ قبیلے کے رواج
اور قواعد کے مطابق اس کی شادی طے پائی لیکن وہ اِس آدمی کو پسند کرتی تھی جسے ہم نے
بھاگتے دیکھا تھا۔ لڑکی کو ماں باپ نے بہت سمجھایا اور اس آدمی سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن
لڑکی نہ مانی۔ لڑکی نے ہمیں غصے میں بتایا کہ اس کے قبیلے کے لوگ اس آدمی کے متعلق جو کچھ

بتاتے تھے وہ بالکل سچ نکلا۔ لڑکی کو سب کہتے تھے کہ یہ بُزدل اور فریبی آدمی ہے، اور وہ اس کی باتوں کے جادو میں آگئی ہے مگر لڑکی کے دل میں وہ ایسا اُتر گیا تھا کہ اس نے کسی کی نہ سُنی اور اس آدمی کے ساتھ بھاگ چلنے کا ارادہ کر لیا۔

ایک رات لڑکی اس آدمی کے ساتھ بھاگ نکلی۔ وہ رات کے آخری پہر بھاگے تھے۔ اس جگہ جہاں کتّوں نے چیتے کو آ کر گھیرا تھا، یہ دونوں آئے تو دن چڑھ آیا تھا۔ وہ اس جگہ میں داخل ہُوئے۔ انہیں یہ غار نظر آیا تو اس میں جا کر سو گئے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ دن یہیں گزاریں گے اور شام کے بعد آگے جائیں گے تاکہ کوئی پکڑ نہ سکے۔ وہ سو کر اُٹھ بیٹھے تھے جب غار سے باہر اُنہیں کتوں کا شور سنائی دیا۔ دونوں غار کے باہر آئے۔ انہیں ایک چیتا اور اس کے پیچھے کتّوں کا ہجوم دوڑتا نظر آیا۔ چیتا غار سے دُور تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ پہلے یہ آدمی غار کے اندر جا چھُپا۔ اس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ وہ غار سے نکلا اور لڑکی کو ساتھ لیے بغیر بھاگ گیا۔

"میں اب واپس چلی جاؤں گی۔" لڑکی نے کہا۔ "بتانے والے سچ کہتے تھے کہ یہ آدمی بُزدل اور فریبی ہے۔"

ہم نے لڑکی سے کہا کہ اس کے ساتھ ایک لڑکے کو بھیج دیتے ہیں۔ اس نے کہا۔ "کیوں میں اکیلی نہیں جا سکتی؟ مجھے کیا ڈر ہے؟" اور وہ اکیلی چلی گئی۔

ہم نے چیتے کو اُٹھانے کا یہ انتظام کیا کہ ایک درخت کی مضبوط شاخ توڑ لی۔ چیتے کی ٹانگیں باندھیں اور ان میں سے شاخ گزار کر دو لڑکوں نے آگے اور دو نے پیچھے ہو کر اُٹھا لیا۔ آشو کے ساتھ چار لڑکے چل پڑے۔ ابھی ہم راستے پر آئے ہی تھے کہ دو گھوڑے آتے دکھائی دیئے۔ اُن پر دو انگریز فوجی افسر سوار تھے۔ ان کے گھوڑوں کے ساتھ

وہ رائفلیں تھیں۔ اُن سے دُور پیچھے تین آدمی آرہے تھے۔ وہ ہمارے پاس آکر رُک گئے۔ وہ اچھی طرح اُردو بول سکتے تھے۔ ایک نے پیچھے آنے والے آدمیوں سے پوچھا کہ ان کا چیتا یہی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہی ہے۔

ہم نے انگریزوں کو بتایا کہ یہ چیتا ہمیں کس طرح ملا ہے اور ہم نے کتنے کُتّے ضائع کر کے چیتے کو ختم کیا ہے۔ معلوم ہُوا کہ یہ درندے پنجروں میں بند کر کے دو پیسے اور ایک آنے کے ٹکٹ پر دکھایا کرتے تھے۔ وہ سوہاوہ میں رُکے تھے۔ خیمے وغیرہ نصب کرتے کسی طرح چیتے کا پنجرہ کھُل گیا اور چیتا نکل آیا۔ یہ لوگ اس کا پیدل پیچھا نہیں کر سکتے تھے۔ اتفاق سے سوہاوہ کے میدان میں فوج نے عارضی کیمپ نصب کر رکھا تھا جو اُس زمانے میں ایک معمول تھا۔ کسی نے چیتے کے مالکوں کو مشورہ دیا کہ انگریز افسروں سے کہو، وہ چیتا پکڑ دیں گے یا اسے گولی مار دیں گے۔ انہوں نے ایسے ہی کیا۔ یہ دو افسر گھوڑوں پر روانہ ہو گئے۔ انہوں نے بہت سے گورے فوجی مختلف اطراف کو بھیج دیئے تھے تاکہ جہاں چیتا نظر آئے اسے گولی مار دی جائے ورنہ کئی انسانی جانوں کا نقصان کرے گا۔

ان افسروں نے ہم سے چیتا لے لیا اور ہمیں دس روپے دیئے۔ ہم نے مرضی کے خلاف چیتا دے دیا۔ پیسوں کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہم انگریز کو بادشاہ سمجھتے تھے۔ انکار کی جرأت نہ ہوئی۔ انہوں نے ایک مہربانی یہ کی کہ ایک افسر گھوڑے سے اُترا اور آشو کو اس پر سوار کرا لیا۔ ہم سب ان کے ساتھ گئے۔ انہوں نے فوجی ڈاکٹر سے آشو کی مرہم پٹی کرائی اور چائے سے ہماری خاطر تواضع کی۔ اُن دنوں چائے کو ہم عجوبہ سمجھتے تھے۔

قبر کا بھید

وہ پاک لڑکی ہے۔ مجھے اِس بھید پر
مرجانے دو۔ قبر سے یہ بھید کوئی
نہیں نکال سکے گا۔

شکار کی بات شروع کرتا ہوں تو اُس زمانے کے کئی واقعات یاد آجاتے ہیں جن کا شکار کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ آپ نے میرے نام کے ساتھ شکاری کا لیبل لگا کر مجھے پابند کر دیا ہے کہ مَیں صرف شکار کی کہانیاں سنایا کروں۔ میرا شکار بھی کوئی شکار تھا؟ کُتّے ایک خرگوش کے پیچھے دوڑے اور ہم کُتّوں کے پیچھے دوڑ پڑے۔ نہ کچھ حاصل نہ وصول شکار تک پہنچے تو شکار غائب۔ بِل میں گھس گیا یا کتّوں نے چٹ کر لیا۔ ہمارے حصّے میں پسینہ اور تھکن آتی تھی اور اپنی ماؤں کی گالیاں۔ اگر علامہ اقبالؔ یہ مصرع نہ کہہ جاتے "لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ" تو مَیں آپ کو کبھی نہ بتا سکتا کہ ہم شکار کیوں کھیلا کرتے تھے۔ بہانے والا مصرع میرے لیے ایک معقول بہانہ بن گیا ہے، ورنہ ساری عمر شرمساری میں گزر جاتی کہ مَیں خرگوشوں اور گیدڑوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو یتیم کرتا رہا۔ یہ بھی اچھا ہے کہ جانور کی مادہ بیوہ نہیں ہوتی، ورنہ یہ گناہ بھی میرے کھاتے میں لکھا ہوتا کہ مَیں نے بہت سی خرگوشنیوں اور گیدڑیوں کے سہاگ اُجاڑے ہیں۔

آج بھی آپ کے چپکائے ہُوئے لیبل سے مجبور ہو کر شکار کا کوئی دلچسپ واقعہ یاد کر رہا تھا کہ ایک اور واقعہ یاد آگیا جو ہمارے معاشرے کا ایک حادثہ ہے۔ مَیں آپ سے

درخواست کروں گا کہ اسے شکار کی کہانی سمجھ کر نہ پڑھیں۔ زمانہ بدل گیا ہے مگر ہمارے خیالات اور طور طریقے نہیں بدلے، زمانہ بھی ایسا بدلا ہے کہ میرے لڑکپن کے دَور اور آج کے دَور میں فی الواقع زمین اور آسمان جتنا یا سیاہ اور سفید جتنا فرق آگیا ہے، جیسے تہذیب و تمدن ہی بدل گیا ہو۔ آج اپنے دَور کی باتیں سُنانے لگتا ہُوں تو بعض باتیں ناقابلِ یقین اور بعض مضحکہ خیز لگتی ہیں۔ مثلاً محبت اور پیار کو ہی لے لیجئے جسے آج کل رومانس لڑانا کہتے ہیں۔ مَیں اس کی مثال اِس لیے دے رہا ہُوں کہ آج کل رُومانس لڑانا فیشن بن گیا ہے۔ دل یوں لیے دیئے جاتے ہیں جیسے سگریٹ کا پیکٹ کھول کر سگریٹ پیش کیا جاتا ہے۔ بیک وقت دو سگریٹ سلگے، سُوٹے لگے، دھواں اُٹھا اور سگریٹ پھینک دیئے گئے۔ پھر کہیں اور جا کر کسی اور کو سگریٹ پیش کیا یا کسی کا پیش کیا ہُوا سگریٹ لے لیا۔

ہماری جوانی کے دَور میں بھی رومانس ہوتے تھے مگر ایسے عام نہیں جیسے آج آپ دیکھ رہے ہیں۔ پسند اور ناپسند، محبت اور نفرت انسانی فطرت میں شامل ہیں۔ ان پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ البتہ شرم و حیا اور کردار کو خیر باد نہ کہا جائے تو محبت آج کی رومانس جس کے لیے فلمیں مشعلِ راہ بنتی ہیں، کی غلیظ صورت اختیار نہیں کرتی۔ ہمارے دَور میں اکثر و بیشتر نوجوانوں کی پسند اور محبت دل میں ہی رہ جاتی تھی اور ان کی شادی (کہیں اور) کر دی جاتی تھی، پھر یہ نوجوان اپنی دلہنوں سے رومانس لڑایا کرتے تھے اور جب کسی کی کسی سے محبت ہو جاتی تھی، تو انہیں موت ہی جُدا کرتی تھی۔ دل کو ہلا دینے والے ڈرامے جنم لیتے تھے۔

اپنے علاقے کا ایک جوان یاد آتا ہے جو کبڈی کا نامی گرامی کھلاڑی تھا۔ اِس میں چیتے جیسی پھُرتی اور طاقت تھی۔ جسم ایسا جیسے کسی بُت تراش نے بڑی محبت سے تراشا ہو۔

خدا نے اُسے آواز بھی پُرسوز عطا کی تھی۔ رات کو سیف الملوک گاتا تھا تو راہ چلتے مسافر رُک جاتے تھے مگر اسے وہ عزت حاصل نہیں تھی جو اُس دَور میں اس قسم کے نامی گرامی کھلاڑیوں اور پہلوانوں وغیرہ کو حاصل ہوتی تھی کیونکہ وہ ذات کا کمہار تھا۔ راجوں اور چوہدریوں کے سامنے اُسے چارپائی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہُوا یوں کہ ایک سب سے اُونچی ذات کی لڑکی اُس پر مرمٹی۔ ملاقاتیں بڑی دشواری سے ہوتی تھیں۔ لڑکی دوسرے گاؤں کی تھی جہاں یہ آدمی کبڈی کھیلنے چند بار گیا تھا۔

گاؤں میں راز چھُپ نہ سکا۔ ایک بار اسی گاؤں میں کبڈی کا میچ تھا۔ وہ گیا۔ اسے خفیہ ذریعے سے اطلاع ملی کہ لڑکی اسے فلاں غیر آباد مکان میں ملے گی۔ اُس دَور کی کبڈی بہت سخت ہوتی تھی۔ سانس روک کر کھلاڑی باری دیتے جاتا تھا۔ سارا گاؤں تماشہ دیکھنے جمع ہوگیا۔ کبڈی ختم ہوئی تو لوگ کھلاڑیوں کے گرد جمع ہوگئے۔ عورتیں اور بچے بھی باہر آگئے۔ اس جوان نے موقعہ موزوں دیکھا۔ وہاں سے کھسک گیا اور اُس غیر آباد مکان میں چلا گیا جہاں لڑکی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ کسی نے دیکھ لیا اور لڑکی کے بھائیوں کو بتا دیا بھائی کلہاڑیاں لے کے آگئے۔ مکان میں داخل ہُوئے تو یہ آدمی کواڑ کے پیچھے ہوگیا۔ لڑکی سامنے کھڑی تھی بھائی اُس کی طرف گئے۔ یہ آدمی وہاں سے نکل گیا۔

اسے اپنے گاؤں میں جاکر دوسرے دِن پتہ چلا کہ بھائیوں نے بہن کو اسی مکان میں قتل کر دیا ہے۔ سارے گاؤں نے ایکا کر لیا اور قتل ہضم ہوگیا۔ اس سے اگلی رات یہ کمہار کلہاڑی لے کر لڑکی کے گاؤں گیا۔ اس کے گھر کی دیوار پھلانگ کر اندر گیا۔ دونوں بھائیوں کو جگایا۔ وہ اُٹھے تو دونوں کو اُس نے قتل کر دیا۔ خون آلود کلہاڑی اٹھائے تھانے گیا اور بتایا کہ وہ دو آدمیوں کو قتل کر آیا ہے۔ اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اس کی بند مٹھی میں ایک

ریشمی رومال تھا جو لڑکی نے اسے اس آخری ملاقات میں دیا تھا۔ یہ رومال پھانسی پانے تک اس کی مٹھی میں رہا جو اس کی وصیت کے مطابق قبر میں بھی اس کے ساتھ گیا۔

یہ خاص طور پر سامنے رکھیں کہ یہ پاک محبت کی کہانی ہے پاکستانی محبت کی نہیں۔

کبڈی سے مجھے ایک دوست جہانگیر خان یاد آگیا ہے جسے ہم جہاناں کہا کرتے تھے۔ اس کا بھی جسم بہت دل کش تھا۔ اس نے یہ دل کشی بڑی محنت سے حاصل کی تھی۔ ایسے جسم کو کمایا ہُوا جسم کہا کرتے تھے۔ جہاناں ہمارا دوست تو تھا لیکن ہماری شکاری پارٹی میں شامل نہیں تھا۔ وہ ورزش اور کبڈی کا شوقین تھا۔ مَیں شاید پہلے بھی کسی کہانی میں ذکر کر چکا ہوں کہ ہمارے دَور میں مرد فیشنی لباس اور بالوں کی بناوٹ سے نہیں جسم کی بناوٹ کی وجہ سے پسند کیے جاتے تھے۔ اُس دَور کے نوجوان آج کی طرح کاغذ کے گھوڑے اور کاٹھ کے اُلّو نہیں ہُوا کرتے تھے۔ دُبلے پتلے اور کمزور جسم والے کو رشتہ بھی ذرا مشکل سے ہی مِلا کرتا تھا۔ جہاناں مردانگی کا نمونہ تھا۔ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔

ہمارے گاؤں سے کوئی اڑھائی میل دُور ایک گاؤں میں جہانے کی رشتہ داری تھی۔ وہاں وہ جاتا رہتا تھا۔ کبڈی کھیلنے تو اکثر جاتا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ اس گاؤں میں کچھ زیادہ ہی جانے لگا۔ ایک روز مَیں نے اس سے پوچھا کہ اسے وہاں کے رشتہ داروں سے زیادہ پیار ہو گیا ہے یا وہاں کے کبڈی کے کھلاڑیوں سے؟ پہلے تو وہ اس طرح دوسرے تیسرے دن اس گاؤں میں کبھی نہیں گیا تھا۔ وہ ذرا سا مسکرایا پھر سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "اگر راز کو دل میں رکھو تو بتا دُوں کہ مجھے کس سے زیادہ پیار ہو گیا ہے... مجھے مشورہ بھی دو صابو!"

مَیں نے راز کو دل میں رکھنے کی قسم نہیں کھائی۔ اتنا ہی کہا ــــ "تمہیں ایسی بات کہنی نہیں چاہیے تھی۔ کہو کیا بات ہے"؟

اسے اسی پر یقین ہوگیا۔ وہ آخر میرا دوست تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔ "مجھے بد معاش تو نہیں کہو گے؟ مسجد میں لے چلو۔ قرآن سر پر رکھ دو۔ قسم کھا کر کہوں گا کہ اس لڑکی کو میں چاند کی طرح شفاف نیت سے چاہتا ہوں۔ میں نے قسم کھالی ہے کہ شادی اسی کے ساتھ کروں گا۔ اللہ اور رسولؐ کے کلمے پڑھ کر کہوں گا کہ یہ میری ملکیت ہے۔ اس سے پہلے اس کی عزت کو اسی طرح عزیز سمجھتا ہوں جیسے اپنی بہن کی عزت"—— اس نے لڑکی کا نام بتایا جو میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ یہ اسی گاؤں کی تھی جہاں وہ کبڈی کھیلنے جایا کرتا تھا۔ کہنے لگا —— "پہل اس لڑکی کی طرف سے ہوئی ہے۔ دلیر لڑکی ہے۔ کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی ہے"۔

لڑکی کے گاؤں سے کچھ دور لڑکی کے باپ کا سبزیوں کا باغ تھا جس میں رہٹ بھی تھا۔ وہاں درختوں اور جھاڑی نما پودوں کی بہتات تھی۔ باغ کی سبزیاں ہر روز اونٹ پر شہر کی منڈی میں بھیجی جاتی تھیں۔ باغ میں مزارعے کام کرتے تھے۔ ہمارا علاقہ ایسا ہے کہ انسان ذرا پرے ہو جائے تو پتہ نہیں چلتا کہاں غائب ہو گیا ہے۔ کھڈ نالے بے شمار ہیں۔ نشیب و فراز ہیں۔ گھاٹیاں اور ٹیلے ہیں۔ بارشوں اور آندھیوں نے مٹی کے ان خدوخال کو اب بالکل ہی بدل دیا ہے۔ بعض ٹیلے اور گھاٹیاں میدان بن گئی ہیں۔

لڑکی امیر زمیندار گھرانے کی تھی۔ وہ کبھی کبھی اپنی ہمراز سہیلیوں کے ساتھ باغ میں جایا کرتی تھی۔ اُدھر سے جہانا ں بھی چلا جاتا اور ان کی ملاقات ہو جاتی تھی جو چار پانچ منٹ سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ نیت خواہ چاند کی طرح ہی شفاف ہو، چوری کی ملاقات کی سزا موت سے کم نہیں تھی۔ شرم و حجاب بھی غالب رہتا تھا۔ جہاناں اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی قسم کھا چکا تھا اور دیہاتی معاشرہ قسم کھائے ہوئے تھا کہ لڑکیوں کے رشتے اپنی برادری سے باہر نہیں دیں گے۔ ...لے لولے لنگڑوں کو دے دیں گے برادری سے باہر نہیں دیں گے۔ جہانے اور لڑکی کی ذاتیں

الگ الگ تھیں اور دونوں اُونچی ذاتیں تھیں مگر برادریاں الگ ہونے کی وجہ سے ان کی شادی نہیں ہوسکتی تھی۔ لڑکی کی اپنی برادری میں لڑکے موجود تھے۔ دوسری مشکل یہ کہ جہانے کی منگنی کئی سال پہلے ہو چکی تھی۔

آدھی صدی گزر گئی ہے۔ جہانے اور اس لڑکی کی ہڈیاں بھی خاک ہو چکی ہیں لیکن وہ مجھے اُسی طرح آنکھوں کے سامنے کھڑا نظر آتا ہے ـــــ دل کش جسم، دلوں کو موہ لینے والا چہرہ اور آنکھوں میں نوجوانی کا جادو۔ مَیں آج بھی اس کی آواز سُن رہا ہوں ـــــ "مجھے بدمعاش تو نہیں کہو گے؟ اس لڑکی کو میں چاند کی طرح شفاف نیّت سے چاہتا ہوں"۔ مجھے اس کی مسکراہٹ یاد ہے اور اس کی سنجیدگی بھی یاد ہے۔

"صالو!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "ہماری شادی نہیں ہوسکتی۔ تم کوئی حل نکالو۔ گاؤں کے بزرگوں کے کانوں تک یہ بات کس طرح پہنچائی جائے کہ دونوں برادریاں مسلمان ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی کافر نہیں، پھر ہماری شادی کیوں نہیں ہوسکتی؟ بزرگوں کو کس طرح کہا جائے کہ ہماری شادی نہ ہوئی تو ہم دونوں زہر کھا کر مر جائیں گے یا ہم دونوں کہیں بھاگ جائیں گے۔"

"یہ صحیح ہے کہ دونوں برادریوں میں کوئی بھی کافر نہیں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "لیکن برادری سے باہر لڑکی کا رشتہ دینا کفر سمجھا جاتا ہے۔ کوئی بزرگ تمہاری بات نہیں سُنے گا۔ بات کرو گے تو مار کھاؤ گے... مجھے تو یہی ایک صورت سمجھ میں آتی ہے کہ دونوں کہیں بھاگ جاؤ۔"

"یہ تو اُس نے بھی کہا ہے" ـــــ اس نے کہا ـــــ "وہ تیار ہے، لیکن مَیں اسے بدنام نہیں کرنا چاہتا۔ میرے دل میں اس کی محبت ہے اسی لیے مَیں اس کے ماں باپ اور پورے

خاندان کی عزت کرتا ہوں میں ان کی بیٹی کو بھگا لے گیا تو اس کے ماں باپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ لوگ اس لڑکی کا نام لیں گے تو کہا کریں گے کہ بدکار تھی کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی۔"

مجھے اُس کے آنسو یاد ہیں جو اس کی آنکھوں میں تیر آئے تھے۔ اس کی الجھن کا کوئی حل نہیں تھا۔ اس کے راز سے ہم تین دوست واقف ہوئے۔ آج اتنی مدت بعد جب نہ وہ دنیا میں رہا ہے نہ لڑکی، میں یہ راز آپ کو سنا رہا ہوں۔ دوستوں میں صرف ایک رازدار زندہ رہ گیا ہے۔ یہ شہباز خاں ہے۔ کبھی کبھی ہم دونوں بوڑھے گاؤں کے قبرستان میں جاتے ہیں۔ دوستوں کی قبروں کو دیکھتے ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جو جوانی میں ہی ہمارے شکار کے خبط کا شکار ہو گئے تھے، اور وہ بھی ہیں جو دو توں پوتوں کو گودی کھلا کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ ایک روز کوئی چار ماہ گزرے، جہانے کی قبر پہ فاتحہ پڑھ کر شہباز خان نے کہا۔ "جہانے کے مسئلے کا یہی حل تھا۔ اللہ نے اس کی مشکل آسان کر دی۔"

ہم نے حسبِ معمول شکار کا پروگرام بنایا۔ مئی کے مہینے کا آغاز تھا۔ گندم کی فصل کٹ چکی تھی۔ کھلیان ابھی سنبھالے نہیں گئے تھے۔ فصل وہیں کھڑے تھے جو دیر سے بیجے گئے تھے۔ یہ موسم کتوں کے شکار کے لیے اس لیے اچھا نہیں ہوتا تھا کہ دن کو دھوپ تیز ہو جاتی تھی لیکن اس لحاظ سے یہ موسم اچھا تھا کہ خرگوش اور سہ زیادہ ملتے تھے۔ دوستوں نے ایک روز بعد چلنے کا پروگرام بنایا۔ جہانے کو پتہ چلا تو وہ بھی جانے کو تیار ہو گیا۔

ہم کوئی ڈیڑھ درجن دوست ایک درجن کتے لے کر سورج نکلنے سے کچھ دیر پہلے گاؤں سے نکل گئے۔ دور جا کر کتوں کی زنجیریں کھول دیں اور آگے گئے تو کوئی میل ڈیڑھ میل دائیں طرف ہمیں اُس لڑکی کا گاؤں دکھائی دینے لگا جسے جہانا چاہتا تھا۔ اس سے

دُور ہٹ کر لڑکی کے باغ کے درخت بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ہم نشیبی علاقے میں چلے گئے تو گاؤں نظروں سے اوجھل ہوگیا باغ بھی۔ کُتّے اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے ہمارے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ گیدڑوں اور خرگوشوں وغیرہ کی بُو انہیں بے قرار کیے ہُوئے تھی۔ سورج بہت اُوپر آگیا اور گرمی شروع ہوگئی تھی۔ ابھی تک کتّوں کو کوئی شکار نظر نہیں آیا تھا۔ ہم مایوس نہیں تھے۔ گپ شپ لگاتے چلے جا رہے تھے۔

کوئی دو فرلانگ دُور، بالکل سامنے سے، ہمیں ایک گیدڑ اپنی طرف آتا دکھائی دیا جس کی چال چلنے اور دوڑنے کے درمیان تھی۔ کتّوں نے اسے نہ دیکھا۔ وہ اپنی چال بدلے بغیر ہماری طرف آتا رہا۔ ہم سمجھے کتّا ہوگا۔ گیدڑ ایسا جانور ہے کہ کتّے اور انسان کی بُو پاکر انتہائی رفتار پر بھاگ اُٹھتا اور غائب ہو جاتا ہے۔ یہ گیدڑ نہیں ہو سکتا تھا جو کتّوں اور انسانوں کے جلوس کو دیکھ کر بھی ان کی طرف نڈر ہو کے آرہا تھا۔ ہمارے اور اس کے درمیان فاصلہ کم ہوگیا۔ وہ گیدڑ ہی تھا مگر ہمارے لیے یہ معمّہ تھا کہ وہ ڈر کر بھاگ کیوں نہیں گیا؟ ایسے معمّوں کو ہم شرشرار کہا کرتے تھے۔ یہ کوئی جن ہوگا جس نے گیدڑ کا روپ دھار لیا ہوگا۔

کتّوں نے اسے دیکھ لیا اور بھونک کر اس کی طرف دوڑے مگر گیدڑ اُسی چال سے کتّوں کی طرف چلا آرہا تھا۔ اس نے غرّانا شروع کر دیا۔ ایک لڑکے نے چلّا کر کہا ــــ "یہ گیدڑ باؤلا ہے۔ کتّوں کو روکو۔"

ہم سب دوڑ پڑے۔ مَیں نے دیکھ لیا کہ گیدڑ کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی اور وہ کتّوں سے لڑنے کے لیے دانت نکالے ہوئے تھا۔ باؤلا گیدڑ، کتّا یا کوئی بھی باؤلا جانور کسی کو کاٹ لے تو وہ بھی باؤلا ہو جاتا ہے اور اگر کتّا کسی باؤلے جانور کو کاٹ لے اور کچھ خون اُس کے منہ میں چلا جائے تو وہ بھی باؤلا ہو جاتا ہے۔ ہمارے کُتّے تربیت یافتہ شکاری اور بڑے

قیتی تھے۔ وہ سب گیدڑ تک پہنچ گئے۔ گیدڑ نے قہر سے غرا کر پہلے حملہ آور کتے پر حملہ کیا۔ یہ کتا ایک طرف ہو گیا۔ کتوں نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ گیدڑ ان پر حیران کن پھرتی اور غضب سے حملے کرتا تھا۔ ایک گیدڑ نے ایک درجن کتوں کو پریشان کر دیا۔ اتنے میں ہم پہنچ گئے۔ ڈر یہ بھی تھا کہ گیدڑ ہم میں سے کسی کو نہ کاٹ لے۔ ہم نے کتوں کے پٹوں میں زنجیریں ڈالنی شروع کیں اور انہیں اُس زبان میں جو وہ سمجھتے تھے قابو میں لانے کے لیے چلّانے لگے۔

گیدڑ ہم پر حملے کے لیے آیا۔ میرے کئی دوستوں کے پاس ڈنڈے اور کلہاڑیاں تھیں۔ سب نے گیدڑ پر ہلّہ بول دیا۔ زیادہ تر ڈنڈے اس کے سر پہ مارے گئے جن سے وہ جلدی گر پڑا اور مر گیا۔ باؤلے گیدڑ کو اس طرح پڑا رہنے دینا خطرناک تھا۔ اسے گدھوں، بھیڑیوں اور کتوں نے کھانا تھا۔ سب باؤلے ہو جاتے۔ ہم نے کلہاڑیوں سے گڑھا کھودا اور اس میں اسے دبا دیا۔ کتوں کا معائنہ کیا۔ کسی پر گیدڑ کی رال نہیں پڑی تھی اور کسی نے اسے منہ نہیں ڈالا تھا۔ اگر ہم کتوں پر قابو نہ پا لیتے تو یہ ایک درجن کتے چوبیس گھنٹوں کے اندر باؤلے ہو کر گاؤں میں تباہی مچا دیتے۔

اللہ کا شکر ادا کرتے ہم آگے نکل گئے۔ ذرا دُور گئے تو بیک وقت دو سہہ دکھائی دیئے۔ سہہ بلّی جتنا بڑا جانور ہوتا ہے۔ اس کے تمام جسم پر کانٹے ہوتے ہیں۔ کانٹے چھ انچ لمبے بھی ہوتے ہیں ایک فٹ لمبے بھی۔ یہ کانٹے پنسل جتنے موٹے ہوتے ہیں۔ بعض اس سے بھی موٹے۔ سہہ کا منہ چوہے کی طرح چھوٹا سا ہوتا ہے۔ اس کی ٹانگیں بہت چھوٹی اور پاؤں انسان کی شکل کے ہوتے ہیں۔ یہ اپنا دفاع اس طرح کرتا ہے کہ تمام کانٹے کھڑے کر لیتا ہے۔ یہ کانٹوں کی نوکیں سوئی کی طرح تیز ہوتی ہیں۔ ان کا زخم عام زخم کی نسبت خاصی دیر سے ٹھیک ہوتا

ہے۔ ان کانٹوں کے قلم بھی بن سکتے ہیں۔ ان کا رنگ سیاہ اور تھوڑے تھوڑے فاصلے
سفید گول دائرے ہوتے ہیں۔ دیہات کے لوگ سہہ کا کانٹا گھر میں نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں جہ
گھر میں سہہ کا کانٹا ہو اس گھر میں لڑائی جھگڑا ہوتا ہے۔ کسی گھر میں لڑائی جھگڑا رہے تو لوگ
کہتے ہیں ـــــ "معلوم ہوتا ہے اس گھر میں کوئی دشمن سہہ کا کانٹا رکھ گیا ہے" ـــــ معلوم
نہیں کانٹے کی یہ کرامات کہاں تک صحیح ہے۔ مَیں اتنا ہی جانتا ہوں کہ چُبھنے کے معاملے
یہ کانٹا خطرناک ہوتا ہے۔ کتے بھی سہہ سے دُور ہی رہتے ہیں۔

ہمیں خود زخمی ہونے میں لطف آتا تھا اس لیے ہم کتّوں کو زخمی کرانے سے نہیں ڈر
تھے۔ سہہ کتّوں جتنا تیز نہیں بھاگ سکتے۔ ہمارے کتّوں نے انہیں گھیرے میں لے لیا
اس تماشے میں دیکھنے والی چیز یہ ہوتی ہے کہ کُتّے سہہ کے منہ کو منہ میں لینے کی کوشش کر
ہیں اور سہہ پیٹھ پھیر لیتا ہے۔ کتّے سہہ کے اسی داؤ سے اس کے کانٹوں سے زخمی ہو جاتے
اور منہ موڑ لیتے ہیں۔ ہمارے کُتّے تجربہ کار تھے۔ انہوں نے سہوں کو گھیرے میں لے رکھا
اور سہہ درمیان میں ایک ہی جگہ گھوم رہے تھے۔ دو تین کُتّے اکٹھے حملہ کرتے اور انہیں کاٹ
لگتے تو چیختے چلّاتے پیچھے ہٹ جاتے۔ یہ ڈرنے والے کتّے نہیں تھے۔ ڈر کی بجائے ا
پر انتقام کا بھوت غالب آ گیا۔ پانچ چھ کتّوں کے چہروں سے خون چھٹنے لگا تھا۔ ہمار
حوصلہ افزائی اور تھپکیوں سے کُتّے اور دلیر ہوتے جا رہے تھے۔

یہ معرکہ بہت دیر جاری رہا۔ سہہ کو صرف منہ سے پکڑا جا سکتا تھا لیکن اس کا م
چھوڑتا اور اسلحہ نیچے ہوتا ہے کہ زمین کے ساتھ لگ جاتا ہے۔ ایک کُتّے کا پنجہ ایک سہہ کے
منہ پر پڑ گیا جس سے سہہ کی آنکھیں بیکار ہو گئیں۔ یہ اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ ایک اور کُتّے
نے اس کا منہ اپنے منہ میں لے لیا۔ جھنجھوڑا تو سہہ اُلٹا ہو گیا۔ اس کے بعد اس میں مقا

ل ہمت نہ رہی۔ دوسرے سہمے نے تھک کر یا اپنے ساتھی کا انجام دیکھ کر ہتھیار ڈال دیئے۔ "وں نے اسے بھی ختم کر دیا۔ یہ جانور ہمارے کسی کام کے نہیں تھے۔ کُتے ان کا گوشت کھانا چاہتے تھے لیکن ہم نے نہیں کھانے دیا، کیونکہ اس کے گوشت کی تاثیر بہت گرم ہوتی ہے۔ تے کھالیں تو اس کے بعد پانی ہی پیتے رہتے ہیں پھر دوڑنے کے قابل نہیں رہتے۔ اس کے علاوہ شکار کے دوران ہر جگہ پانی ملتا بھی نہیں۔

ہمارے لیے یہ تماشہ اچھا تھا مگر باؤلے گیدڑ نے جو بدمزگی پیدا کی تھی اس کا اثر دل پر موجود تھا۔ اسے ہم اچھا شگون نہیں سمجھتے تھے، دل پر بوجھ سا تھا۔ یہ بوجھ میرا عزیز دوست شہباز خان بھی محسوس کر رہا تھا جس کا اظہار اس نے یہ کہہ کر کیا — "واپس نہ چلیں صابو؟ ایسے لگتا ہے جیسے آگے گئے تو کوئی حادثہ ہو جائے گا۔ باؤلے گیدڑ سے جو سامنا ہوا ہے اس سے طبیعت ٹھکانے نہیں رہی" — لیکن باقی دوست آگے جانے پر خوش تھے اور وہ چلے جا رہے تھے۔ دھوپ بہت تیز ہو گئی تھی۔ لڑکے درختوں کے جھنڈ تلے بیٹھ گئے۔ تھکن ہو گئی تھی۔

"جہاناں کہاں ہے؟"۔ ایک لڑکے نے پوچھا۔

مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جہاناں وہاں نہیں تھا۔ مَیں نے شہباز کو اور اُس نے میری طرف دیکھا۔ ہمیں معلوم تھا وہ کہاں چلا گیا ہے۔ ہمارے ایک دوست کو بھی معلوم تھا اُس نے بے پروائی سے کہا "جانے دو یار، جہاں چلا گیا ہے۔ اسے شکار میں کوئی دلچسپی نہیں۔ یسے ہی ساتھ چلا آیا تھا۔ یہ قریب ہی اس کے رشتہ داروں کا گاؤں ہے، وہاں چلا گیا ہو گا"۔

مَیں نے بھی اپنے اس دوست کی تائید کی اور کہا — "چلو واپس چلتے ہیں"۔

"آگے چلیں گے"۔ ایک نے کہا اور سب آگے جانے کو اُٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ سب آگے آگے جا رہے تھے۔ مَیں، شہباز اور ہمارا تیسرا دوست افضل، جو ہم اور جہانے کا ہمراز تھا، پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ ہم اس لڑکی کے گاؤں سے تو دُور سے گزرے تھے، اُس کا سبزیوں کا باغ قریب تھا۔ جہانے نے ہمیں بتایا تھا کہ کبھی کبھی لڑکی ا میں آتی ہے اور وہاں سے نظر بچا کر نشیب میں آجاتی ہے جہاں جہاناں اُس کا منتظر ہو ہے۔ ہم سمجھ گئے کہ جہاناں اُدھر ہی چلا گیا ہے اور وہاں سے واپس چلا جائے گا۔ ایسا کو خطرہ نہیں تھا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہوگا۔

یہ خطرہ واقعی تھا مگر ہم کیا کر سکتے تھے۔ مَیں نے جہانے کو اس خطرے سے آگاہ کیا تھا کہا تھا کہ اس لڑکی کو دل سے اتارنے کی کوشش کرو، شادی ناممکن ہے مگر جہاناں اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اس ویرانے میں لڑکی اور لڑکے کی ملاقات خواہ بہن بھائی جیسی ہی ہوتی ا بڑا جُرم تھا جس کی سزا قتل سے کم نہیں تھی۔ ہم تینوں دوست اسی موضوع پر باتیں کرتے گئے۔ آگے ایک اترائی آگئی جو خشک برساتی نالے میں جا ختم ہوتی تھی۔ نالہ وسیع تھا ہم سب نیچے اُتر گئے۔ دونوں طرف مٹی کی عمودی دیواریں کھڑی تھیں جو خاصی اُونچی تھیں۔ ہم نالے سے پار کی دیوار کے ایک شگاف میں داخل ہو کر اُوپر جانا تھا۔ ایک جگہ درختوں کا جھ دیکھا۔ وہاں جا بیٹھے اور سب جو کچھ کھانے کے لیے ساتھ لائے تھے، درمیان میں ڈھیر دیا اور کھانے بیٹھ گئے۔

کھانے سے فارغ ہو کر اُٹھے۔ ہم جدھر سے آئے تھے اُدھر کی اُونچی دیوار میں کھ گف کے وہانے جیسا شگاف نظر آیا جو ہم سے کوئی پچاس قدم دُور تھا۔ ایک طرف سے دا کے ساتھ ساتھ، نالے کے اندر، ایک گیدڑ بہت تیز دوڑتا نظر آیا۔ کتوں نے اسے دیکھ ا

تمام کتے دوڑ پڑے۔ ہم بھی دوڑے۔ ہم جانتے تھے کہ گیدڑ سنگاف کی طرف جا رہا ہے اور اس میں چلا جائے گا۔ ہم سنگاف کی طرف دوڑے جا رہے تھے لیکن گیدڑ تیز تھا، کتوں کو چند قدموں کے فاصلے پر چھوڑ کر کھوہ میں چلا گیا۔ ہمارے کسی دوست نے کہا کہ اس نے کوئی ایک گز لمبا سانپ کھوہ کے اندر جاتے دیکھا ہے۔ یہ سانپ باہر تھا۔ ہمارے اور کتوں کے شور سے کھوہ کے اندر چلا گیا۔ دو اور دوستوں نے بھی بتایا کہ سانپ اندر گیا ہے۔

ہمارے لیے سانپ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ باہر ہوتا تو ہم اسے شغل کے طور پر مار ڈالتے۔ کھوہ میں چلا گیا تو اس کے ساتھ ہماری دلچسپی ختم ہو گئی۔ مگر سانپ ہمارے لیے اس لیے مسئلہ بن گیا کہ ہمارے دو کتے کھوہ کے اندر چلے گئے تھے جو کتے ان کے پیچھے جا رہے تھے انہیں ہم نے پکڑ لیا۔ ہمارا شکار تو وہی دلچسپ ہونا تھا جو ایسی کھوہوں اور لمبے لمبے پُر پیچ غاروں میں گھس جاتا تھا، مگر اس کھوہ میں سانپ بہت بڑا خطرہ تھا۔ ہم کسی کتے کو سانپ سے نہیں مروانا چاہتے تھے اندر جو دو کتے چلے گئے تھے ان میں ایک میرا تھا اور دوسرا افضل کا بُوہلی کتا جس کی خونخواری اور طاقت کی کئی کہانیاں سُنا چکا ہُوں۔ وہ قابلِ قدر کتا تھا، اور میرا کتا اس لیے سب سے زیادہ قیمتی تھا کہ وہ میرا تھا۔

ہم نے باہر سے کتوں کو بلایا۔ وہ نہ آئے۔ ان کے غرّانے کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ کھوہ دراصل پانی کا وہ زمین دوز راستہ تھا جس کے متعلق مَیں آپ کو کئی بار بتا چکا ہُوں۔ اُوپر کہیں سے بارش کا پانی جنگلی چوہوں کے بِل میں داخل ہوتا ہے۔ چُوہوں نے زمین نرم کر رکھی ہوتی ہے۔ پانی راستے بناتا کہیں دُور سے مٹی کو دیوار پھاڑ کر باہر آ جاتا ہے۔ پانی کے اس صدیوں کے عمل سے اس کی زمین دوز گزرگاہ ایک لمبی اور بھول بھلیوں جیسی سرنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایسی

بعض سرنگیں اندر سے کشادہ اور ان کی چھتیں بلند ہوتی ہیں۔ بعض جگہوں پر اس کی دو دو تین تین شاخیں بن جاتی ہیں۔ ان میں داخل ہونے کے لیے ہم ایک ٹارچ ہمیشہ ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ میرے پاس تین سیل والی ایک فٹ لمبی ٹارچ تھی۔

مَیں اور افضل دہانے کے اندر چلے گئے۔ شہباز بھی ہمارے پیچھے گیا۔ چند گز ہمیں جھک کر چلنا پڑا۔ آگے سرنگ ذرا بلند ہوگئی۔ کتوں کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔ مَیں ٹارچ جلائے اور ڈنڈا تانے آگے آگے تھا کہ سانپ نظر آئے تو اسے مارا جائے۔ سانپ کا ہی ڈر تھا۔ سرنگ کی چھت سے مٹی کے لمبے لمبے تودے عجیب عجیب شکلوں کے لٹک رہے تھے۔ راستہ ہر چند قدم بعد مڑتا تھا لیکن کہیں بھی راستے دو نہ ہوئے۔ ہم اِدھر اُدھر دیکھتے چلتے گئے۔ موڑ مڑتے گئے۔ سانپ تو شاید بِل میں کہیں جا چھپا ہوگا لیکن مجھے ٹارچ کی روشنی میں سانپ ہی سانپ نظر آرہے تھے۔ اپنے دونوں کتوں کی جو ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں وہ بھی خاموش ہوگئیں۔ یہی ڈر تھا کہ کتوں کو سانپ نے ڈس لیا ہے اور ہو سکتا ہے اندر ایک سے زیادہ سانپ ہوں۔

بہت دیر چلنے کے بعد مجھے ایسے نظر آنے لگا جیسے دُور آگے باہر سے روشنی سی آرہی ہو۔ ہم چلتے گئے تو روشنی صاف ہوگئی۔ وہ اس سُرنگ کا دوسرا دہانہ تھا۔ وہاں سے جھک کر باہر نکلے۔ یہ ایک کھڈ تھا جس کے کنارے ڈھلانی تھے۔ ایک طرف کی ڈھلان کا زاویہ ایسا تھا کہ آسانی سے اُوپر نیچے آجا سکتے تھے۔ زمین سے پتہ چلتا تھا کہ بارشوں کا پانی اُوپر سے اس کھڈ میں آتا ہے اور جس سُرنگ سے ہم آئے ہیں اس سے گزر کر برساتی نالے میں چلا جاتا ہے۔ یہ سرنگ پانی نے ہی بنائی تھی۔ ہم کھڈ سے اُوپر گئے تو دونوں کُتے نظر آگئے۔ گیدڑ نکل گیا تھا کُتے بے تابی سے اِدھر اُدھر

دیکھ رہے تھے۔ ہم نے انہیں بلا لیا۔ تب ہم نے دیکھا کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ جہانان جس لڑکی کو چاہتا تھا، اُس کا باغ ہم سے بمشکل سو قدم دُور تھا۔ ہم اس سے تھوڑی ہی دُور سے گزر کر نیچے گئے تھے۔ سرنگ ہمیں پھر وہیں لے آئی، بلکہ اس کے اور قریب لے آئی۔

"سنو یارو!" ــــ شہباز نے کہا ــــ "ذرا کھڈ میں چلو، مجھے ایسے لگا تھا جیسے مَیں نے وہاں خون دیکھا تھا۔"

ہم کھڈ میں اُترے۔ وہاں واقعی خون تھا۔ ہم جب سرنگ میں سے نکل کر اس میں آئے تھے تو کتوں کے خیال سے کھڈ میں کچھ دیکھے بغیر اُوپر چلے گئے تھے۔ دوبارہ نیچے اُترے تو وہاں خون دیکھا۔ زیادہ نہیں تھا۔ خون کا چھڑکاؤ سا تھا اور یہ خُون تازہ تھا۔ دیہات میں کھُرے (پاؤں کے نشان) مشہور تھے۔ ہم نے بھی کھُرے دیکھے۔ دو کھُرے نظر آئے جو ہم تینوں کے کھُروں سے مختلف تھے۔ یہ اُوپر تک چلے گئے تھے۔ اس سے زیادہ ہم سراغرسانی کے اہل نہیں تھے۔ یہ یقین ہو گیا کہ یہاں دو یا تین انسان آئے تھے۔ البتہ ایک اور چیز نے ہمیں شک میں ڈال دیا۔ یہ کانچ کی ایک چوڑی کے تین ٹکڑے تھے۔ ان سے یہ شک ہوتا تھا کہ یہاں ایک عورت بھی تھی۔ عورت کے شک کے ساتھ ہی میرے دل پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ مجھے جہانے کا خیال آگیا۔

"یہ خون جہانے کا ہی نہ ہو؟" ــــ مَیں نے اپنے دوستوں سے کہا ــــ "مجھے تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ جہاناں لڑکی کے بھائیوں کے ہاتھ چڑھ گیا ہے۔ باغ قریب ہی ہے۔ لڑکی اسے اسی کھڈ میں ملتی ہو گی۔"

"اگر وہ یہاں قتل ہُوا ہوتا تو خون زیادہ ہوتا" ــــ شہباز نے کہا ــــ "یہ کسی جانور

کا خون ہے لیکن یہ پتہ نہیں چل رہا کہ خون اس طرح الگ الگ جگہوں پر کیوں بکھرا ہوا ہے

"لڑائی ہوئی ہوگی" ـــــ افضل نے کہا ـــــ "جہاناں لڑائی میں مار کھانے والا نہیں۔ یہ لڑکی کے کسی بھائی کا یا لڑکی کا خون ہے"۔

جو کچھ بھی ہوا، یہ خون کسی انسان کا تھا۔ کھُرے اور چوڑی کے ٹکڑے بتاتے تھے کہ یہاں ایک دو یا تین آدمی آئے تھے اور ان میں ایک عورت بھی تھی۔ ہمارا قیاس یہی تھا کہ جہاناں مارا گیا ہے یا اس نے کسی کو مار دیا ہے یا لڑائی ہوئی اور کوئی زخمی ہو گیا ہے۔ ہمارے دوست نالے میں تھے۔ میں نے سوچا کہ وہ ہمارے لیے پریشان ہوں گے۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ ہم سرنگ سے نکل آئے ہیں۔ ہم کھڈ سے اُوپر گئے۔ اُوپر میدان تھا۔ ہم اُوپر اُوپر نالے کی طرف گئے۔ اب سرنگ ہمارے نیچے تھی۔ آگے میدان ختم ہو گیا ہم اس دیوار کی منڈیر پر کھڑے تھے جس میں سرنگ کا دہانہ تھا۔ وہاں سے نیچے دیکھا۔ ہماری شکاری پارٹی نیچے کھڑی تھی۔ دو لڑکے کھوہ میں منہ دیئے ہم تینوں کے نام لے لے کر پکار رہے تھے۔ ہم نے اُوپر سے انہیں آواز دی۔ ہمیں زندہ و سلامت دیکھ کر انہوں نے خوشی سے نعرے لگائے۔

تھوڑا پیچھے سے اُوپر آنے کا راستہ تھا۔ وہ سب اُوپر آ گئے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے ہم تینوں نے یہ پروگرام بنایا کہ پانی پینے کے بہانے باغ میں چلتے ہیں۔ اگر جہانے کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تو باغ کے مالی سے معلوم ہو جائے گا۔ ہماری ساری پارٹی آ گئی تو ہم باغ میں چلے گئے۔ دو لڑکوں نے رہٹ گھمایا اور سب نے پانی پیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ باغ میں خاموشی تھی۔ مالی رہٹ کی آواز پر آ گیا۔ اس سے ہم یہ تو پوچھ ہی نہیں سکتے تھے کہ اس کے مالکوں کی بیٹی یہاں آئی تھی یا نہیں۔ جہانے کے متعلق بھی اس سے نہیں پوچھا

جا سکتا تھا لیکن پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ مالی (مزارعہ) نے ہمیں ایک خبر سُنائی۔

"اوئے لڑکو!" ــــ اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھ کر اس لڑکی کا نام لیا اور کہا ــــ "اُسے سانپ نے ڈس لیا ہے، لیکن کیا لڑکی ہے، کیا اس کا حوصلہ اور کیا دماغ ہے۔ سانپ نے اُسے ٹخنے کے قریب کاٹا۔ لڑکی نے اپنا دوپٹہ پھاڑا اور اس ٹکڑے کو مروڑ کر ٹخنے کے اُوپر کس کر باندھ دیا تاکہ زہر اُوپر نہ چڑھے۔ پھر اُس نے اپنی ایک چوڑی توڑی۔ ایک ٹکڑے کا ایک سرا تیز تھا۔ اس سے لڑکی نے اس جگہ جہاں سانپ نے کاٹا تھا لمبا کٹ ڈالا اور وہاں منہ رکھ کر زہر چُوس کر تھوک دیا۔ اس طرح اس نے تین چار بار خون چُوسا اور تھوکا۔ پھر زخم پر دوپٹے کی پٹی باندھ دی۔"

"یہیں باغ میں؟" ــــ مَیں نے پُوچھا۔

"نہیں" ــــ مزارعہ نے جواب دیا ــــ "وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ آئی تھی وہ سب کبھی کبھی یہاں آتی ہیں۔ آج وہ سہیلیوں کو یہاں چھوڑ کر گھومنے پھرنے باغ سے ذرا دُور نکل گئی۔ واپس آئی تو اس نے بتایا کہ اسے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ اس نے یہ بات سُنائی جو مَیں نے تمہیں سنائی ہے۔ مَیں نے اسے گدھی پر بٹھایا اور اپنی بیوی کو اس کے ساتھ گھر بھیج دیا ہے۔"

"وہ ہوش میں تھی؟"

"بالکل ہوش میں جی!"

"اس نے وہ جگہ نہیں بتائی جہاں سانپ نے اسے کاٹا تھا؟"

"نہیں!" ــــ مزارعہ نے جواب دیا ــــ "مَیں نے پوچھا تھا۔ اُس نے

اشارہ کر کے کہا تھا ـــــ "اُدھر" جگہ نہیں بتائی۔"

"سانپ کیسا تھا؟" ـــــ اُس لڑکے نے پوچھا جس نے گیدڑ کے ساتھ ایک سانپ کو سرنگ کے نالے والے دہانے میں جاتے دیکھا تھا ـــــ "لڑکی نے کچھ بتایا تھا؟"

"مَیں نے پوچھا تھا" ـــــ مالی نے جواب دیا ـــــ "پوچھا اس لیے تھا کہ سانپ چھوٹا، کالے رنگ اور سفید کوڈیوں (بیضوی دھبّوں) والا ہُوا تو لڑکی کا بچنا مشکل ہوگا لیکن اس نے بتایا کہ سانپ گز بھر لمبا اور گہرے مٹیالے رنگ کا تھا۔"

"یہ وہی سانپ ہوگا جو ہم نے سرنگ میں جاتے دیکھا تھا" ـــــ لڑکے نے کہا۔

"سُرنگ کا دہانہ اِدھر بھی ہے" ـــــ افضل نے کہا ـــــ "ہو سکتا ہے وہ اِدھر سے ہی اُدھر گیا ہو۔"

ہم نے کھڈ میں جو خون اور چُوڑی کے جو ٹکڑے دیکھے تھے ان کا معمّہ حل ہو گیا۔ مگر جہاناں کہاں ہے؟ کیا لڑکی سے ملاقات سے پہلے ہی سانپ نے اسے ڈس لیا تھا؟ ایسے سوالوں کا جواب اپنے گاؤں جا کر جہانے سے ہی مل سکتا تھا۔ بشرطیکہ وہ گاؤں میں ہُوا۔ ہم یہ سُن کر حیران نہیں ہُوئے کہ ایک لڑکی کو سانپ نے ڈس لیا تو اس نے گھبرانے یا چیخنے چلّانے اور بھاگ اُٹھنے کی بجائے دل اور دماغ کو حاضر رکھا اور زہر چوس کر تھوک دیا۔ مسلمان لڑکیاں ایسی ہی دلیر اور ذہین ہُوا کرتی تھیں، ورنہ سانپ قریب سے گزر جائے تو دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ مزارعہ نے ٹھیک کہا تھا کہ سانپ چھوٹا اور سفید کوڈیوں والا سیاہ ہوتا یا پھَن والا بڑا سانپ ہوتا تو لڑکی زندہ نہ رہ سکتی۔ مٹیالے رنگ کا سانپ بھی زہریلا ہوتا ہے لیکن اس کا زہر اتنی تیزی سے اثر نہیں کرتا اگر فوری طور پر علاج نہ کیا جائے تو موت یقینی ہوتی ہے۔ سردیوں میں سانپ زیرِ زمین چلے جاتے ہیں۔

گرمیوں میں باہر آجاتے ہیں اور ان کا زہر مہلک ہو جاتا ہے۔ مئی کی گرمی شروع ہو چکی تھی اس لیے سانپ اور بچھو بھی نکل آئے تھے۔

یہ یقین ہو گیا کہ کوئی اور گڑبڑ نہیں ہوئی اور جہاناں قتل نہیں ہوا۔ ہم اپنے گاؤں آگئے۔ جہانے کے گھر سے اس کے متعلق پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ گھر نہیں آیا۔ گھر والے الٹا ہم سے پوچھ رہے تھے کہ وہ ہمارے ساتھ گیا تھا۔ کہاں چلا گیا ہے؟ ہم بھی پریشان ہو گئے۔ وہ شام کو آگیا۔ بالکل خیریت سے تھا۔ میں نے اسے یہ بتائے بغیر کہ لڑکی کو سانپ نے ڈس لیا ہے، اس سے پوچھا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ جب ہمارے کتے سہوں کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے وہ چپکے سے کھسک گیا تھا۔ لڑکی کا باغ قریب ہی تھا۔ اسے لڑکی وہاں نظر نہ آئی۔ جہاناں اس کے گاؤں چلا گیا۔ لڑکی وہاں بھی نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد لڑکی اپنے مزارعہ کی گدھی پر سوار گاؤں میں آئی اسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔

جہانے نے ہمیں وہی کہانی سنائی جو مزارعہ ہمیں سنا چکا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اسی وقت گھوڑے پر ایک آدمی دوڑایا گیا جو ایک سنیاسی کو گھوڑے پر بٹھا کر لے آیا۔ اس زمانے میں سنیاسیوں کے پاس مجرب اور اکسیر جڑی بوٹیاں ہوا کرتی تھیں۔ سانپ کاٹے کا علاج تو وہ فوراً کر لیا کرتے تھے بشرطیکہ وہ فوراً پہنچ جائیں۔ سنیاسی نے لڑکی کا زخم دیکھا۔ اس کی حالت دیکھی اور دوائیاں دے دیں۔ جہانے نے بتایا کہ شام تک لڑکی ٹھیک ہو چکی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم نے ایک کھڈ میں خون اور ٹوٹی ہوئی چوڑی دیکھی تھی جو اسی لڑکی کی ہو گی اور یہ خون بھی اسی کا ہو گا۔ جہانے نے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا "ہو سکتا ہے لڑکی میرے انتظار میں کھڈ میں گئی ہو لیکن میں اسے باغ میں دیکھنے چلا گیا۔ وہ نہیں تھی اس لیے اس کے گاؤں چلا گیا۔"

ہمارے لیے یہی خوشی کافی تھی کہ ماں باپ کا یہ خوبرو اور تنومند بیٹا زندہ ہے۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ جہاناں گھر میں بیمار پڑا ہے۔ مَیں اور شہباز اسے دیکھنے گئے۔ اسے بخار نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ سر چکراتا اور دل ڈوبتا ہے اور جسم کے اندر سوئیاں سی چُبھتی ہیں۔ ایک سیانے نے دوائی دی۔ گھر والوں نے اپنے نسخے آزمائے مگر اثر اُلٹا ہُوا۔ رات کو اس کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ عورتوں نے کہا کہ لڑکے کو نظر لگ گئی ہے یعنی یہ نظرِ بد کا اثر ہے۔ کسی نے کہا کہ اس نے کسی درخت کے نیچے پیشاب کیا ہو گا جہاں جن رہتے ہیں اور جنہیں شک تھا کہ دوسرے گاؤں کی لڑکی جہانے پر مرتی ہے، انہوں نے کہا کہ جہانے کو تعویذ دیئے گئے ہیں یعنی اس پر کالا جادو کیا گیا ہے۔ شک ہمیں بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ ہم بیمار اُسے سمجھا کرتے تھے جسے بخار ہو۔ جہانے کو بخار نہیں تھا۔ وہ ایک رات کے اندر اندر جیسے گھُل گیا تھا۔ رنگ پیلا پڑ گیا اور چہرے کی ہڈیاں نظر آنے لگی تھیں۔

اس کے ماں باپ عاملوں اور پیروں کی طرف اُٹھ دوڑے۔ کسی نے کالا جادو کہا اور کسی نے شرشرار بتایا۔ تعویذ دیئے۔ پیسے کھرے کیے اور صحت یابی کی اُمید دلائی۔ ہمارے گاؤں کے امام مسجد نے کتاب نکالی اور بتایا کہ ایک زندہ رُوح لڑکے میں اُتر آئی ہے۔ اس کے کہنے پر کالے بکرے کا صدقہ دیا گیا، مگر تمام تعویذ، ٹونے، صدقے اور ماں کی آہ وزاری بیکار گئی۔ تین دن گزر گئے اور جہاناں سوکھ کر ہڈیوں کا پنجر بن گیا۔ میرے والد صاحب مرحوم کے زور دینے پر اس کے ماں باپ اسے ہسپتال لے جانے پر راضی ہُوئے، ورنہ عامل، پیر اور مولوی سخت خلاف تھے۔ کہتے تھے کہ انگریزی علاج شرک ہے۔ اس سے تعویذوں کی بے ادبی ہو گی لیکن مَیں پیروں فقیروں کے معاملے میں لڑکپن سے ہی مُشرک ہُوں۔ مَیں نے اپنے دو چار دوستوں کو تیار کیا۔ ایک صبح گھوڑا نکالا اور جہانے کو اس پر

اٹھا کر گوجر خان کو چل پڑے۔ جہاں سرکاری ہسپتال تھا۔

اس سے نزدیک اور نہ کوئی ہسپتال یا ڈاکٹر نہیں تھا۔ ہم لوگ گوجر خان کے ہسپتال میں کسی مریض کو اُس وقت لے جایا کرتے تھے جب دیہات کے سیانے اور پیر وغیرہ اسے اپنی کرامات سے نزع تک پہنچا چکے ہوتے تھے۔ اکثر یوں ہوتا تھا کہ مریض کو چارپائی پر ڈال کر لے گئے اور میّت اُٹھائے واپس آگئے۔ جہانے کا بھی یہی انجام نظر آ رہا تھا۔ آدھے راستے میں اسے غشی آگئی۔ ہم دیکھ نہ لیتے تو وہ گھوڑے سے گر پڑتا۔ اسے اتار لیا۔ اتفاق سے قریب ہی ایک گاؤں تھا۔ وہاں سے چارپائی لائے۔ اس گاؤں کے کئی آدمی ساتھ چل پڑے۔ کہنے لگے کہ وہ چارپائی پر مریض کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر گوجر خان پہنچائیں گے۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا کوئی مصیبت آ پڑے تو دشمن بھی مدد کو آ پہنچتے تھے۔ ہم نے ان آدمیوں کا شکریہ ادا کیا۔ ہمارے ساتھ جہانے کا باپ، ایک بھائی اور ہم چار دوست تھے۔ چارپائی اُٹھائی اور میلوں کا سفر اُونچی نیچی راہوں، گھاٹیوں اور ندی نالوں میں سے طے کرتے گوجر خان ہسپتال پہنچ گئے۔ اُس وقت وہاں ایک ہندو سول سرجن تھا۔

اس ہندو نے اس کا معائنہ کیا اور پوچھا ــــ "اسے کیا کھلایا ہے؟" ــــ اس کے باپ نے جواب دیا کہ کوئی ایسی ویسی چیز نہیں کھلائی، دوائیاں اور تعویذ دیتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا جیسے اسے پہلا شک یہ ہوا ہو کہ جہانے کو کوئی زہریلی چیز کھلائی گئی ہے اس سے ہمیں یہ شک ہوا کہ لڑکی والوں نے اسے دھوکے میں کچھ پلا ہی نہ دیا ہو۔ جہاناں کہتا تھا کہ اس نے ان دنوں کسی غیر کے ہاتھ سے کچھ نہیں کھایا۔

ڈاکٹر نے اسے ہسپتال میں داخل کر لیا۔ اُس دور میں آج کی طرح کی پنسلین اور ...سین قسم کی دوائیاں ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ مکسچر دیئے جاتے تھے۔ انجکشن کسی جاں بلب

مریض کو دیا جاتا تھا مگر دوائیاں آج کی طرح جلدی اثر کرنے والی نہیں تھیں۔ ڈاکٹر نے خلوص سے توجہ دی، انجکشن بھی دیا، دوائیاں بھی دیں۔ شام کو میں اور شہباز نے جہانے کے باپ اور بھائی سے کہا کہ وہ گاؤں چلے جائیں اور کل اس کی ماں کو اس کے ساتھ رہنے کے لیے لے آئیں اور گھر والوں کو تسلی دیں۔ وہ چلے گئے۔ ہمارے دو دوست بھی چلے گئے جہانے کے پاس میں اور شہباز رہ گئے۔ ہم دونوں نے اس سے ضد کر کے پوچھا کہ اس نے خود کچھ کھا لیا ہے یا کسی نے اسے کچھ کھلا دیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے نہ کچھ کھایا ہے نہ کسی نے اسے کھلایا ہے۔ مجھے یہ شک ہونے لگا تھا کہ چونکہ اس لڑکی کے ساتھ اس کی شادی نہیں ہو سکتی اس لیے اس نے کچھ کھا کر خودکشی کی کوشش کی ہے مگر وہ انکار کر رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ ہم ڈاکٹر کے سوا کسی کو نہیں بتائیں گے۔ وہ صحیح علاج کر سکے گا پھر بھی اُس نے انکار کیا۔ میں نے اور شہباز نے بہت اصرار کیا۔ وہ نہ مانا۔

پھر وہ سو گیا۔ یہ شاید دوائیوں کا اثر تھا۔ اُس زمانے میں مریضوں کا یہ ہجوم نہیں ہوا کرتا تھا کہ ہسپتالوں کے برآمدوں میں بھی کسی مریض کو جگہ نہ ملے۔ جس وارڈ میں جہانے کو رکھا گیا تھا اس میں صرف تین مریض تھے۔ باقی تمام پلنگ خالی پڑے تھے۔ ہم نے ایک پلنگ جہانے کے پلنگ کے قریب کر لیا اور میں اور شہباز اکٹھے لیٹ گئے اور سو گئے۔ رات شاید آدھی گزری ہو گی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ جہاناں بڑی ہی دھیمی آواز میں مجھے بُلا رہا تھا اور ہاتھ لمبا کر کے مجھے ہلا بھی رہا تھا۔ میں تیزی سے اُٹھا اور اس کے پلنگ پر بیٹھ کر پوچھا "کیا بات ہے جہانے! تکلیف ہے؟ پانی پیو گے؟"

"میری تکلیفیں ختم ہو چکی ہیں، میرے قریب ہو جاؤ۔ اچھی طرح بولا نہیں جاتا"۔۔۔۔ اس نے اس پُراسرار بیماری کی ماری ہوئی آواز میں کہا۔ میں اس کے قریب ہو گیا۔ اس

نے کہا ـــــ "مجھ سے سچی بات سُن لو۔ میرے مرنے کے بعد تمہیں یہ افسوس نہ رہے کہ دوست ایک بھید قبر میں لے گیا ہے۔ مجھے کل گھر لے چلو صابو! مَیں زندہ نہیں رہوں گا۔ مَیں نے خودکشی کی کوشش نہیں کی۔ تم جانتے ہو مَیں کتنے دلیر باپ کا بیٹا ہوں۔ مَیں میدان چھوڑ کر بھاگنے والا مرد نہیں۔ مجھے تم پر اور شہباز پر اعتبار ہے۔ یہ بھید کسی اور کو نہ بتانا ورنہ لڑکی بدنام ہو جائے گی۔ ڈاکٹر کا تم ... ٹھیک ہے۔ میرے خون میں وہ زہر چلا گیا ہے جو مَیں نے لڑکی کے خون سے چوسا تھا۔ اسے سانپ نے اُس وقت کاٹا تھا جب وہ میرے ساتھ تھی"۔

مَیں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کہ جھانے کے اس انکشاف نے میری جذباتی حالت کیا کر دی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جھوٹ بول رہا ہو مگر اس کی سچائی کا یہ ثبوت کافی تھا کہ وہ مر رہا تھا اور لڑکی بالکل ٹھیک تھی۔

"کتّے جب سہوں کو مارنے کی کوشش کر رہے تھے اور تم سب اس کے شکار میں مگن تھے، اُس وقت مَیں وہاں سے چلا گیا تھا" ـــــ اس نے کہا ـــــ "تم نے تین روز پہلے مجھے بتا دیا تھا کہ شکار پر جا رہے ہیں۔ مَیں نے لڑکی کو پیغام بھیجا کہ مَیں فلاں دن آ رہا ہوں۔ اس نے جواب بھیجا کہ وہ سہیلیوں کے ساتھ باغ میں ہوگی اور مجھے دیکھ کر اسی جگہ (کھڈ میں) آ جائے گی۔ مَیں تمہارے ساتھ گیا تو اس نے باغ میں سے کُتّے دیکھ لیے اور نظر بچا کر کھڈ میں آ گئی۔ اگر تمہیں سہہ نہ مل جاتے تو مَیں کوئی اور بہانہ بنا کر تم سے الگ ہو جاتا۔ تمہیں سہوں کے شکار میں مگن دیکھا تو چپکے سے وہاں سے نکلا اور لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ ہماری نیت بد نہیں تھی۔ پھر معلوم نہیں خدا نے ہمیں یہ سزا کیوں دی۔ ہم نے ابھی کوئی بات بھی نہیں کی تھی کہ مجھے 'شوں' کی آواز سنائی دی، اور

لڑکی کی چیخ نکل گئی۔ وہ جھکی۔ میں نے بھی دیکھا۔ کم از کم ایک گز لمبا سانپ بڑی تیزی سے ایک کھوہ میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ لڑکی کو کاٹ گیا تھا...

"اس کے ٹخنے کے قریب خون کے چار قطرے دیکھے۔ یہ سانپ کے دانتوں کے نشان تھے۔ میں نے جلدی سے اپنی پگڑی اتاری اور پھاڑنے لگا تو اس نے کہا — "ٹھہرو، کیا کرنے لگے ہو؟ پگڑی نہ پھاڑنا" — میں نے اسے بتایا کہ اس کے ٹخنے کے اوپر کس کر باندھ دوں گا تاکہ زہر اوپر نہ جائے۔ لڑکی عقل والی ہے اور دل والی بھی۔ سانپ کا صرف خوف ہی کافی ہوتا ہے لیکن وہ خوفزدہ نہ ہوئی۔ اس نے کہا۔ میرا دوپٹہ پھاڑو اور جہاں باندھنا ہے باندھ دو۔ گھر والوں نے تمہاری پگڑی کا ٹکڑا میری ٹانگ سے بندھا دیکھا تو انہیں شک ہوگا۔" میں نے اس کے دوپٹے سے لمبی پٹی پھاڑی جو اس کی پنڈلی پر رسی کی طرح کس کر باندھ دی۔ مجھے اب چاقو کی ضرورت تھی جو میرے پاس نہیں تھا۔ میری نظر اس کی چوڑیوں پر پڑی۔ میں نے ہاتھ سے دبا کر اس کی ایک چوڑی توڑ دی۔ اس کے تین ٹکڑے ہوئے۔ میں نے تینوں کے سرے دیکھے۔ ان میں سے ایک کھال کاٹنے کے کام آسکتا تھا...

"میں نے لڑکی سے کہا کہ اب دل مضبوط رکھو۔ درد ہوگا۔ میں نے اس کی کھال پر جہاں سانپ نے دانت گاڑے تھے چوڑی کے تیز دھار والے سرے سے زخم کھول دیا اور منہ وہاں رکھ کر زور سے سانس اندر کو لیا۔ میرا منہ لڑکی کے خون سے بھر گیا۔ میں نے یہ خون اگل دیا۔ اس طرح چار بار اس کے زخموں سے خون چوسا اور اگلا۔ میں نے اس کا بہت سا خون نکال کر زمین پہ بکھیر دیا تھا۔ پھر اس کے دوپٹے سے دوسری پٹی پھاڑ کر زخموں پہ باندھ دی اور اسے کہا کہ فوراً باغ میں جائے اور وہاں بتائے کہ

ا تھ سانپ نے ڈس لیا ہے اور اس نے اپنی عقل سے یہ علاج کیا ہے جو دراصل مَیں نے کیا تھا۔ مَیں اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ وہ گھبرائی نہیں تھی۔ کھڈ سے نکل کر تھوڑی دُور تک اس کے ساتھ گیا۔۔۔ جب دیکھا کہ مَیں کسی کو نظر آجاؤں گا مَیں اس سے الگ ہو گیا اور اس کے گاؤں اپنے رشتہ داروں کے گھر چلا گیا۔ پانی سے منہ اندر سے اچھی طرح صاف کیا اور لڑکی کا انتظار کرنے لگا۔۔۔۔

"وہ گدھی پر سوار ہو کر آگئی۔ سارے گاؤں میں خبر پھیل گئی کہ اسے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ پھر سنیاسی آگیا اور یہ خبر ملی کہ لڑکی ٹھیک ہے۔ مَیں بھی بالکل ٹھیک تھا۔ شام کو وہاں سے اپنے گاؤں آیا۔ مَیں نے اپنے جسم میں بھی کچھ محسوس نہیں کیا۔ سانپ شاید زیادہ زہریلا نہیں تھا۔ رات کو مجھے جسم پر خارش محسوس نہیں ہُوئی۔ آنکھ کُھل گئی۔ سر چکرا رہا تھا اور دل پر گھبراہٹ طاری تھی۔ دل ڈوب رہا تھا۔ مَیں سمجھ گیا کہ کچھ زہر میرے اندر چلا گیا ہے جس کا اثر اب شروع ہُوا ہے۔ صبح کو میرے جسم کو آگ لگی محسوس ہونے لگی۔ مجھے سنیاسی کا خیال آیا لیکن لڑکی کی بدنامی کے خیال سے مَیں چُپ رہا۔ مَیں سنیاسی کو کیا بتاتا کہ میرے اندر سانپ کا زہر کس طرح گیا ہے۔ میری حالت تیزی سے بگڑنے لگی۔ ہمارے خفیہ پیغام لانے لے جانے والی عورت نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ لڑکی بالکل ٹھیک ہے۔ میرے لیے یہ بہت بڑی خوشخبری تھی۔ مَیں مرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مَیں اس سکون کے ساتھ مر رہا ہُوں کہ جسے بچانے کی کوشش کی تھی وہ بچ گئی ہے اور ٹھیک ہے"۔۔۔ اُس کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگا۔۔۔ "مجھے بخش دینا اُسے میرا آخری سلام پہنچا دینا اور کہنا کہ تم آزاد ہو۔ میری یاد میں اپنی زندگی تباہ نہ کرنا اور ماں باپ کو ناراض نہ کرنا۔ وہ جس کے ساتھ تمہیں بیاہ دیں اُسی کی وفادار رہنا۔"

اس نے بہت سی جذباتی باتیں کیں اور وہ بے ہوش ہو گیا یا اسے نیند آ گئی۔ میں باقی رات سو نہ سکا۔ صبح ڈاکٹر آیا تو جہانے کو دیکھ کر وہ مایوس ہو گیا۔ وارڈ سے نکلا تو میں اور شہباز اس کے پیچھے چلے گئے۔ اسے روک کر جہانے کی محبت کی پوری کہانی، لڑکی کے ساتھ اس کی آخری ملاقات اور سانپ کا زہر چوسنے کی بات تفصیل سے سنا دی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اُسے پہلے ہی شک تھا کہ اسے ایسا زہر دیا گیا ہے جو فوراً ہلاک نہیں کر سکتا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر لڑکی صحت یاب ہو گئی ہے تو سانپ زیادہ زہریلا نہیں تھا۔ زہر اگر چوس لیا جائے تو بھی زود اثر زہر خون کی باریک نسوں میں رہ ہی جاتا ہے۔ زہر چوسنے والا ہزار تھوکے زہر کی کچھ مقدار حلق سے نیچے چلی ہی جاتی ہے اسی لیے اس لڑکے کو کئی گھنٹے زہر کا اثر محسوس ہی نہ ہوا۔ اب اس کا جگر اور گردے بہت خراب ہو گئے ہیں۔ دماغ پر بھی زہر کا اثر ہو گیا ہے۔

ہم نے ڈاکٹر سے کہا کہ وہ ہمارے بڑوں کے سامنے ذکر نہ کرے کہ جہانے نے لڑکی کے زخم سے زہر چوسا تھا۔ ڈاکٹر کوئی مخلص اور نیک انسان تھا۔ اُس نے راز کو راز رکھنے کا وعدہ کیا اور دوائیاں بدل دیں۔ انجکشن بھی دیا۔ بدلے ہوئے نسخے سے جہانے کی حالت سنبھلنے لگی۔ ایک ہفتے بعد اس کے چہرے کی زردی کم ہونے لگی۔ وہ کھڑا بھی ہونے لگا۔ دو ہفتوں بعد وہ آہستہ آہستہ چلنے پھرنے لگا۔ اس کی ماں اُسے فوراً پہلے والا تندرست و توانا جہاناں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے ضد شروع کر دی کہ وہ جہانے کو گھر لے جائے گی۔ ڈاکٹر اسے ایک ہفتہ اور رکھنا چاہتا تھا۔ ہم بھی ڈاکٹر کی تائید کر رہے تھے مگر ماں اتنی جذباتی بلکہ پاگل سی ہو گئی کہ ڈاکٹر نے کہا کہ لے جاؤ۔ ماں کبھی کہتی اس نے بہت بُرا خواب دیکھا ہے۔ کبھی کہتی کہ اسے ایک جن نے دھمکی دی ہے۔

ہم جہانے کو گاؤں لے آئے۔ اس علاقے کا شاہ جی (پیر) انتظار میں تھا۔ پتہ چلا کہ جہانے کو ہسپتال سے گاؤں لانے میں اسی شاہ کا ہاتھ تھا۔ اس کی روزی ہسپتال چلی گئی تھی۔ اس نے جہانے پر دم درود اور تعویذوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مَیں اور شہباز سنیاسی سے ملے۔ اسے پیسے دیئے اور جہانے کی اصل کہانی سُنا کر اسے کہا کہ اس راز کو وہ راز رکھے اور جہانے کا علاج کرے۔ اسی نے لڑکی کو دوائی دی تھی۔ کہنے لگا کہ سانپ زہریلا نہیں تھا۔ وہ ہمارے ساتھ آگیا۔ ہم اسے جہانے کے گھر لے گئے۔ بدقسمتی سے وہاں شاہ جی بیٹھا ہُوا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر سنیاسی کو گھر سے نکلوا دیا کہ جہانے پر جس جن کا قبضہ ہے وہ سیّد ہے اور تم اس کے علاج کے لیے ایک کافر کو لے آئے ہو۔ اپنے لڑکے کو جنوں کے ہاتھوں جلدی مروانا چاہتے ہو؟

ہم مجبور ہو گئے۔ سارے گاؤں نے تسلیم کر لیا کہ جہانے پر جن کا قبضہ ہے۔ راز ایسا تھا جو کسی کو بتایا نہیں جا سکتا تھا۔ جہانے کی حالت روز بروز بگڑنے لگی۔ ایک روز مَیں اسے دیکھنے گیا۔ تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل گیا۔ مَیں نے اسے کہا کہ اس کے باپ کو بتا دیتے ہیں کہ یہ سانپ کے زہر کا اثر ہے جس کا علاج ہسپتال میں ہے یا سنیاسی کے پاس، مگر جہانے نے کہا ــــ "لڑکی بدنام ہو جائے گی۔ وہ پاک لڑکی ہے۔ مجھے اس بھید پر مر جانے دو۔ قبر سے یہ بھید کوئی نہیں نکال سکے گا۔"

ایک ماہ بعد جہاناں یہ بھید اپنی قبر میں لے گیا۔

ہم لڑکی کا ردِّ عمل معلوم کرتے رہے۔ اس پر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ گھر میں بھی کسی کے ساتھ بات نہیں کرتی تھی۔ اسے بھی تعویذ دیئے جانے لگے۔ دیہات میں کسی کی کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ شاید لڑکی کی سہیلیوں کے منہ سے نکل گئی کہ لڑکی جہانے کو

چاہتی تھی اور اس کی یہ حالت جہانے کی موت سے ہوئی ہے۔ سانپ کا زہر چوسنے والا راز صرف مجھے اور شہباز کو معلوم تھا ورنہ یہ بھی فاش ہو جاتا۔ ایک روز لڑکی گھر سے لاپتہ ہو گئی۔ شام کو وہ ہمارے قبرستان سے ملی۔ وہ جہانے کی قبر پر بیٹھی ہوئی تھی بھائیوں نے اسے مارا پیٹا۔ ہمیں پتہ چلا کہ اُس نے مار کھالی۔ بولی نہیں اور روئی بھی نہیں۔ پھر مار پٹائی کا سلسلہ چل پڑا مگر اس کی خاموشی نہ ٹوٹی۔ وہ کسی کام میں دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ دوبارہ اپنے گاؤں سے نکلی اور ہمارے گاؤں کا رُخ کیا مگر اُسے راستے میں پکڑ لیا گیا اور گھسیٹ کر گھر لے گئے۔

چند مہینوں بعد اسے برادری کے بزرگوں کے فیصلے کے مطابق ایک آدمی کے ساتھ بیاہ دیا گیا مگر دو ہی مہینوں بعد طلاق ہو گئی۔ بہت عرصے بعد اس آدمی نے بتایا تھا کہ پہلے روز ہی لڑکی نے اسے کہہ دیا تھا ــــ "میرے ماں باپ نے تمہیں ایک پتھر دے دیا ہے۔ مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو تو آؤ جہانے کی قبر پر چلیں"۔

لڑکی دراصل پاگل ہو چکی تھی۔ اپنے خیالوں میں گم رہتی تھی۔ طلاق کے چھ سات ماہ بعد یہ خبر مشہور ہو گئی کہ شام کے وقت لڑکی کے پیٹ میں درد اُٹھا اور رات کو مر گئی۔ لڑکی کا یہی انجام ہونا تھا ــــ لڑکی پیٹ کے درد سے نہیں مری اسے قتل کیا گیا تھا۔ دیہات میں ایسے قتل آسانی سے چھپا لیے جاتے ہیں۔ ساری برادری تعاون کرتی ہے۔

پاگل کی ماں اور شہد کی مکھی

نشیب کی عمودی دیوار بہت اُونچی تھی۔
اُوپر ایک جگہ سے یہ دیوار کٹی ہُوئی اور
ڈھلان سی بنی ہُوئی تھی۔ وہاں مجھے
ایک عورت کھڑی نظر آئی۔ چُپ چاپ،
بے حس۔

بھیڑیئے کی خبر ہمارے گاؤں میں بھی پہنچ گئی۔ پوری خبر یہ تھی کہ ہمارے گاؤں سے سات آٹھ میل دُور کھڈ نالوں، مٹی کے ٹیلوں اور وسیع گھراٹیوں کا علاقہ تھا۔ وہاں ایک بھیڑیا یا بھیڑیوں کا ایک جوڑا آگیا تھا۔ لوگوں نے اُدھر سے گزرنا چھوڑ دیا تھا۔ مَیں جس دَور کی بات کر رہا ہُوں اُس وقت ہمارے علاقے میں آبادیاں کم اور ویرانے زیادہ تھے۔ لوگوں نے انہی میں سے راستے بنائے ہوئے تھے۔ زیادہ تر لوگ پیدل چلتے تھے۔ گھوڑے، ٹٹو اور گدھے بھی استعمال ہوتے تھے۔ اب سڑکیں اور پکّے راستے بن گئے ہیں۔ آبادیاں زیادہ ہوگئی ہیں۔ ویرانے ویرانے نہیں رہے۔ جگہوں کی شکلیں اور خدوخال ہی بدل گئے ہیں۔ نشیب میدان بن گئے ہیں اور جو جگہیں بیابان ہیں وہاں میری جوانی کے وقتوں کی ہیبت نہیں رہی۔

اُس دَور میں ذرائع آمدورفت نہ ہونے کی وجہ سے کوئی خبر دُور دُور تک نہیں پھیل سکتی تھی، پھر بھی خبریں پہنچ جاتی تھیں۔ کوئی مسافر کسی گاؤں کے قریب سے گزرتا تھا تو باہر بیٹھے ہوئے لوگ اُسے ستانے کے لیے روکتے تھے، پاس بٹھاتے تھے، خاطر تواضع کرتے تھے۔ اُس کے گاؤں کی اور اِرد گرد کی خبریں پوچھتے تھے۔ اس طرح ایک جگہ کی خبر دوسری جگہ پہنچ جاتی تھی۔ آج وہ پیار اور خلوص نہیں رہا۔ کسی کو کسی کے ساتھ دلچسپی نہیں ہے

کسی پر کوئی مصیبت آپڑتی تو دشمن بھی اُس کی مدد کو پہنچتے تھے۔ کوئی دشمن زمین کے نیچے سے یا پیٹھ کے پیچھے سے وار نہیں کرتا تھا۔ دوست دوست اور دشمن دشمن ہوتے تھے۔ دوستی کے پردے میں دشمنی کرنے والے کو لوگ بُزدل اور بے غیرت کہتے تھے۔ اب تو جوں جوں تعلیم عام ہوتی جا رہی ہے اور لوگ نئی تہذیب کے شیدائی ہوتے جا رہے ہیں، انسانوں کے دلوں سے انسانیت نکلتی جا رہی ہے۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں۔ مَیں نیا نیا جوان ہُوا تھا جس کی سزا میری ماں نے مجھے یہ دی کہ میری شادی کر دی۔ انکار کی ہمت نہیں تھی۔ انکار اور اپنی پسند کی اجازت ہی نہیں ہوتی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ میری کوئی پسند ہی نہیں تھی۔ اگر والدین میری رائے لیتے تو مَیں یہی کہتا کہ دو چار سال اور کتّوں کے ساتھ گیدڑوں اور خرگوشوں کے پیچھے بھاگنے دو، اور جب میری لات یا بازو کہیں گر کر ٹوٹ جائے گا تو شادی کر دینا، مگر مجھ سے کسی نے نہ پُوچھا۔ مجھے یوں دبوچ لیا گیا جس طرح ہماری ٹیم کے بُل ٹیریئر، السیشین اور بُوہلی گیدڑ کو پکڑ کر چیٹ کر جاتے تھے۔ ہم نے گیدڑ کے پیچھے کُتّے ڈالنے سے پہلے گیدڑ سے کبھی نہیں پُوچھا تھا بتا تیری رضا کیا ہے۔ گاؤں کی مسجد کے امام صاحب ہمیں کہا کرتے تھے کہ اگلے جہان تم گیدڑ اور خرگوش بنو گے اور گیدڑ خرگوش کُتّے بنیں گے۔ خداوند تعالیٰ انہیں تمہارے پیچھے ڈالے گا اور یہ تمہاری کھال اُدھیڑیں گے پھر تمہیں بوٹی بوٹی کر کے کھائیں گے۔ تمہیں پھر گیدڑ اور خرگوش بنایا جائے گا اور کُتّوں سے پھڑوایا جائے گا۔

یہ میرا ایمان ہے کہ اگلے جہان ہمیں اپنی ہر ایک کرتُوت کی سزا ملے گی مگر خدا نے یہ سزا اسی دنیا میں عین اُس وقت شروع کر دی جب میں جوان ہُوا تھا۔ شادی ہوئی، کھال بھی اُدھڑی، میری بوٹیاں بھی نوچی گئیں مگر میری ہڈیوں کا پنجر کھال میں رہا اور بوٹیاں

ہڈیوں کے ساتھ رہیں۔ اللہ نے یہ کرم کیا کہ شادی کے چودھویں مہینے ایک بیٹا عطا فرما دیا جسے میں چودھویں کا چاند کہا کرتا تھا۔ بچے کی عمر ایک مہینہ ہوگئی۔ ایک روز گاؤں کے سات آٹھ آدمی باہر بیٹھے گپ شپ میں مگن تھے۔ میں بھی اپنے دو تین دوستوں کے ساتھ موجود تھا۔ کسی دور دراز گاؤں کے دو آدمی ہمارے قریب سے گزرے۔ انہوں نے سلام کیا۔ ہم نے سلام کا جواب دے کر انہیں روک لیا۔ وہ بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ انہیں بٹھایا۔ روٹی پیش کی۔ حقہ پلایا اور کسی نے اُن سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آئے اور کہاں جا رہے ہیں۔

انہوں نے اس سوال کا جواب دے کر کہا ــــ "اِس وقت تک ہم اپنی منزل پر پہنچ چکے ہوتے لیکن دو کوس کا فالتو چکر کاٹنا پڑا۔ راستے میں ایک بھیڑیا ہے جو دن کو بھی نہیں گزرنے دیتا۔ لوگوں نے وہ راستہ ہی چھوڑ دیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ بھیڑیوں کا جوڑا ہے۔ اُس راستے سے جو لوگ گزرا کرتے تھے وہ اب دُور کا چکر کاٹ کر جاتے ہیں"۔

بھیڑیئے کا نام سُن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ میرے جو ہمجولی وہاں موجود تھے انہوں نے میری طرف اور میں نے اُن کی طرف دیکھا۔ ہمارے کان شکاریوں کے کان تھے۔ ہمارے علاقے میں اُس زمانے میں بھیڑیئے پائے جاتے تھے جنہیں ہم اپنی زبان میں بھگیاڑ کہا کرتے تھے مگر دن کو یہ بہت کم نظر آتے تھے۔ رات کو کبھی کبھی اُن کی آواز سنائی دیتی تھی۔ گیدڑ رات کو گاؤں کے قریب بھی آجایا کرتے تھے، بھیڑیا اتنی قریب نہیں آتا تھا۔ ہم نے ایسا واقعہ بھی کبھی نہیں سُنا تھا کہ بھیڑیئے نے کسی انسان پر حملہ کیا ہو، لیکن بھیڑیئے موجود تھے۔ اگر آپ کو میری سُنائی ہوئی کہانیاں یاد ہیں تو آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ ایک بار میرا مقابلہ ایک بھیڑیئے کے ساتھ ہوگیا تھا لیکن باہر نہیں۔ میں بھیڑیئے کی کھوہ کے

اندر چلا گیا تھا۔ دوسری بار میرے دو دوست شکار کے دوران بھیڑیوں کے غول کے گھیرے میں آگئے تھے۔ یہ اُس پہاڑی علاقے کا واقعہ ہے جو جہلم اور گوجر خان کے درمیان پھیلا ہُوا ہے۔

اِن دو آدمیوں نے بھیڑیوں کا نام لیا تو مَیں نے اُن کے چہروں پر خوف کا تاثر دیکھا۔ اگر وہ میرے یا میرے دوستوں کے چہرے غور سے دیکھتے تو اُن پر انہیں بھیڑیئے کے چہرے کا اُس وقت کا تاثر نظر آتا جو کمزور سا شکار دیکھ کر چہرے پر آتا ہے۔ میرے شکاری دوستوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ دن کے وقت لوگوں کا راستہ روکنے والا بھیڑیا ہمارا من پسند شکار تھا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ہم بندوقوں سے شکار نہیں کھیلا کرتے تھے۔ ہمارے پاس کُتّے تھے۔ اِن کے ساتھ بھاگنے کے لیے ہمارے پاس گھوڑے نہیں تھے۔ کُتّے جب شکار کے پیچھے دوڑتے تھے تو ہم شلواریں اور چادریں اُوپر کر کے اُن کے ساتھ دوڑا کرتے تھے۔

اِن آدمیوں نے بھیڑیوں کی جگہ بتا کر کہا ــــ "یہ ابھی تک کوئی نہیں دیکھ سکا کہ بھیڑیا ایک ہے، دو ہیں یا زیادہ ہیں۔ کوئی ایک مہینہ گزرا دو تین آدمی اُدھر سے گزرے تو انہیں بھیڑیئے کی خوفناک اور غصیلی آواز سنائی دی۔ ایک جگہ عمودی ٹیلوں میں گھری ہوئی ہے۔ بھیڑیا وہاں تھا۔ یہ آدمی وہ راستہ چھوڑ کر چکر کاٹ کے گئے۔ اس کے بعد ایک اور آدمی نے وہاں بھیڑیئے کو غراتے سُنا اور اُلٹے پاؤں بھاگ آیا۔ جب آٹھ دس آدمیوں نے بتایا کہ اُس جگہ بھیڑیئے ہیں تو لوگوں نے اُدھر سے گزرنا چھوڑ دیا۔"

انہوں نے جو جگہ بتائی وہ ہمارے گاؤں سے سات آٹھ میل دُور تھی۔ ایک بار ہم شکار کو گئے تو وہاں سے گزرے تھے۔ وہ ہمارے علاقے کے مخصوص خدوخال والی

جگہ تھی۔ وہاں بھیڑیئے کی موجودگی کوئی عجوبہ نہیں تھی۔ گیدڑ، بھیڑیئے اور اُودھ بلاؤ وغیرہ ایسی جگہوں میں عموماً ٹیلوں کی کھوہوں میں رہتے ہیں مگر دن کے وقت بھیڑیئے کا باہر آنا حیران کُن تھا۔ ان آدمیوں نے ایک اور بات بتا کر ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیا اور میرے دل میں شکار کا جو ارادہ آیا تھا وہ متزلزل ہو گیا۔

"لوگ بھیڑیوں سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا اُن انسانی قہقہوں سے خوفزدہ ہیں جو لوگوں نے بھیڑیوں کی آواز کے ساتھ سُنے ہیں"۔ اِن دونوں میں سے ایک نے کہا۔ "بھیڑیا غراتا اور بھونکتا ہے پھر کسی آدمی کا قہقہہ سُنائی دیتا ہے۔ یہ کوئی شرشرار ہو سکتا ہے۔ بھیڑیئے تو قہقہے نہیں لگایا کرتے"۔

اُس وقت میں گنوار دیہاتی تھا۔ شکار کی کہانیاں کبھی نہیں پڑھی تھیں۔ شیروں اور چیتوں جیسے درندوں کے نام سُنے تھے۔ اُن کی خصلتوں کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ یہ بہت بعد کی بات ہے کہ مَیں نے درندوں کے متعلق کتابیں پڑھیں تو مجھے پتہ چلا کہ ایک درندے کو لکڑ بھگا کہتے ہیں۔ انگریزی سے HYENA کہتے ہیں۔ یہ بھیڑیئے کی طرح ہوتا ہے۔ اس کا منہ بھیڑیئے کی طرح لمبوترا نہیں بلکہ گول سا ہوتا ہے۔ رات کو جنگل میں یہ بولتا ہے تو اس کی آواز انسانی قہقہوں کی طرح ہوتی ہے۔ اگر کوئی آدمی اس کی آواز سے ناآشنا ہو تو وہ کبھی نہ مانے کہ یہ کسی درندے کی آواز ہے۔ وہ یہی کہے گا کہ کوئی آدمی قہقہے لگا رہا ہے۔ لاہور کے چڑیا گھر میں یہ درندہ موجود ہے۔

اگر اُس وقت جب یہ دو آدمی ہمیں سُنا رہے تھے کہ بھیڑیا غراتا اور بھونکتا ہے۔ پھر کسی آدمی کے قہقہے سُنائی دیتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوتا کہ لکڑ بھگا بھی کوئی درندہ ہوتا ہے تو مَیں انہیں بتاتا کہ یہ بھیڑیا نہیں لکڑ بھگا ہے جو انسانی قہقہوں کی طرح بولتا ہے۔

ہم میں سے کسی کو بھی معلوم نہ تھا اس لیے ہم سب یہ سمجھ کر ڈر گئے کہ یہ کوئی جن یا چڑیل ہے۔ انگریزی میں اسے بدروح کہتے ہیں۔ لوگ آج بھی جنوں اور چڑیلوں کو مانتے ہیں۔ اس دور میں تو ہر وہ واقعہ جو ناقابلِ یقین یا ناقابلِ فہم ہوتا تھا، لوگ اسے جنوں اور چڑیلوں کی کارستانی کہہ دیا کرتے تھے۔ یہ قصے بھی اسی مخلوق کے سمجھ لیے گئے۔ بھیڑیوں کے ساتھ انسان نہیں رہ سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں نے دن کے وقت بھی ادھر سے گزرنا چھوڑ دیا تھا۔

میں بھی جنوں اور چڑیلوں کے وجود کو مانتا تھا لیکن جوانی کا جوش ایسا تھا کہ تعصبوں پر غالب آجایا کرتا تھا اور ایسے خطروں میں بھی لے جاتا تھا جہاں جان جانے کا بھی امکان ہوتا تھا۔ تجسس ہمیں اندھا کر دیا کرتا تھا۔ یہ دونوں آدمی چلے گئے۔ شام تک سارے گاؤں کو پتہ چل گیا کہ فلاں جگہ خطرناک ہے اس لیے ادھر سے کوئی نہ گزرے۔ اس قسم کی خبروں میں دلچسپی یہ ہوا کرتی تھی کہ جوں جوں آگے چلتی جاتی اس میں اضافے ہوتے جاتے اور اس میں سنسنی بڑھتی جاتی تھی۔ یہی سلوک اس خبر کے ساتھ ہوا۔ اس سے میں اور میرے نوجوان دوست یہ سمجھے کہ یہ دو آدمی جو خبر سنا گئے ہیں اس میں بھی مبالغہ ہوگا۔ انہوں نے خود بھیڑیئے کی آواز نہیں سنی اور قصے بھی نہیں سنے تھے۔ ہم چونکہ وہاں جانا چاہتے تھے اس لیے ہم نے اس سنسنی خیز خبر کے ان پہلوؤں کو سامنے رکھا جو ہمارے ارادے کو تقویت دے سکتے تھے۔

میرے ہمجولیوں نے بڑوں سے چوری چھپے میٹنگ کی اور غور و خوض کیا کہ ہم کتوں کو لے کر اس بھیڑیئے کے شکار کو جائیں یا نہ جائیں۔ جانے پر تو سب رضامند تھے لیکن جن اور چڑیل کا ڈر سب کو پریشان کرتا تھا۔ ہمارے پاس اس کے دو علاج

موجود تھے۔ ایک یہ کہ یہ مشہور تھا کہ چمکتی ہوئی کلہاڑی، تلوار، چھری یا چاقو ہاتھ میں ہو تو جن اور چڑیلیں بھاگ جاتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ کتے اگر بظاہر بلاوجہ بھونکنے لگیں اور آسمان کی طرف منہ کر کے رونے کی آوازیں نکالیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انہیں کوئی جن یا چڑیل نظر آ رہی ہے۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ وہاں جائیں گے۔ ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور چاقو رکھیں گے۔ کتوں کو دیکھتے رہیں گے۔ یہ مخصوص طریقے سے بھونکے تو واپس آجائیں گے۔

ہم نے اپنا یہ پروگرام بڑوں سے پوشیدہ رکھا۔ ابھی جانے کا دن مقرر نہیں کیا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم سب اندر سے ڈرتے بھی تھے۔ دو تین دن گزر گئے۔ ایک روز ہمارے گاؤں سے پانچ چھ میل دور کے ایک گاؤں کے دو نوجوان آئے۔ امیر کبیر گھرانوں کے تھے۔ نہری علاقے میں ان کے باپوں کو فوجی ملازمت کے صلے میں مربعے ملے ہوئے تھے۔ ہماری دیکھا دیکھی انہوں نے شکار کے لیے کتے رکھے ہوئے تھے۔ وہ میرے ایک دوست راجہ شاہباز خان کے گھر آئے۔ شاہباز خان نے مجھے اور اپنے دوسرے شکاری دوستوں کو بلا لیا۔ یہ نوجوان ہماری طرح نڈر اور جتونی تھے۔ انہوں نے اسی جگہ کا نام لے کر کہا کہ لوگوں نے ادھر سے گزرنا چھوڑ دیا ہے۔ ان نوجوانوں نے اس ارادے کا اظہار کیا کہ وہ اپنے کتے لائیں گے۔ ہم اپنے کتے لے چلیں اور ان بھیڑیوں کو ختم کریں۔ وہ ہماری شکار پارٹی کی شہرت سن کر آئے تھے۔

ہم نے ان سے پوچھا کہ بھیڑیوں کی آوازوں کے ساتھ جو انسانی قہقہے ہیں ان کے متعلق انہوں نے کیا سوچا ہے۔ انہوں نے ہماری طرح اور سب کی طرح انہیں جنوں اور چڑیلوں کے قہقہے کہا لیکن یہ بھی کہا کہ یہ جھوٹ معلوم ہوتا ہے کیونکہ قہقہوں کی گواہی

بہت کم لوگوں نے دی ہے۔ ان نوجوانوں میں سے ایک نے کہا ــــ "یہ جن اور چڑیل ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بھیڑیا ہی ہو۔ اگر ہم نے اسے نہ مارا تو یہ اُس جگہ سے باہر آکر راہ جاتے لوگوں پر حملے شروع کر دے گا۔ یہ ڈر بھی ہے کہ وہاں زیادہ بھیڑیئے ہوں گے۔ اگر یہ جن یا چڑیل ہوئی تو ہمارے پاس کلہاڑیاں اور چاقو ہوں گے۔ ہم انہیں نہیں چھیڑیں گے۔ خاموشی سے واپس آجائیں گے۔"

اِن نوجوانوں کی یہ باتیں مجھے بہت اچھی لگیں۔ مجھے لوگوں کی سلامتی کا معلوم نہیں کچھ خیال تھا یا نہیں اپنے شغل کے ساتھ بہت دلچسپی تھی۔ ہم نے خطروں کو آنکھوں سے اوجھل کر کے بھیڑیئے کے شکار کا پروگرام بنایا۔ ان دونوں کو ایک جگہ اور دن بتا کر کہا کہ ہم سورج نکلنے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔

روانگی سے ایک دن پہلے مَیں نے اپنی بیوی سے کہا کہ کل صبح سویرے انڈے اور پراٹھے تیار کر دے، مَیں شکار کو جا رہا ہوں۔ میرے بچّے کی عمر ابھی ایک مہینہ ہوئی تھی اس لیے میری بیوی کو پُورے چالیس روز کی چھٹی تھی۔ ماں سے کہا تو اُس نے پہلی بات یہ کہی۔ "اب تو بچّہ یا لڑکا نہیں رہا، اب تو باپ بن گیا ہے۔ اب کچھ شرم کر۔ کُتّوں کی دوستی چھوڑ دے۔"

"بس آخری بار۔" مَیں نے ماں کے کندھے دباتے ہوئے کہا۔ مَیں ہر بار یہی کہا کرتا تھا۔

"اگر تیرے بچّے کو تیری ہوا لگ گئی تو اِس گھر سے کُتّا نہیں نکلے گا۔" ماں نے کہا۔

"اُس نے تو ابھی آنکھیں بھی نہیں کھولیں۔" مَیں نے کہا۔ "ہوش سنبھالے گا تو مَیں تمہارے سے توبہ کر لوں گا۔"

صبح ابھی دھندلی تھی جب ماں انڈے اور پراٹھے رومال میں باندھ چکی تھی۔ مَیں

چلا تو اُس نے کہا ــــــ "کہیں اُدھر نہ چلے جانا جہاں لوگ کہتے ہیں کہ بھیڑیئے ہیں یا جن بھوت ہیں"

"توبہ، توبہ، توبہ" میں نے کان پکڑ کر کہا ــــــ "اُدھر تو میرے فرشتے بھی نہ جائیں"

ہم گاؤں سے نکلے۔ ہمارے ساتھ نو کُتّے تھے اور پارٹی کی نفری ایک درجن کے قریب تھی۔ ایک لڑکے نے پوچھا کہ کلہاڑیوں کے پھل چمکا لیے ہیں یا نہیں؟ چار لڑکوں کے پاس چھوٹے پھل اور لمبے دستے والی کلہاڑیاں تھیں۔ سب نے پھل چمکا رکھے تھے تاکہ دھوپ میں شیشے کی طرح چمکیں اور جن اور چڑیلیں قریب نہ آئیں۔ میرے پاس لمبا چاقو تھا جس کے پھل کو میں نے ریت سے چمکایا تھا۔ ہم اُس جگہ پہنچے جہاں دوسرے گاؤں کے شکاریوں کو آنا تھا۔ وہ آگئے۔ چار کُتّے اور چار ہی نوجوان تھے۔ اُن کے اور ہمارے کُتّوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آہستہ آہستہ غرّائے۔ ہم نے انہیں تھپکیاں دیں اور سب کی زنجیریں الگ کر دیں تاکہ وہ ایک دوسرے کے متعلق شکوک اور شبہات رفع کریں۔ انہوں نے کھُلتے ہی ایک دوسرے کو منہ سے دُم تک سُونگھا اور آپس میں متعارف ہوئے۔ سدھائے ہُوئے کُتّے تھے۔ ہمارے اشارے سمجھتے تھے۔ ہمارے اشاروں پر انہوں نے دوستی کر لی۔

ایک ہی میل اور گئے ہوں گے کہ سُورج نکل آیا۔ ہمارا ایک تازی کُتّا آہستہ سے بھونکا اور دَوڑ پڑا۔ یہ دوسرے کُتّوں کے لیے اشارہ تھا۔ یہ دیکھے بغیر کہ تازی کیا دیکھ کر بھاگا ہے تمام کُتّے اُٹھ دوڑے۔ ہم نے دیکھا، کوئی تین سو گز دُور دو خرگوش اُچھلتے کودتے جا رہے تھے۔ ہمیں بھیڑیوں کے سوا کسی اور شکار کے ساتھ دلچسپی نہیں تھی، اس لیے ہم کُتّوں کے پیچھے نہ دوڑے۔ کہیں ہانکتے گئے۔ نو اور چار تیرہ کُتّے خرگوشوں کے پیچھے کھڈ نالوں میں غائب

ہو گئے۔ بہت دُور سے ہمیں اُن کی دبی دبی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے خرگوشوں کو شاید پکڑ لیا تھا کُتّے کسی گزرے نشیب میں اُتر گئے تھے۔ کچھ دیر بعد چند ایک کُتّے اُوپر آئے۔ وہ بُری طرح لڑ رہے تھے۔

ہم دوڑے گئے۔ ایک کھڈ میں ایک خرگوش کا سر اور بال پڑے تھے۔ اسے ہمارے کُتّے اپنا حق سمجھتے تھے۔ دوسرے گاؤں کے چار کُتّوں کو وہ غیر ملکی سمجھ کر اُن پر ٹوٹ پڑے۔ ہم نے انہیں چھڑایا اور پٹوں میں زنجیریں ڈال لیں۔ سُورج اُوپر آ رہا تھا۔ ہمارے نیچے کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ کبھی ہم نشیب میں اُتر جاتے اور کبھی گھاٹی چڑھ کر اُوپر چلے جاتے۔ یہی ہمارے علاقے کا حُسن ہے۔ موسم مارچ اپریل کا تھا۔ ہم اُس جگہ سے کوئی ایک میل دُور تھے کہ تین آدمی گدھوں پر سوار ملے۔ وہ رُک گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ ہم آگے نہ جائیں۔ انہوں نے بھیڑیوں کے متعلق بڑی خوفناک باتیں سُنائیں جن سے ہمارے بعض ساتھی ڈر گئے مگر ہم نے وہ سمت نہ چھوڑی اور چلتے گئے۔ مَیں نے اور میرے چند ایک دوستوں نے وہ جگہ پہلے ایک بار دیکھی تھی۔ وہ گہرا اور وسیع نشیب تھا جسے آپ برساتی نالہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

قریب جا کر ہم رُک گئے۔ فیصلہ ہُوا کہ کھانا کھا لیا جائے۔ سب نے اپنا اپنا کھانا نکالا اور اکٹھا رکھ کر کھانے لگے۔ مَیں نے دیکھا کہ تمام شکاریوں کی شوخیاں ختم ہو چکی تھیں۔ گپ بازی میں بھی جان نہیں رہی تھی۔ میرا اپنا دل میرے قابو سے باہر ہُوا جا رہا تھا۔ اگر کوئی ہمیں بتاتا کہ آگے دو شیر ہمارے انتظار میں بیٹھے ہیں تو ہم ذرّہ بھر نہ ڈرتے۔ یہاں معاملہ جِن اور چڑیل کا تھا۔ جِنّوں وغیرہ کے متعلق ہم نے سُن رکھا تھا کہ کسی نہ کسی رُوپ میں سامنے آ جاتے ہیں۔ عموماً بکری کے بچّے کے رُوپ میں آتے ہیں۔

"یہ کون ہے"؟ ایک لڑکے کی گھبرائی ہوئی آواز سُنائی دی۔

ہم سب نے اُدھر دیکھا جدھر وہ دیکھ رہا تھا۔ ہمیں ایک آدمی کا سر اور کندھے زمین سے اُبھرے ہوئے نظر آئے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اُس نے قمیض پہن رکھی تھی جس میں سے ایک کندھا ننگا نظر آ رہا تھا۔ وہ ہم سے پچاس گز دُور تھا۔ وہاں سے راستہ اُوپر آتا تھا۔ یہی وہ نشیب تھا جس سے لوگ ڈرتے تھے اور دُور کا چکر کاٹ کر جاتے تھے۔ ہم اس آدمی کو دیکھتے رہے اور وہ ہمیں دیکھتا رہا۔ ہم سب اس طرح خاموش ہو گئے جیسے وہاں کوئی بھی نہ ہو۔ ہمارا کوئی کُتّا نہ بھونکا۔ اگر آپ شہر میں ایسے آدمی کو دیکھیں تو اُسے پاگل یا بھکاری سمجھ کر توجہ ہی نہ دیں۔ اُس ڈراؤنے ویرانے میں پاگل یا بھکاری نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم جُوں جُوں اُسے دیکھتے جاتے تھے اُس کی شکل بدلتی لگتی تھی جو شاید فریب نظر تھا۔ وہ تو بُت بن گیا تھا۔

وہ مسکرایا۔ پچاس گز دُور سے اُس کے دانت صاف دکھائی دیئے۔ ہم میں سے کسی نے آہستہ سے کہا۔ "اسے اشارہ کرو آگے آ جائے"۔

ہم میں سے کسی نے اشارہ کیا تو وہ اُوپر ہُوا۔ اب وہ کمر تک دکھائی دینے لگا۔ اُس نے ایک بازو آگے کو کیا۔ ہم یہ اشارہ نہ سمجھ سکے۔ مَیں نے بازو آگے کر کے ہاتھ ہلایا اور مَیں مُسکرایا۔ مَیں آپ کو سچ بات بتاؤں۔ میری مسکراہٹ زبردستی کی تھی۔ مَیں ڈر رہا تھا۔ وہ اور اُوپر آیا اور رُک گیا۔ اب اُس کے پاؤں بھی نظر آ رہے تھے۔ اُس نے صرف کُرتہ پہن رکھا تھا جو پھٹا ہُوا تھا۔ کُرتہ گھٹنوں تک تھا۔ اُس نے نیچے کچھ نہیں پہن رکھا تھا ہم نے سُن رکھا تھا کہ چڑیل انسان کے روپ میں دکھائی دے تو اُس کے ہاتھ اور پاؤں اُلٹے ہوتے ہیں۔ اس کے پاؤں انسانوں کی طرح سیدھے تھے۔

ہم میں سے کسی نے دلیری کی اور بلند آواز سے کہا "انسان ہو تو آگے آجاؤ۔ ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔"

اُس نے ہاتھ آگے کر کے دائیں بائیں ہلایا۔ ہم نہ سمجھ سکے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ہم نے کُتے پٹوں سے پکڑ لیے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے آیا اور ہمارے درمیان آگیا۔ وہ پراٹھوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک لڑکے نے دو پراٹھے اور مرغی کی دو تین بوٹیاں پراٹھوں پر رکھ کر اُسے دیں۔ اُس نے لپک کر بلکہ جھپٹ کر پراٹھے دونوں ہاتھوں میں لے لیے۔ ایک دو منٹ میں وہ درندوں کی طرح دونوں پراٹھے اور بوٹیاں نگل گیا۔ ہم ہر لمحہ یہ توقع لگائے رہے کہ وہ کھڑے کھڑے غائب ہو جائے گا یا روپ بدل لے گا لیکن اُس نے ہمیں چھٹی چھٹی نظروں سے دیکھا اور پہلے اُلٹے قدم پیچھے ہٹا پھر اُدھر کو جانے کی بجائے دوسری طرف چل پڑا۔ کچھ دُور جا کر اُس نے گھوم کر دیکھا۔ مُسکرایا اور چل پڑا۔

آگے جا کر وہ زمین میں دھنسنے لگا اور آہستہ آہستہ اِس طرح غائب ہو گیا جیسے زمین میں اُتر گیا ہو۔ وہاں سے راستہ نیچے کو جاتا تھا۔ ہماری پارٹی پر ایسی خاموشی طاری تھی کہ کُتوں کی کوئی ہلکی سی آواز بھی نہیں سنائی دیتی تھی۔

"پاگل ہے"۔ ہم میں سے کسی نے دبی سی آواز میں کہا۔

"اس بیابان میں کیسے آگیا ہے؟"

پھر سب بولنے لگے۔ آخر میں سب اس پر متفق ہوئے کہ پاگلوں کو کون روک سکتا ہے۔ جدھر منہ کر لیا اُسی طرف چل پڑے۔ اس اتفاق رائے سے ہم سب کو حوصلہ ملا۔ جنّوں اور چڑیلوں کے متعلق ہمیں بڑوں سے جو معلومات ملی تھیں ان کی روشنی میں ہم نے اس پاگل کا تجزیہ کیا۔ وہ انسان معلوم ہوتا تھا۔ شرشرار کے متعلق یہ یقین سے کہا جاتا تھا کہ وہ روٹی نہیں

کھاتے۔ اِسے دیکھ کر کتّے بھونکے نہیں تھے۔ میرے دل میں یہ خیال ضرور آیا کہ اگر یہ شخص پاگل نہیں تو ہم سب پاگل ہیں۔ ایک مشکوک بھیڑیئے کے پیچھے پریشان ہو رہے ہیں لیکن جوانی کے جوش نے عقل پر قبضہ کر لیا۔ ہم نے آپس میں بحث مباحثہ کر کے سکیم بنالی کہ نیچے کس طرح جائیں اور اگر یہاں واقعی کوئی بھیڑیا ہے تو اسے کس طرح باہر لائیں۔

اگر ہم کُتّوں کو ساتھ لے جاتے تو یہ خدشہ تھا کہ بھیڑیا اپنی کھوہ میں یا جہاں کہیں وہ رہتا ہے چھُپ جائے گا۔ کُتّوں کے بغیر تمام پارٹی کا نیچے جانا بھی مناسب نہیں۔ فیصلہ ہُوا کہ دو لڑکے نیچے جائیں اور چھُپ کر بھیڑیئے کو دیکھیں۔ بھیڑیا نظر آئے تو اُوپر اطلاع دیں۔ نیچے جانے والوں میں ایک مَیں تھا اور ایک دوسرے گاؤں کا جوان۔ وہ بہت دلیر تھا۔ ہم دونوں نے ایک ایک کلہاڑی لے لی۔ ہم نے پہلا قدم ہی اُٹھایا تھا کہ ہمیں بھیڑیئے کی مخصوص چیخ نما آواز سُنائی دی۔ پھر بھیڑیا بھونکا اور خاموش ہو گیا۔ ہم رُک گئے اور قہقہوں کا انتظار کرنے لگے مگر قہقہہ نہ سنائی دیا۔ دو تین منٹ بعد بھیڑیا پھر بولا۔ اب بھی قہقہہ نہ سُنائی دیا۔ اس سے ہمارا حوصلہ قائم ہو گیا۔ قہقہہ مبالغہ یا افسانہ معلوم ہونے لگا۔ بھیڑیئے کی آوازوں سے پتہ چلتا تھا کہ باہر ہے۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ بھیڑیا ایک ہے یا زیادہ۔

ہم دونوں اُس جگہ سے نیچے گئے جہاں سے پاگل اُوپر آیا تھا۔ ہمارے سامنے ایک وسیع نشیب تھا۔ اس کے دونوں طرف اُونچے عمودی ٹیلے تھے جنہیں ہم اپنی زبان میں "دُندی" کہتے ہیں۔ یہ ٹیلے بالکل دیواروں کی طرح تھے۔ ان کے اُوپر میدان تھے۔ اُوپر کھڑے ہو کر نیچے دیکھو تو ایسے لگتا تھا جیسے آپ تین منزلہ مکان کی منڈیر پر کھڑے ہوں۔ دیواروں کے نیچے چھوٹے چھوٹے ٹیلے اور ان میں درخت تھے۔ ہم نیچے جا کر

ان ٹیلوں میں چھُپ گئے اور نشیبی میدان کا جائزہ لینے لگے۔ وہاں سرکنڈوں کا بھی جنگل تھا جس میں بھیڑیئے چھُپ سکتے تھے۔ جگہ ڈراؤنی سی تھی۔ ہم ایسی جگہوں اور ان کے خدوخال کے عادی تھے۔ ہم انہی میں پیدا ہوئے تھے۔ اگر میدانی علاقوں کا کوئی رہنے والا اس جگہ آتا جہاں ہم اُتر گئے تھے تو وہ اس ڈر سے بھاگ جاتا کہ یہاں جنّ اور چڑیلیں ہوں گی۔ ان جگہوں سے مانوس ہونے کے باوجود ہم بھی اُس روز دل میں خوف سا لے کر گئے تھے۔

بہت دیر تک ہمیں بھیڑیئے کی آواز نہ سنائی دی۔ ہم نے کلہاڑیاں اُوپر کر رکھی تھیں۔ دھوپ میں ان کے پھل چمک رہے تھے۔ یہ جنّوں اور چڑیلوں کو دُور رکھنے کا انتظام تھا۔ ہم سرکنڈوں میں داخل ہو گئے۔ آہستہ آہستہ آگے گئے اور سرکنڈوں سے نکل گئے۔ یہ خطرہ تھا کہ بھیڑیئے ہم پر اچانک حملہ کر دیں گے لیکن کلہاڑیوں کی موجودگی میں ہمیں یہ ڈر نہیں تھا کہ بھیڑیئے ہمیں مار ڈالیں گے۔ ہم مقابلے کے لیے تیار تھے۔ ہم اب بالکل سامنے تھے۔ ہمارے نیچے ریتلی مٹی تھی جو برساتی پانی کی خشک گزرگاہ تھی۔ سامنے والے ٹیلے یا دیوار میں شگاف تھے۔ ہمیں بھیڑیئے کی آواز سنائی دی۔ ہم دونو بدک گئے۔ اِدھر اُدھر دیکھا بھیڑیا نظر نہ آیا۔

آواز ایک بار پھر سُنائی دی تو یہ ایسی تھی جیسے بہت دُور سے یا کسی کھوہ یا غار میں۔ ہم اِدھر اُدھر دیکھتے آگے گئے۔ جاتے جاتے ہم اس وسیع و عریض نشیب کی سامنے والی دیوار کے ساتھ جا پہنچے۔ وہاں سے ہر طرف دیکھا۔ اب کے بھیڑیا ہمارے عقب سے بھونکا۔ ہم اُچھل کر ایک طرف ہو گئے۔ معاً بعد ہمیں انسانی قہقہہ سُنائی دیا۔ دیوار کی طرف دیکھا۔ ایک شگاف ایسا تھا جیسے غار کا دہانہ ہو۔ یہ تنگ تھا۔ اس کے سامنے مٹی کی یکّی ڈھیری

تھی جس نے دہانے کو کسی حد تک ڈھانپ رکھا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ بھیڑیا تھا یا جو کچھ بھی تھا اس کھوہ کے اندر تھا۔

مَیں نے پہلی کہانیوں میں آپ کو تفصیل سے بتایا ہے کہ یہ کھوہیں کس طرح بنتی ہیں۔ دُور اُوپر سے کہیں زمین پھٹی ہوئی ہوتی ہے۔ برسات کا پانی وہاں سے اندر رجاتا ہے اور زمین کو کھاتے کھاتے کسی عمودی ٹیلے میں سے باہر نکلتا ہے۔ اسے ہم "پانی مار" کہتے ہیں۔ پانی زمین کے اندر گلیاں اور بھول بھلیاں بنا دیتا ہے۔ کئی برسوں کے بعد یہ گلیاں وسیع اور اُونچی ہو جاتی ہیں۔ ان کے اندر گیدڑ اور بھیڑیئے رہتے ہیں۔ یہ دہانہ "پانی مار" کا معلوم ہوتا تھا۔

ہم نے بھیڑیئے کی آواز اور قہقہے سُنے تو ہمارے دم خشک ہو گئے مگر اب ہم پھنس گئے تھے۔ بھاگنا بھی خطرناک تھا۔ اگر یہ جن بھوت تھے تو ہمیں بھاگنے کہاں دیتے تھے۔ مَیں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ بھائی اب جو کچھ ہے اس کا مقابلہ کرنا ہے۔ وہ مقابلے کے لیے تیار تھا۔

"یہ دیکھو" اُس نے زمین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

مَیں نے دیکھا۔ وہ کسی انسان کے ننگے پاؤں کے نشان تھے اور یہ نشان تازہ تھے یہ باہر سے آئے تھے۔ کھوہ کے دہانے کے سامنے جو ٹیکری سی بنی ہوئی تھی اُس پر چلے گئے تھے۔ مجھے بھیڑیئے کے یا کسی بھی جانور کے پنجوں کا کوئی ایک بھی نشان نظر نہ آیا۔ ہم احمد یار خان نہیں تھے۔ کھُروں کو اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے۔ ہم یہی جانتے تھے کہ اندر بھیڑیا بول رہا ہے اور باہر انسانی پاؤں کے نشان ہیں۔ تو کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ اندر بھیڑیا بھی ہے اور انسان بھی؟ اگر یہ واقعی انسان ہے تو اس کے قہقہے نہیں بلکہ اُس

کی چیخیں سُنائی دیتیں۔ اُس دَور میں مَیں نے ابھی یہ بھی نہیں سُنا تھا کہ بھیڑیوں نے کسی انسان کے بچّے کو پالا ہے اور اس انسان میں بھیڑیوں کی خصلتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ مَیں نے ایسے واقعات اُس وقت پڑھے تھے جب مَیں بڑھاپے میں داخل ہو چکا تھا۔

جو حقیقت مجھے ڈرا رہی تھی وہ یہ تھی کہ باہر بھیڑیئے کے پنجوں کا کوئی نشان نہیں تھا۔ مَیں نے اپنے دوست سے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھیڑیا اِدھر سے اندر باہر نہیں آتا جاتا اُوپر جہاں اس "پانی مار" کا دہانہ ہے وہاں سے باہر نکلتا ہوگا۔ مگر یہ انسان کون تھا؟ میرا ذہن خالی ہو گیا۔ میرا ساتھی مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جن میں مجھے وہ دلیری نظر نہیں آ رہی تھی جو اس وسیع نشیب میں اُترنے سے پہلے تھی۔ مجھے یقین ہے کہ رنگ میرا بھی اُڑا ہُوا تھا۔

میرے اِس خوبرو اور نوجوان دوست نے چونک کر اُوپر دیکھا۔ اُس کی نظریں میرے اُوپر سے دُور پیچھے کچھ دیکھ رہی تھیں۔ اُس کا منہ ذرا سا کھُل گیا تھا۔ مجھے اس کی سرگوشی سُنائی دی۔ "وہ کون ہے؟"

مَیں نے گھُوم کر دیکھا۔ نشیب کی عمودی دیوار جیسے میرے سر پر کھڑی تھی۔ اُوپر سے ایک جگہ سے دیوار کٹی ہُوئی اور ڈھلان سی بنی ہُوئی تھی۔ وہاں مجھے ایک عورت کھڑی نظر آئی۔ چپ چاپ، بے حس۔ ہمیں دیکھ رہی تھی۔ لباس سے وہ خانہ بدوش لگتی تھی۔ اس نے گھاگھرا اور اُوپر لمبی فراک نما قمیض پہن رکھی تھی۔ سر پر میلی کچیلی چادر تھی۔ وہ بوڑھی تھی۔ آج کل آپ کو بڑے شہروں کے مضافات میں ایسے خانہ بدوش نظر آتے ہوں گے جو اپنے بنائے ہُوئے چھوٹے چھوٹے خیموں میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ اُن خانہ بدوشوں سے بہت مختلف ہیں جو میری جوانی کے دَور میں شہروں یا گاؤں سے ذرا دُور ویرانوں میں ڈیرے

ڈال لیتے، ڈیڑھ دو مہینے وہاں رہتے اور کہیں اور چلے جاتے تھے۔ ان کا اپنا معاشرہ اور اپنی دنیا ہوتی تھی۔ ان کی خوراک اور رہنے سہنے کے طور طریقے انوکھے اور پُراسرار ہوتے تھے۔

اُن کے متعلق عجیب و غریب اور ڈراؤنی سی باتیں مشہور تھیں، جن میں سے ایک یہ تھی کہ یہ بچوں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں اور اُنہیں الٹا لٹکا کر نیچے آگ جلاتے ہیں۔ تپش سے بچے کے سر سے مومیائی ٹپکتی ہے۔ معلوم نہیں مومیائی کوئی چیز ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ لوگ اسے آبِ حیات کا درجہ دیتے تھے اور اس کی حیرت انگیز کرامات بیان کرتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مَیں نے نہ خود مومیائی دیکھی ہے نہ کوئی ایسا آدمی دیکھا ہے جس نے کبھی مومیائی دیکھی ہو۔ ان خانہ بدوشوں کی عورتیں تنومند، جفاکش اور خوبصورت ہُوا کرتی تھیں۔ آبادیوں میں موٹی سوئیاں، سُرمہ، چھریاں چاقو وغیرہ بیچنے آیا کرتی تھیں۔ ان عورتوں میں خوبی یہ تھی کہ کسی لالچ میں نہیں آتی تھیں۔ شہروں کی دولت کی انہیں پروا نہیں تھی۔ البتہ موقع ملے تو چوری کر لیتی تھیں۔ اگر خانہ بدوش کسی گاؤں کے قریب ڈیرے ڈالیں تو گاؤں کے لوگ اپنے بچوں کو گاؤں سے باہر نہیں جانے دیتے تھے۔ یہ لوگ گیدڑ اور بھیڑیے کا گوشت کھاتے تھے۔ سانڈے اور نیولے بھی پکا کر کھا لیتے تھے۔ ان کا لباس اور ان کی شکل و صورت ہم اور آپ سے جُدا ہی ہوتی تھی۔ ان کے پاس خونخوار کُتے ہوتے تھے۔

وہ بوڑھی عورت جو اُوپر بُت کی طرح کھڑی ہمیں دیکھ رہی تھی، بلاشک و شبہ خانہ بدوش تھی مگر جس انداز سے کھڑی ہمیں دیکھ رہی تھی وہ ڈراؤنا تھا۔ وہ بدروح معلوم ہوتی تھی۔ ڈر کی وجہ یہ تھی کہ ماحول ڈراؤنا تھا اور ہم نے بھیڑیے کی آواز کے ساتھ کھوہ میں انسانی قہقہہ سُنا تھا۔ یہ عورت بھی انہی اسرار کا ایک حصہ لگتی تھی۔ مجھے اپنی ماں یاد آئی

جس نے گھر سے نکلتے مجھے کہا تھا کہ تُو اب بچہ نہیں باپ ہے۔ مَیں نے ماں کی بات سُنی اور ہنسی میں ٹال کر مَیں گھر سے نکل آیا تھا۔ اب اس مصیبت میں پھنس کر مجھے ماں کی بات یاد آئی تو اپنا ایک ماہ کا بچہ بھی یاد آگیا۔ مجھے کچھ ایسا نظر آنے لگا جیسے میرا بچہ مجھے پہچانے بغیر یتیم ہو جائے گا۔ میرے دل میں درد سا اُٹھا اور مَیں نے اپنے آپ میں بزدلی سی محسوس کی۔

بزدل باپ اپنے بچوں کی خاطر دلیر بھی ہو جایا کرتا ہے اور بعض حالات میں بڑا دلیر باپ بچوں کی خاطر بزدل بن جایا کرتا ہے کیونکہ اپنے بچوں کا مفاد اسے بزدلی میں نظر آتا ہے۔ یہی کیفیت میری ہو گئی۔ مَیں موت سے کبھی نہیں ڈرا تھا مگر خدا نے بچہ عطا کیا تو مَیں نے ہتھیار ڈالنے کی سوچ لی۔ مَیں نے اس عورت سے نظریں ہٹا لیں لیکن یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُس نے مجھے اپنے جادو میں گرفتار کر لیا ہے۔ مَیں نے کوشش کی کہ اس کی طرف نہ دیکھوں مگر میری گردن خود ہی پیچھے کو مڑ گئی اور نظریں اُوپر اُٹھ گئیں۔ وہ بُت کی طرح کھڑی رہی۔ بھیڑیئے کی آواز ایک بار پھر آئی لیکن اب کے قہقہہ نہ سنائی دیا۔

"سب کو بلا لیتے ہیں" ـــــ میرے ساتھی نے کہا ـــــ "تم جا کر انہیں بلا لاؤ"

"ہمارا یہاں اکیلے رہنا ٹھیک نہیں" ـــــ مَیں نے کہا۔

مَیں نے اُدھر دیکھا جدھر سے ہم نیچے اُترے تھے۔ اُوپر میرے دو دوست کھڑے تھے۔ وہ ہمارے لیے پریشان تھے۔ مَیں اور میرا ساتھی یہ فیصلہ کر کے اُدھر چل پڑے ـــــ "کتّوں کو لے آتے ہیں۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا" ـــــ میرے کم عقل ذہن نے یہ فیصلہ منظور کر لیا۔ ہم اُس طرف دوڑ پڑے اور سامنے جو دو لڑکے کھڑے تھے انہیں ہاتھوں کے اشاروں سے بلانے لگے۔ وہ پیچھے کو گئے۔ ہم سرکنڈوں تک پہنچے تو ہمیں اپنے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کُتّے اور ہمارے

دوست آ رہے تھے۔ مَیں نے گھوم کر دیکھا۔ مجھے عورت نظر آئی۔ مجھے خوشی سی ہُوئی کہ وہ کوئی خانہ بدوش تھی اور ہمیں دلچسپی سے دیکھ کر چلی گئی ہے۔

تیز کُتّے اور ہمارے تمام ساتھی دوڑتے ہوئے نیچے اُتر آئے۔ سرکنڈوں میں سے گزرتے ہم تک پہنچے۔ ہم نے اُنہیں بتایا کہ جو کچھ ہے وہ اس کھوہ میں ہے۔ ہم نے انہیں بھیڑیئے کی آوازوں اور قہقہوں کے متعلق بتایا اور کہا کہ ہمت ہے تو کتّوں کو کھوہ میں چھوڑتے ہیں۔ انہیں بھیڑیئے کی مُشک مل گئی تو مسئلہ حل ہو جائے گا مگر مُشک نہ ہوا تو یہ معاملہ بہت ہی خطرناک ہے۔ تقریباً سب نے کہا کہ واپس نہیں جائیں گے۔ اگر یہ جواب ہوتے تو اب تک ہمیں نقصان پہنچا چکے ہوتے۔ اچانک ہی ہم سب دلیر ہو گئے۔ کتّوں کو ہم نے کھولا نہیں۔ زنجیروں میں آگے بڑھے گئے۔

سامنے والی دیوار کی طرف سے ہم نے دیکھا کہ خانہ بدوش عورت دوڑی آ رہی تھی اُس کا رخ اس کھوہ کی طرف تھا جس کے اندر سے بھیڑیئے کی آوازیں اور قہقہے سُنائی دیئے تھے۔ ہم نے اپنی رفتار کم کر دی۔ مَیں جان گیا کہ یہ عورت اُوپر سے کس طرف سے نیچے آئی ہے کسی جگہ ڈھلان تھی جو کھوہ سے دُور تھی۔ وہ اُدھر سے آئی تھی۔ وہ اس چھوٹی سی ٹیکری پر چڑھ گئی جو کھوہ کے سامنے تھی۔ اس کی پیٹھ کھوہ کی طرف اور منہ ہماری طرف تھا۔ ہم قریب گئے تو اس نے دونوں بازو پھیلا دیئے۔

"کُتّے نہ چھوڑنا" ـــــ اس نے چلّا کر کہا ـــــ "اندر میرا بیٹا ہے۔ خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ" ـــــ اس کی آواز رندھیا گئی بلکہ وہ اس طرح بولنے لگی جیسے بَین کر رہی ہو۔ مجھے اس کے تمام الفاظ یاد نہیں رہے۔ وہ ہمیں کہہ رہی تھی کہ ہم کھوہ کے قریب کُتّے نہ لائیں۔

ہم تمام کے تمام نوجوان رُک گئے۔ ہم نے یہ بھی سُن رکھا تھا کہ جنات انسانوں کو عجیب اور دلچسپ دھوکے دیا کرتے ہیں۔ اس عورت کو بھی ہم دھوکہ سمجھنے لگے۔ اگر ہم میں سے کوئی ایک لڑکا ڈر کر بھاگ اٹھتا تو ہم سب بھاگ اُٹھتے۔ یہ جن تھے جو ہمارے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہے تھے... ہم نے دیکھا کہ عورت کے عقب سے وہی پاگل جسے ہم نے پراٹھے کھلائے تھے کھوہ کے دہانے میں یوں سامنے آیا کہ پہلے اس کا سر لہرایا پھر وہ اُوپر اُٹھنے لگا۔ دہانے سے نکل کر وہ ٹیکری پر چڑھا تھا۔ عورت اسے نہ دیکھ سکی۔ اس کی توجہ ہماری طرف تھی۔ پاگل بھیڑیئے کی طرح غرّایا۔ اُس نے عورت کو دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا اور بھیڑیئے اور کُتّے کی طرح منہ اُس کے کندھے پر ڈال دیا۔ اس نے دانت گاڑ دیئے تھے۔ دہانے سے نمودار ہونے اور عورت کے کندھے پر دانت گاڑنے تک دو یا تین سیکنڈ لگے ہوں گے۔

عورت نے بڑی زور سے چیخ ماری۔ پاگل اسے بھنبھوڑ رہا تھا۔ ہم تمام خطرے بھُول گئے اور عورت کو چھڑانے کے لیے دوڑے۔ پاگل کے دانت اُس کے گوشت میں اُتر گئے تھے۔ وہ چیخ رہی تھی۔ سخت تکلیف میں تھی لیکن ہمیں کُتّوں کے ساتھ اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ چلّانے لگی۔ "کُتّوں کو پیچھے رکھو۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ اسے نہ مارنا۔ یہ پاگل ہے۔ کُتّے دور رکھو۔"

ہم قریب پہنچے تو پاگل نے عورت کو چھوڑ کر قہقہہ لگایا۔ یہ وہی قہقہہ تھا جو ہم نے کئی بار سُنا تھا۔ وہ پیچھے کو گیا اور کھوہ میں غائب ہو گیا۔ اندر سے بھیڑیئے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ پاگل کی آوازیں تھیں۔ عورت ڈھیری نما ٹیکری سے اُتر آئی۔ اُس نے ہاتھ اپنے کندھے پر رکھا ہُوا تھا۔ وہ بیٹھ گئی اور ہچکیاں لے لے کے رونے لگی۔

"تم انسان ہو؟" ــــ میرے دوست راجہ شاہباز خان نے اپنی کلہاڑی کا چمکتا ہوا پھل اُس کے منہ کے قریب کر کے پُوچھا۔

"تو اور کیا ہُوں؟" ــــ عورت نے غصیلی آواز میں کہا ــــ "مَیں ماں ہوں۔ اس پاگل کی ماں ہُوں۔"

اس کے کندھے سے کُرتہ خون سے لال ہو گیا تھا۔ ہم اُسے وہاں سے اٹھا لائے۔ وہ ہمارے ساتھ چلی ہی تھی کہ دو خانہ بدوش مرد کسی طرف سے دوڑتے آئے۔ ان لوگوں کی زبان بھی عجیب تھی۔ کوئی لفظ پنجابی کا تھا، کوئی اُردو کا اور باقی الفاظ ان کی اپنی زبان کے تھے۔ یہ دونو آدمی اس کے ساتھ غصّے سے بول رہے تھے اور وہ "میرا بیٹا، میرا بیٹا" کہے جا رہی تھی۔ انہوں نے اس کا زخمی کندھا دیکھا تو ہم نے انہیں بتایا کہ یہ کس طرح زخمی ہُوئی ہے۔

"اگر تم اسے چھڑا نہ لیتے تو وہ اس کا خون پی جاتا" ــــ ایک خانہ بدوش نے کہا ــــ "اس کا دماغ تو خدا نے واپس لے لیا ہے۔ اُسے معلوم ہی نہیں کہ یہ اس کی ماں ہے۔"

ہم ان کے ساتھ ہی اس جگہ سے اُوپر آ گئے اور اُسی درخت کے نیچے بیٹھ گئے جہاں پاگل ہمارے پاس آیا اور ہم نے اسے پراٹھے دیئے تھے۔ ان خانہ بدوشوں نے ہمیں بتایا کہ انہوں نے کہاں ڈیرے ڈالے ہُوئے ہیں۔ وہ جگہ ہمارے گاؤں سے کم و بیش تین میل دُور تھی۔ اس پاگل کے متعلق انہوں نے بتایا کہ ان کا ساتھی ہے۔ اس کی عمر پچیس چھبیس سال تھی۔ ایک روز اس نے اپنے قبیلے کی ایک خانہ بدوش جوان لڑکی کو بازوؤں میں جکڑ لیا اور دانت اس کے کندھے میں گاڑ دیئے۔ لڑکی چیخنے لگی۔ ہم سب چھڑانے کے لیے دوڑے تو اس نے لڑکی کو چھوڑ کر ایک آدمی کے بازو میں دانت گاڑ دیئے۔ ہم نے اسے مارا پیٹا اور یہ بھاگ گیا۔ اُس وقت یہ خانہ بدوش کسی اور جگہ تھے جو زیادہ دُور نہیں تھی۔ اس واقعہ کے بعد یہ

پاگل انہیں خیمہ گاہ سے دُور دُور منڈلاتا نظر آیا۔ ان لوگوں نے بتایا کہ یہ جب ٹھیک حالت میں ہُوا کرتا تھا تو شغل اور مذاق کے طور پر بھیڑیے کی طرح بولا کرتا تھا۔ پاگل پن کی حالت میں ماں نے اسے دیکھ لیا اور دوڑی گئی۔ اس نے ماں کو پکڑ لیا اور اس کی ایک ٹانگ میں دانت گاڑ دیئے۔ آدمی چھڑانے کو دوڑے تو یہ بھاگ گیا۔

ہم نے ان سے پوچھا کہ اس کے اچانک پاگل ہو جانے کی وجہ کیا ہے۔ اسے باؤلے کتّے نے کاٹا ہوگا یا اس نے مُردار کا گوشت کھا لیا ہوگا۔ یہ لوگ رینگنے اور چلنے والی ہر چیز کو کھا جاتے تھے۔ اس نے کوئی ایسا جانور کھا لیا ہوگا جس میں زہر کا اثر ہوگا۔ ان لوگوں کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ انہیں صرف یہ معلوم تھا کہ اسے باؤلے کتے نے نہیں کاٹا۔ ہم ماہرینِ نفسیات نہیں تھے۔ علمِ نفسیات کا کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔ ڈاکٹری سے بھی ناواقف تھے۔ ہمارا ڈاکٹر گاؤں کا ایک سیانا تھا۔ اصل ڈاکٹر شہر کے سرکاری ہسپتال میں تھا جس کے متعلق ہم صرف یہ جانتے تھے کہ جب مریض مرنے والا ہوتا ہے تو اس کے پاس لے جاتے ہیں یا وہ مقتولوں کی لاشوں کی چیر پھاڑ کر کے پوسٹ مارٹم کرتا ہے۔

آج کل دیہات میں بھی یہ رواج ہو گیا ہے کہ کسی کو کوئی ذہنی عارضہ لاحق ہو جائے اور وہ پاگلوں کی سی حرکتیں کرے تو اسے شہر میں کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاتے اور علاج کراتے ہیں۔ ہماری جوانی کے دَور میں ذہنی امراض نہ ہونے کے برابر تھے۔ کبھی کبھار سُنتے تھے کہ کوئی پاگل ہو گیا ہے۔ زیادہ تر کیس باؤلے کتے کے کاٹنے سے ہوتے تھے۔ آدمی پاگل ہو کر گھر والوں کو کاٹتا تھا۔ ایسے آدمی کو رسوں اور زنجیروں میں باندھ دیتے اور گھر والے دِل میں دُعا کرتے تھے کہ یہ جلدی مر جائے۔ اُس زمانے میں باؤلے پن کے علاج کے انجکشن نہیں تھے اور کوئی مؤثر دوائی بھی نہیں تھی۔ پاگل کا انجام بہت بُرا

ہوتا تھا اور اگر کوئی کسی اور وجہ سے پاگل ہو جاتے تو سب سے پہلے اسے پیروں فقیروں اور عاملوں کے پاس لے جایا، تعویذ دیئے جاتے اور ٹونے ٹوٹکے کیے جاتے تھے۔ عام طور پر یہ کسی جن کا قبضہ سمجھا جاتا تھا۔ مرض جڑ پکڑ لیتا اور پاگل گھر اور گاؤں کے لیے مصیبت بن جاتا تھا۔

یہ لوگ توہم سے زیادہ پسماندہ اور توہم پرست تھے۔ ان خانہ بدوشوں کے رسم و رواج نرالے اور پُراسرار تھے۔ ایک خانہ بدوش نے اس پاگل کے متعلق باتیں کرتے ہوئے کہا۔

"اِس نے اپنی ماں کو دو بار کاٹا ہے، یہ بھی پاگل ہو جائے گی۔"

"ماں پاگل نہیں ہو سکتی" ـــــ ماں چلّانے لگی ـــــ "بچّے ماں کی بوٹی بوٹی ادھیڑ لے ماں پاگل نہیں ہو سکتی۔ میرے بچّے کو واپس لے چلو یا مجھے اس کے پاس چھوڑ جاؤ۔"

"اس نے ہمیں مصیبت میں ڈال رکھا ہے" ـــــ ایک خانہ بدوش نے کہا ـــــ "اُس کے پاگل بیٹے نے یہاں اس کھوہ میں ڈیرہ جما لیا ہے۔ اسے (ماں کو) جب موقع ملتا ہے یہاں آجاتی ہے اور دُور سے اپنے بیٹے کو دیکھتی رہتی ہے۔ ہم تین چار بار اسے یہاں سے گھسیٹ کر لے گئے ہیں۔ آج صبح ہم جاگے تو یہ غائب تھی۔ ہم اِدھر کو دوڑے اور یہ تماشہ دیکھا"

اس شخص نے پاگل پن کی کچھ وجوہات بیان کیں جن میں ایک یہ تھی کہ اس نے اپنے کسی بڑے کی رُوح کو کسی نازیبا حرکت سے ناراض کیا ہے۔ اُس نے کہا ـــــ "ہم جہاں جاتے ہیں ہمارے بڑوں کی روحیں ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ ایسے لوگوں کی روحیں ہوتی ہیں جو شیطان ہیں۔ ہمارے بڑے کسی پر ناراض ہو جائیں تو اس میں ایک شیطان رُوح داخل کر دیتے ہیں۔ ایسے آدمی پر کسی پیر اور مُرشد کے تعویذ کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ درندوں کی طرح رہتا ہے اور کچھ عرصے بعد بھیڑیا، گیدڑ یا کوئی اور درندہ بن جاتا ہے۔"

ہم ان لوگوں کی باتیں سچ مانتے گئے۔ ایسی سنسنی خیز باتیں اچھی لگا کرتی تھیں۔ ان کی باتوں کے دوران ہمیں بھیڑیئے کی آواز اور قہقہے تین چار بار سنائی دیئے۔ میں نے یہ بالکل نہیں سوچا کہ یہ پاگل ہمارے پاس آیا تھا تو اس نے کسی کو کاٹنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے دور سے ہاتھوں کے جو اشارے کیے تھے ان کا مطلب یہ تھا کہ کتوں کو ایک طرف کر دو۔ اس نے ہمارے پراٹھوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا اور اس نے پراٹھے کھائے بھی تھے، اسے بھوک کا احساس تھا۔ پاگل کو بھوک کا احساس کم ہی ہوتا ہے۔ ہمارے علاقے میں بیری کے درخت اور بیری کی جھاڑیاں بہت ہوتی ہیں۔ وہ شاید ان پر زندہ رہا ہوگا۔

وہ دونوں خانہ بدوش پاگل کی ماں کو اپنے ساتھ لے گئے اور ہم اپنے گاؤں کو چل پڑے۔ ہم خوش بھی تھے مضطرب بھی۔ خوشی یہ تھی کہ ہم نے بھیڑیئے کی آوازوں اور انسانی قہقہوں کا راز پا لیا تھا اور اضطراب یہ تھا کہ ایک انسان پاگل ہو گیا تھا جس کی قسمت میں نہ جانے کیسی موت لکھی تھی۔ اس کی ماں کا خیال آتا تو ہمارے جذبات ہل جاتے تھے۔ ماں کہتی تھی کہ اس کا بچہ اس کے جسم کی بوٹی بوٹی کھا جائے اور ٹھیک ہو جائے۔

ہم اپنے گاؤں میں داخل ہوئے تو اعلان کرنے لگے کہ وہاں کوئی بھیڑیا نہیں ہے۔ گاؤں کے لوگ جمع ہو گئے۔ ہم نے انہیں سارا واقعہ سنایا اور کہا کہ دوسرے گاؤں کے لوگ یہاں سے گزریں تو انہیں بھی بتاتے رہیں کہ یہ بھیڑیا نہیں ایک پاگل ہے۔

"کسی کو نہ بتانا" ـــــ ہمارے ایک بزرگ نے کہا ـــــ "لوگوں نے اسے بھیڑیا سمجھ کر راستہ چھوڑ دیا ہے۔ جن لوگوں نے قہقہے سُنے ہیں وہ اسے شرشار سمجھتے ہیں۔ اگر ہم نے لوگوں کو یہ بتا دیا کہ وہ پاگل خانہ بدوش ہے تو کوئی اسے قتل کر دے گا۔ انسان پاگل

ہو، دوسروں کو کاٹتا پھرے تو بھی اسے مارنا قتل ہے اور یہ گناہ ہے۔ اس بیچارے کو اپنی موت مرنے دو۔ یہ خون اپنے سر نہ لو۔ تم جانتے ہو کہ باؤلے کتے کے کاٹے ہوئے آدمی کو گھر والے اپنے ہاتھوں چوری چھپے زہر دے دیتے ہیں۔ ایک لاوارث پاگل کو تو لوگ فوراً قتل کر دیں گے۔"

تین چار روز بعد تین خانہ بدوش عورتیں ہمارے گاؤں میں اپنی بنائی ہوئی اشیا بیچنے آئیں۔ میں نے اپنے تین چار دوستوں کے ساتھ انہیں روک لیا۔ خانہ بدوش عورتیں قریبی گاؤں سے لسی مانگنے بھی آیا کرتی تھیں ہم نے انہیں کہا کہ لسی کی ڈولی دیں گے ہمیں اس پاگل کے متعلق کچھ بتائیں۔ انہوں نے وہی قصہ سنایا جو ان کے دو آدمی سنا چکے تھے۔ ہم نے اور زیادہ کریدا تو انہوں نے بتایا کہ اس کی منگیتر بہت خوبصورت تھی۔ یہ لڑکی اسے پسند نہیں کرتی تھی۔ یہ آدمی اسے بہت ہی پسند کرتا تھا۔ لڑکی کی دوستی ایک اور خانہ بدوش کے ساتھ تھی جو کسی دوسرے قبیلے کا تھا۔ اس لڑکی نے اس آدمی کو ایک بار یہاں تک کہہ دیا کہ تم مجھے بہت برے لگتے ہو۔ میری شادی تمہارے ساتھ ہو گئی تو میں بھاگ جاؤں گی۔

اس لڑکی نے یہی کیا۔ وہ شادی سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ بزرگوں کے فیصلے ہر کسی کو ماننے پڑتے ہیں۔ شادی ہو گئی۔ لڑکی کو دلہن بنا کر رات کو الگ خیمے میں بٹھا دیا گیا۔ ناچ گانا ہوتا رہا۔ دلہا خیمے میں گیا تو لڑکی وہاں نہیں تھی۔ اس کے نکل جانے کے بہت دیر بعد اس کی گمشدگی کا پتہ چلا تھا اس لیے وہ دور نکل گئی تھی۔ ہمارے آدمی اس قبیلے کی تلاش میں گئے جس میں لڑکی کے پسند کا آدمی تھا۔ ان لوگوں نے کہا کہ لڑکی ان کے پاس نہیں آئی۔ اب پتہ چلا ہے کہ لڑکی انہی کے پاس ہے مگر وہ لوگ معلوم نہیں کہاں چلے گئے ہیں۔

دوسرے ہی دن اس آدمی نے ایک لڑکی کو کاٹ لیا، پھر ایک آدمی کو کاٹا اور بھاگ

گیا.... یہ معمّہ ہمارے جناب میم۔ الف صاحب حل کر سکتے ہیں کہ اس قسم کے صدمے سے انسان پاگل ہو سکتا ہے یا نہیں اور یہ کیسا پاگل پن ہوتا ہے۔ مَیں آپ کو صرف واقعات سُنا رہا ہوں .... بہت دِن گزر گئے۔ ہم نے کئی بار سوچا کہ پاگل کو دیکھنے جائیں۔ اس دوران دو تین آدمیوں نے ہمارے گاؤں کے قریب سے گزرتے بتایا تھا کہ فلاں جگہ کوئی شرشرار ہے جو بھیڑیئے کی طرح بھونکتا اور انسانوں کی طرح ہنستا ہے۔ ان اطلاعوں سے ہمیں پتہ چلتا رہا کہ پاگل ابھی وہیں ہے۔

چند روز بعد وہی تین عورتیں جو ہمیں پاگل کی دلہن کا قصّہ سُنا گئی تھیں ایک بار پھر ہمیں مِل گئیں۔ مَیں اپنے دو دوستوں کے ساتھ کھیتوں میں تھا۔ مَیں نے پچھلی ملاقات میں انہیں مٹی کی اپنی ڈولی میں بستی دی تھی اور ان سے دو چار چیزیں بلا ضرورت لے لی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ پاگل کو واپس لے آئے ہیں، اور وہ ٹھیک ہے۔ یہ بڑی عجیب خبر تھی۔ اِن عورتوں نے جو واقعہ سنایا وہ اس طرح تھا کہ جس روز یہ تینوں عورتیں ہمیں گاؤں میں مِلی تھیں، اس سے دو تین روز بعد پاگل کی ماں غائب ہو گئی۔ سب جان گئے کہ اپنے بیٹے کو دیکھنے چلی گئی ہے۔ آدمی اس کے پیچھے گئے اور اُسی جگہ پہنچے جہاں ہم نے پاگل کو دیکھا تھا۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ ماں اپنے بیٹے کو اُٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بیٹے کی یہ حالت تھی کہ سر سے پاؤں تک سُوجا ہُوا تھا۔ چہرہ اتنا زیادہ سُوج گیا تھا کہ آنکھیں نظر نہیں آتی تھیں۔ وہ بے ہوش پڑا تھا۔ مرا ہُوا نہیں تھا۔ ماں اسے اُٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اِن آدمیوں نے اِس کی حالت دیکھی تو وہ مطمئن ہوئے کہ یہ مر رہا ہے۔ اس کی ماں کی چیخ و پکار اور فریادوں سے متاثر ہو کر یہ آدمی پاگل کو اُٹھا لائے۔ ماں کہتی تھی کہ یہ مر رہا ہے

اور وہ اپنے بیٹے کو عزت اور پیار سے دنیا سے رخصت کرے گی۔ خانہ بدوشوں نے بھی اسے اسی اُمید پر اُٹھا لیا تھا کہ تھوڑی دیر بعد مر جائے گا اس لیے کوئی خطرہ نہیں، اس کی ماں کو یہ اطمینان تو مل جائے گا کہ اس کا بیٹا جنگل بیابان میں نہیں مرا اور اسے گیدڑ اور گدھ نہیں کھا گئے۔ ان عورتوں نے بتایا کہ جب اسے خیمہ گاہ میں لایا گیا تو قبیلے کے سب سے زیادہ بوڑھے آدمی نے اسے دیکھا۔ پاگل کے منہ پر شہد لتھڑا ہُوا تھا جس میں چیونٹیاں چپکی ہوئی تھیں۔ ہاتھوں کے ساتھ بھی شہد تھا اور اس کے کُرتے پر بھی جگہ جگہ شہد لگا ہُوا تھا۔

اس بوڑھے نے بتایا کہ یہ پاگل تھا۔ اسے کسی درخت پر شہد کا چھتہ نظر آ گیا ہوگا اور یہ شہد کی مکھیوں سے بے پروا اُوپر چلا گیا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شہد کا چھتہ کھوہ کے اندر ہی ہو۔ بہرحال یہ ثبوت صاف نظر آ رہا تھا کہ اس نے پاگل پن میں چھتے پر جا ہاتھ ڈالا اور شہد کھانے کی کوشش کی۔ مکھیاں اس پر ٹوٹ پڑیں اور جسم پر کوئی جگہ نہ چھوڑی جہاں انہوں نے ڈنک نہ مارا ہو۔۔۔ بوڑھے نے اپنے کسی پرانے تجربے کے مطابق پاگل کے منہ میں کوئی دوائی ڈالنی شروع کر دی اور سارے جسم پر کچھ مل دیا۔ یہ لوگ جڑی بوٹیوں کے تو ماہر ہُوا کرتے تھے۔ بوڑھے نے تمام رات پاگل کے ساتھ جاگتے گزاری۔ دوسرے دن پاگل زندہ تھا اور سوجن میں کمی تھی۔ بُوڑھا دوائی دیتا رہا۔ چار پانچ روز بعد سوجن آدھ سے بھی کم ہو گئی اور ڈنک کے نشان نظر آنے لگے۔ ماتا کی طرح جسم پر ہر جگہ لال لال نشان تھے۔ پاگل ہوش میں آ چکا تھا۔ بیٹھتا اور کھڑا ہوتا تھا۔ دو تین روز بعد اس نے سب سے پہلے ماں کو پہچانا اور اس کے آنسو نکل آئے۔ پھر اُس نے ہر کسی کو پہچان لیا۔ ان عورتوں نے بتایا کہ اب وہ ٹھیک ہے، کسی کو کچھ نہیں کہتا۔ البتہ بولتا نہیں۔ باتیں سمجھتا ہے مگر جواب نہیں دیتا۔

ہم اُسی روز ان خانہ بدوشوں کی خیمہ گاہ میں گئے۔ باہر کے لوگوں کو وہ اندر نہیں جانے دیتے تھے۔ پاگل کی ماں نے ہمیں پہچان لیا۔ وہ خوشی سے دوڑی آئی اور ہمیں بتایا کہ اس کا بیٹا ٹھیک ہوگیا ہے۔ ماں نے اسے بلا لیا۔ ہم نے اسے پہچان لیا۔ ہم سب نے اُس کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ وہ مُسکرا رہا تھا۔

"یار ذرا بھیڑیئے کی طرح بولو" ـــــ میرے ایک شرارتی دوست نے کہا۔

وہ اور زیادہ مسکرایا۔ ہم نے اس سے پُوچھا کہ اسے کیا ہُوا تھا۔ اس نے کندھے سکیڑے اور گردن کو خم دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے کچھ پتہ نہیں۔ مَیں نے پوچھا کہ اسے یاد ہے کہ ہم نے اسے پراٹھے کھلائے تھے؟ اُس نے سر ہلایا۔ اُسے یاد نہیں تھا۔ اُدھر سے وہ بُوڑھا آگیا۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ اس نے اسے کس طرح ٹھیک کیا ہے؟ بوڑھے نے ماں اور بیٹے کو وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ وہ چلے گئے تو بُوڑھے نے بتایا کہ اسے دلہن کے صدمے نے پاگل کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس کے اندر کوئی بدرُوح داخل ہو گئی ہے۔ اسے جب سوجی ہُوئی لاش کی حالت میں لائے تو بوڑھے نے تجربے کے طور پر اسے ایک دوائی دی اور جسم پر کچھ ملا۔ بوڑھے نے ہمارے اصرار کے باوجود ہمیں نہ بتایا کہ دوائی کون سی جڑی بوٹیوں کی تھی اور جسم پر کیا مَلا تھا۔ یہ ان لوگوں کا راز تھا۔ بوڑھے نے رات بھر جاگ کر مشاہدہ کیا کہ دوائی کا کیا اثر ہو رہا ہے۔ اثر ہو رہا تھا۔

بوڑھے نے اپنا تجربہ جاری رکھا اور کامیاب ہوگیا۔ اس نے کہا۔ "مَیں نے جو دوائی دی تھی وہ شہد کی مکھیوں کے کاٹنے کا علاج تھا لیکن جب یہ ہوش میں آیا تو مَیں نے دیکھا کہ اس کا پاگل پن ختم ہوگیا ہے۔ مجھے اپنے باپ کی ایک بات یاد آئی۔ اُس نے کہا تھا کہ جس طرح شہد میں قدرت نے سوئیاں ڈال رکھی ہیں، اسی طرح شہد کی مکھی کے زہر میں بھی ایک

کرامات ہے۔ مَیں نے اس آدمی کو مکھی کے زہر کا اثر زائل کرنے والی دوائی دینی بند کر دی۔ میرے تجربے نے مجھے بتایا کہ اس کا پاگل پن شہد کی مکھیوں کے زہر کی وجہ سے ٹھیک ہو رہا ہے۔ مَیں نے دوائی بدل دی اور اسے طاقت کی دوائی دینے لگا۔ اس سے یہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ اس کی ابھی زبان نہیں کھُلی۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ جلدی بولنے لگے گا۔ اس پر کسی بدرُوح کا اثر نہیں۔ یہ صدمے کا اثر تھا جس میں غصّہ زیادہ تھا۔"

دس پندرہ روز بعد ہم اسے دیکھنے کے لیے ایک بار پھر گئے مگر وہ لوگ جا چکے تھے۔

شانو کمہار اور مست بھینسا

اُس نے کہا — "مَیں نرائن چند سے
بڑا خوفناک انتقام لوں گا اور تم سے اُمید
رکھوں گا کہ اپنے ماں باپ کو بھی نہیں
بتاؤ گے کہ تم مجھے جانتے ہو"

شکار کی کہانیوں میں آپ نے جنگلی بھینسوں کے قصے بھی پڑھے ہوں گے۔ یہ بھینسے افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔ کسی کے پیچھے پڑ جائیں تو اُسے مار کر ہی دم لیتے ہیں۔ ان کا شکار شیر کے شکار جتنا خطرناک ہوتا ہے۔ گولی کھا کر شکاری پر حملہ کر دیتے ہیں۔ اگر شکاری درخت پر چڑھ جائے تو بھینسا درخت کے تنے سے لگ کر بیٹھ جاتا اور شکاری کے نیچے اُترنے کا انتظار کرتا ہے۔ اس کی ٹکر ہاتھی کو بھی اُلٹا کر دیتی ہے اور اس کا ہیونگ پیٹ چاک کر دیتا ہے۔

میری طرح آپ نے بھی جنگلی بھینسا نہیں دیکھا ہوگا۔ ہمارے ملک میں یہ جانور ہوتا ہی نہیں اور کبھی ہوتا بھی نہیں تھا۔ ایک بار ہمارا معرکہ ایک ایسے بھینسے کے ساتھ ہُوا تھا جو افریقہ کے جنگلی بھینسوں سے زیادہ خطرناک بلکہ خوفناک تھا۔ آج کل ہمارے وقتوں کی جہاں کئی اور چیزیں غائب ہو گئی ہیں وہاں یہ بھینسے بھی ہیں جو بدمست ہو کر قیامت بپا کر دیا کرتے تھے۔ بعض اوقات دو بھینسے جوشِ رقابت میں لڑ پڑتے تھے ان کی لڑائی فتح اور شکست تک جاری رہتی تھی، خواہ پورا دن گزر جائے خواہ رات بھی گزر جائے۔ وہ کسی ایک جگہ یا کسی ایک محدود سے علاقے میں نہیں لڑتے تھے بلکہ

لڑتے لڑتے کئی کئی میل دُور نکل جاتے تھے۔ یہ آواز اکثر سنائی دیتی تھی "دروازے بند کر لو۔ بچوں کو اندر کر لو۔ بھینسے لڑتے آ رہے ہیں"۔ جہاں جہاں تک یہ آواز پہنچتی تھی وہاں ہڑبونگ اور بھگدڑ مچ جاتی تھی۔ لڑتے بھینسوں کو چھڑانے کا کوئی بھی طریقہ اختیار نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ خطرہ ہوتا تھا کہ ان میں سے کوئی بھینسا پیچھے پڑ گیا تو کچومر نکال کر ہی دم لے گا۔ مَیں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ایک بھینسا دوسرے کو ٹکروں سے دھکیلتا گیا حتّٰی کہ پیچھے دیوار آ گئی اور کچی سی یہ دیوار گر پڑی۔

دوسرا خطرناک بھینسا وہ ہوتا تھا جو کسی وجہ سے بدمست ہو جاتا تھا۔ اسے پاگل یا باؤلا کہہ لیں۔ بدمست بھینسا انسانوں اور مویشیوں پر حملے کرتا تھا۔ اس کی پھنکار ایسی ہوتی تھی جیسے نتھنوں سے شعلے نکل رہے ہوں۔ ایسے بھینسے کو قابو میں لانے کی کوئی جرأت نہیں کرتا تھا۔ وہ کئی گاؤوں میں گھوم جاتا اور اس کی زد میں کوئی مویشی آ جاتا تو اُسے لہولہان یا ہلاک کر جاتا تھا۔ بندوق کے سوا اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔

آج کل جس طرح مردوں میں مردانگی نہیں رہی اسی طرح بھینسوں میں بھی بھینسا پن نہیں رہا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بھینسے بھی بناسپتی گھی اور ڈبے کا آٹا کھاتے ہیں۔ نہ بھینسے لڑتے نظر آتے ہیں نہ کوئی بھینسا مستی میں آ کر ہمارے دستوں والا ہنگامہ بپا کرتا ہے۔ کہاں وہ وقت کہ مَیں نے ایک بھینسے کو دیوار گراتے دیکھا تھا اور اب یہ وقت کہ مَیں نے پچھلے سال ایک بھینسے کو دیکھا جسے ایک بھینس نے پہلو میں ٹکر ماری تو بھینسا الیکشن میں ہارے ہوئے اُس اُمیدوار کی طرح دُور جا کھڑا ہُوا جس کی ضمانت ضبط ہو گئی ہو۔ یہ صحیح ہے کہ پچھلا سال خواتین کا سال تھا لیکن بھینسا آخر بھینسا ہوتا ہے، مَیں حیران ہُوں کہ ان کا وہ جوش اور جذبہ کیوں مر گیا ہے۔

آج ایک پُرانا واقعہ یاد آگیا ہے جو آدھی صدی سے کچھ زیادہ ہی پرانا ہے۔ اُس زمانے کو ذہن میں تازہ کر کے جب اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو یہ کوئی حیرت انگیز اور سنسنی خیز واقعہ نہیں لگتا، لیکن آج کے تعلیم اور ترقی یافتہ دَور پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ واقعہ سچّا ہونے کے باوجود ناقابلِ یقین لگتا ہے۔ اس کہانی میں ایک ڈاکو کا بھی ذکر آتا ہے جس نے کہانی میں دلچسپی پیدا کر دی ہے، لیکن وہ کوئی نامی گرامی ڈاکو نہیں تھا۔ وہ تو دس نمبرا بدمعاش بھی نہیں تھا۔ صرف بدمعاش تھا۔ بہرحال وہ جو کچھ بھی تھا خود ہی اندازہ کریں مَیں پوری واردات سُنا دیتا ہُوں۔ قصّہ یہ ہے کہ ہمارے گاؤں سے تین کوس دُور ایک گاؤں تھا جواب بھی ہے۔ وہاں ایک ہندو ساہوکار رہتا تھا۔ ہمارے دیہاتی علاقے میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ ہمارے ساتھ ہندو بھی رہا کرتے تھے۔ تقریباً ہر گاؤں میں ایک دو ہندو گھرانے آباد تھے۔ یہ لوگ ساہوکارہ کرتے تھے۔ مسلمان شادی، ماتم اور مقدمہ بازی کے لیے ان سے سُود پر قرض لیا کرتے تھے۔ رقم تھوڑی ہو تو صرف سُود اور زیادہ ہو تو سُود بھی لیتے اور زیورات یا زمین گروی بھی رکھتے تھے۔ اکثر یوں ہوتا تھا کہ قرض لینے والا ادائیگی کرتا رہتا تھا مگر اصل زر جُوں کا تُوں باقی رہتا بلکہ بڑھتا بھی رہتا تھا۔ آخر زیورات یا زمین ہندو ساہوکار کی ملکیت میں چلے جاتے تھے۔ گاؤں یا اُن لوگوں کی نظروں میں جو قرض لیتے تھے ہندو ساہوکار کا احترام امامِ مسجد کی نسبت زیادہ ہوتا تھا۔

مَیں آپ کو صرف اپنے علاقے کے متعلق بتاتا ہوں۔ ہمارے مسلمان بھائی شادیوں کی تقریبوں پر ہندو کے سُودی قرضوں کی زنجیروں میں ہمیشہ کے لیے بندھ جاتے لیکن بے دریغ اور بے جا اخراجات سے باز نہیں آتے تھے۔ ماتم پر بھی شادی کی طرح خرچ کرتے تھے۔ خرچ کی دوسری مَد مقدمہ بازی تھی اور پرانی دشمنی کی بنا پر لڑائی جھگڑے

اور قتل وغارت، کھلیان سے جب دانے گھر آجاتے تھے تو دیہاتی دشمنوں کو للکارتے، چھیڑ چھاڑ کرتے اور دیرینہ عداوتوں کی تسکین کی خاطر لڑائیاں کرتے تھے، پھر اُن کی سال بھر کی کمائی پولیس، وکیل اور کچہریاں کھا جاتیں اور وہ ہندو ساہوکاروں سے قرض لیتے اور زمینیں گروی رکھتے تھے۔ بعض حضرات اور اُن کی خواتین بڑے فخر سے کہا کرتی تھیں کہ ہم ساری جائیداد گروی رکھ کر مقدمہ لڑیں گے۔

مَیں نے ماضی کی زبان میں بات کی ہے جیسے یہ کوئی پرانا قصّہ ہے۔ پاکستان کے کسی بھی دیہاتی علاقے میں چلے جائیے، دیہاتیوں کی حالت اب بھی وہی ہے۔ فرق صرف یہ پیدا ہُوا ہے کہ وہاں سے ہندو ساہوکار نکل گئے ہیں۔ اب لوگ زمینیں فروخت کر دیتے ہیں یا اُن مسلمان بھائیوں سے قرض لیتے ہیں جو چوری چھپے ساہوکارہ کرتے ہیں۔ چوری چھپے اس لیے کہ اسلام میں سُود حرام ہے۔

مَیں بات تین کوس دُور کے ایک گاؤں کی کر رہا تھا جہاں ایک ہندو ساہوکار رہتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں ہندوؤں کے دو گھرانے تھے۔ ان میں سے ایک ساہوکارہ کرتا تھا۔ اس کا نام ایشر داس تھا۔ ایک روز اُس نے میرے دوست راجہ شاہباز خان سے کہا کہ تین کوس دُور والے ہندو ساہوکار کو ایک ڈاکو نے دھمکی دی ہے کہ وہ اس کے گھر ڈاکہ ڈالے گا اور اُس کی جوان بیٹی کو بھی اُٹھا لے جائے گا۔ ڈاکو نے یہ شرط پیش کی تھی کہ ہندو اُسے دس ہزار روپیہ نقد دے دے تو وہ ڈاکے اور اپنی بیٹی کے اغوا سے بچ سکتا ہے... دوسرے گاؤں کے ساہوکار کا مجھے نام یاد نہیں رہا۔ اسے آپ نرائن چند کہہ لیں۔ شاہباز خان نے مجھے وہ بات تفصیل سے سُنائی جو اُسے ایشر داس نے بتائی تھی۔ وہ کچھ اس طرح تھی کہ شالو نام کے ایک ڈاکو نے نرائن چند کو کسی کی زبانی یہ پیغام بھیجا

تھا جو مَیں اُوپر بیان کر چکا ہوں۔ شانو نے ایک جگہ بتائی تھی۔ دن اور وقت بھی مقرر کر دیا تھا اور کہا تھا کہ رقم وہاں پہنچ جائے اور اگر وہاں پولیس آئی تو نرائن چند کے گھر کے بچے بچے کو قتل کر دیا جائے گا۔

ہندو بنیئے کا دھرم پیسہ ہوتا ہے۔ ہندو کے متعلق یہ محاورہ غلط نہیں کہ چمڑی جائے دمڑی نہ جائے۔ یعنی کھال اُتر جائے تو قابلِ قبول۔ پیسہ نہ جائے۔ نرائن چند دس ہزار روپے کے بدلے اپنی بیٹی کا اغوا برداشت کر سکتا تھا۔ ڈاکہ اور قتل اس کی برداشت سے باہر تھا۔ اس نے دس ہزار روپیہ بچانے کی یہ ترکیب سوچی کہ ہمارے گاؤں کے ایشر داس سے کہا کہ وہ تین چار مسلمانوں کو تیار کرے جو شانو کو عین اُس وقت پکڑ لیں جب وہ اُسے رقم دے رہا ہو لیکن یہ ظاہر نہ ہو کہ یہ آدمی پہلے سے وہاں بٹھائے گئے تھے۔ ایشر داس ہندوؤں کی طرح دماغ کا تیز تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہمارے پاس شکاری کُتے ہیں اور ہم شکار کھیلنے جایا کرتے ہیں۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ ہم اتنے دلیر ہیں کہ جان تک کا خطرہ مول لے لیا کرتے ہیں۔ مَیں آپ کو اب تک جتنی کہانیاں سُنا چکا ہوں ان سب سے وہ واقف تھا۔ اس کی نظرِ انتخاب ہم پر پڑی۔ اُس نے ہمارے دوست شاہباز سے بات کی۔

اُس نے پہلے تو لمبی چوڑی تمہید باندھی۔ نرائن چند کی تعریفیں کچھ اس طرح کیں کہ وہ گاؤں کے غریب اور نادار مسلمانوں کو مالی امداد دیتا ہے اور ہر موقع پر مسلمانوں کی مدد کرتا ہے۔ ایشر داس سُودی قرضے کو مدد کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے یہ کہا کہ مسلمانوں کے درمیان رہتے ہوئے اگر نرائن چند کی بیٹی کو کوئی اُٹھا لے جائے تو یہ مسلمانوں کی بے غیرتی ہو گی۔ شاہباز خان کو اس نے اُکسایا اور بھڑکایا اور ترکیب یہ بتائی کہ رقم لے کر نرائن چند نہیں بلکہ وہ

خود (ایشر داس) جائے گا۔ شاہباز اپنے دوستوں اور کتوں کے ساتھ شکار کے بہانے مقررہ جگہ کی طرف جائے اور سب قریب کہیں چھپ جائیں۔ شانو رقم لینے آئے تو ایشر داس کھانسے گا۔ شاہباز اور اس کے دوست پہنچ جائیں اور شانو کو پکڑ لیں لیکن یہ ظاہر نہ ہونے دیں کہ یہ جال پہلے سے بچھایا گیا تھا ورنہ شانو کے گروہ کے آدمی نرائن چند کے گھر ڈاکہ ڈالیں گے اور قتل و غارت بھی کریں گے اور ہو سکتا ہے ایشر داس کے گھر کا بھی یہی حال کر دیں۔ ایشر داس نے شاہباز سے کہا کہ وہ منہ مانگا معاوضہ دے گا۔ یہ شرط بھی رکھی کہ گاؤں میں کسی کو پتہ نہ چلے۔ ایشر داس نے یہ بھی بتایا کہ وہ شانو سے ملنے خود جا رہا ہے۔ اُس سے رقم میں رعایت مانگے گا اور جہاں رقم پہنچانی ہے وہ جگہ بھی دیکھے گا۔

شاہباز نے اُسے کہا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مشورہ کر کے جواب دے گا۔ اُس نے یہ صاف طور پر کہہ دیا کہ ہم معاوضہ نہیں لیں گے۔ شاہباز نے ہم سے بات کی اور ہم تیار ہو گئے۔ آج جب مَیں نانا اور دادا بن گیا ہوں اُس وقت کو یاد کرتا ہوں تو ہنسی آ جاتی ہے کہ یہ سکیم بالکل احمقانہ تھی مگر اُس عمر میں ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ نرائن چند اور ایشر داس خوف سے مغلوب ہو کر شانو سے بچنے کے لیے اوٹ پٹانگ ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور تنکوں کے سہارے ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہم نے اسے ایک نہایت اعلیٰ سکیم کے طور پر قبول کر لیا۔ ہماری عمریں ملاحظہ کریں۔ میری عمر اٹھارہ انیس سال تھی۔ شاہباز میرا ہم عمر تھا اور ہمارے باقی دوست جو اس مہم میں شریک ہوئے ہم سے سال سال ڈیڑھ ڈیڑھ سال چھوٹے تھے۔ جوانی کا تازہ خون تھا۔ ہم لہو گرم رکھنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے تھے جسے آپ شہروں میں ایڈونچر کہا کرتے ہیں۔

ہمارا لہو گرم ہوتا تھا یا نہیں ہماری ماؤں کا لہو اُس وقت کچھ زیادہ ہی گرم ہو جایا

کرتا تھا۔ جب ہم شکار کو روانہ ہوا کرتے تھے۔ شکار پر ساتھ لے جانے کے لیے وہ ہمیں پراٹھے پکا دیتی تھیں۔ ہمارے باپوں کے لہو کا درجۂ حرارت نارمل سے نیچے ہی رہتا تھا وہ ہمیں بھاگنے دوڑنے سے روکتے نہیں تھے اور وہ ہماری ماؤں کو واہی تباہی بکنے سے بھی نہیں روکتے تھے۔ وہ مردانگی اور بہادری کا دور تھا۔ کوئی باپ پسند نہیں کرتا تھا کہ اس کا بیٹا کسی سے پیچھے رہے۔ ایک وجہ اور بھی تھی جو مجھے سنجیدگی کی عمر میں پہنچ کر معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ ہمارے بزرگ ہمیں فراغت سے بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ گاؤں میں فراغت زیادہ ہوتی تھی۔ بیجائی کر ڈالی تو فراغت اور کٹائی ہو کر دانے گھر میں آ گئے تو فراغت۔ ہمارے ہاں چونکہ نہریں نہیں، بارانی علاقہ ہے اس لیے پانی لگانے کی مصروفیت بھی نہیں ہوتی۔ ہمارے گاؤں میں عشق بازی کا ایک واقعہ ہو گیا تھا۔ ایسا ہی ایک واقعہ ہمارے قریب کے ایک گاؤں میں ہوا تھا۔ یہ نوجوانوں کی فراغت کا نتیجہ تھا۔ ہمارے بزرگوں نے اس کا علاج یہ سوچا تھا کہ ہم کھیتوں کے کام دھندوں سے فارغ ہو کر کسی کھیل کود میں مصروف ہو جایا کریں ہم نے کتے پال لیے اور شکار کھیلنے لگے۔ ہماری ماؤں کو شکار پسند نہیں تھا کیونکہ شکار پر حادثات بھی ہو سکتے تھے۔ مائیں ہمیں گالیاں دیتی تھیں۔ یہ دھمکیاں بھی دیتی تھیں کہ وہ ہمارے کتوں کو زہر دے دیں گی لیکن گالیوں اور دھمکیوں کے ساتھ وہ ہمیں پراٹھے اور کتوں کو دودھ باقاعدگی سے دیا کرتی تھیں۔

ہمارے بزرگوں نے ہمیں مرد بنایا اور اس مردانگی کا حاصل پاکستان ہے۔

شاہباز نے ہم سے بات کی تو ہم ڈاکو کو پکڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہم نے معاوضہ قبول نہ کیا۔ ہمیں نراین چند اور ایشر داس کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہمیں نراین چند کی بیٹی کے ساتھ بھی کوئی ہمدردی نہیں تھی جسے شانو نے اغوا کرنے کی دھمکی دی تھی۔

ہماری دلچسپی صرف یہ تھی کہ ایک ڈاکو کو پکڑیں گے اور لوگ ہمیں شاباش دیں گے، لیکن یہ مسئلہ سامنے آگیا کہ شانو کون ہے اور کہاں کا ڈاکو ہے۔ اُس زمانے میں پیشہ ور ڈاکو اور رہزن ہُوا کرتے تھے جن سے پولیس بھی ڈرتی تھی۔ ان کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ اکثر لوگ انہیں جانتے تھے۔ ڈاکوزنی سے ہٹ کر وہ صاحبِ کردار بھی ہوتے تھے۔ اکیلے و دکیلے مسافر کو نہیں لوٹتے تھے۔ اُن کی وارداتیں بڑی خوفناک ہوتی تھیں۔ ہمارے علاقے میں دُور دُور تک تین ڈاکو مشہور تھے جو پولیس کو چیلنج کر کے وارادات کیا کرتے تھے مگر شانو سے ہم واقف نہیں تھے۔ یہ نام ہم نے پہلی بار سُنا۔ ہم نے گاؤں کے چند آدمیوں سے پُوچھا۔ کسی نے یہ نام نہیں سُنا تھا۔ ہم نے سوچا کہ کوئی بدمعاش ہوگا جس نے نرائن چند سے رقم بٹورنے کے لیے دھمکی دی ہے۔ اس خیال سے ہم اور دلیر ہو گئے۔ ڈاکو اور بدمعاش میں بہت فرق ہُوا کرتا تھا۔

ایک دو دنوں بعد الیشر داس نے ہمیں بتایا کہ شانو تک پیغام پہنچا دیا گیا ہے کہ رقم مقررہ دن اور وقت پر مقررہ جگہ پہنچا دی جائے گی اور رقم الیشر داس لائے گا۔ تین دن باقی تھے۔ مَیں اور شاہباز جگہ دیکھنے گئے۔ اُس دَور میں آبادیاں کم تھیں۔ راستے کچے تھے۔ لوگ اُن پگڈنڈیوں پر چلا کرتے تھے جن پر چلنے والے زیادہ ہوتے تھے۔ ویرانوں کی طرف کم ہی کوئی جاتا تھا۔ وہ جگہ ہمارے گاؤں سے تقریباً چار کوس دُور تھی۔ ہم نے وہ جگہ دیکھی۔ شانو نے علاقے اور جگہ کا انتخاب عقل سے کیا تھا۔ کھڈ نالوں کا علاقہ تھا۔ جگہ گہرائی میں تھی۔ یہ ایک وسیع نشیب تھا جس میں چھوٹے بڑے ٹیلے دیواروں کی طرح کھڑے تھے۔ اس سے پرے ایک برساتی نالہ بہتا تھا جو اُن دنوں خشک تھا۔ اس کے دونوں طرف عمودی اور بلند ٹیلے تھے۔ اس علاقے میں کیکر وغیرہ کے درخت

عام تھے۔ ٹیلوں میں گُفنیں دغاریں، سی بنی ہوئی تھیں۔ بالکل ویران اور راستے سے دور ہٹا ہُوا علاقہ تھا۔

ایشرداس نے ہمیں وہ جگہ دکھائی جہاں اُسے شانو کو رقم دینی تھی۔ وقت دوپہر سے کچھ پہلے کا مقرر کیا گیا تھا۔ مَیں نے اور شاہباز نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک وسیع گہرائی کا انتخاب کر لیا۔ وہاں ہمیں کُتوں کے ساتھ وقت سے بہت پہلے آکر چھُپنا تھا۔ ایک جگہ بلندی پر دیکھی جہاں ایک لڑکے کو کھڑا کرنا تھا۔ اس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ جونہی شانو آئے وہ ہمیں اشارہ کرے۔ ایشرداس نے ہمیں بتایا کہ وہ رقم اپنے ساتھ نہیں لائے گا۔ اُسے اعتماد تھا کہ ہم شانو کو پکڑ لیں گے۔ ہم میں سے کسی نے بھی نہ سوچا کہ شانو کو پکڑ کر ہم پولیس کے پاس لے جائیں گے تو یہ کس طرح ثابت کریں گے کہ اُس نے زائن چند سے دس ہزار روپیہ مانگا تھا ورنہ وہ اُس کے گھر ڈاکہ ڈالے گا۔ شانو یہ کہہ سکتا تھا کہ اِن لڑکوں نے مجھے گھیر کر پکڑا اور دشمنی کی بنا پر الزام عائد کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس قسم کی مہم کی پلاننگ کی جاتی ہے جسے منصوبہ بندی کہتے ہیں۔ یہ تو بڑے ہو کر پتہ چلا تھا کہ ہر کام کی پلاننگ ہوتی ہے۔ اب تو بچّے پیدا کرنے کی بھی پلاننگ کی جاتی ہے، بلکہ اب صرف پلاننگ ہی ہوتی ہے۔ پاکستانی سرکار بھی پلاننگ کرتی ہے اور دفتروں میں کام تو کوئی نہیں ہوتا کام دکھایا جاتا ہے۔

ہم اپنے وقتوں میں پلاننگ سے آزاد تھے۔ جو کام کرنا ہوتا کر گزرتے تھے۔ ایشرداس نے ہمیں پھونک دی تو ہم اُس کی مدد کے لیے تیار ہو گئے۔ ہم چھ نوجوان تیار ہوئے۔ ہمارے ساتھ افضل بھی تھا اور اُس کے ساتھ اُس کا خونخوار بُوہلی کُتّا (بُل ڈاگ) تھا۔ میری سُنائی ہوئی کہانیوں میں آپ نے اس بُوہلی کے کارنامے پڑھے ہوں گے۔ باقی پانچ

کُتّے بل ٹیریر تھے۔ ایک روز پہلے نرائن چند ہمارے گاؤں آیا اور ہم سے ملا۔ اُس نے ہم سب کو ڈیڑھ ہزار روپیہ پیش کیا جو ہم نے قبول نہیں کیا۔ گاؤں میں ہم نے کسی کو نہیں بتایا کہ ہم کیا کرنے والے ہیں... دوسری صبح ابھی دھندلکا تھا جب ہم چھ لڑکے کُتّے ساتھ لے کر گاؤں سے نکلے۔ الیشرداس ہم سے الگ گاؤں سے نکلا اور کچھ دُور آگے جاکر ہمارے ساتھ آن ملا۔ وہ ہندو بنیا تھا اس لیے بہت ڈرپوک تھا۔ ہمارا کوئی کُتّا اُس کی طرف دیکھتا تھا تو وہ کسی لڑکے کے پیچھے ہو جاتا اور کہتا۔ "یہ مجھے کاٹے گا"

ہم تیز چلنے کے عادی تھے۔ الیشرداس سے اتنی تیز چلا نہیں جاتا تھا۔ تھوڑی دُور جاکر وہ ہانپ گیا۔ افضل نے اپنے بُوہلی کو زنجیر ڈال رکھی تھی۔ وہ الیشرداس کے پیچھے ہو گیا۔ اُس کے بُوہلی نے پیچھے سے الیشرداس کو سُونگھا۔ الیشرداس نے پیچھے دیکھا تو اس کی رفتار ہم سے بھی تیز ہو گئی۔ اس کے بعد الیشرداس کی رفتار جہاں بھی ذرا کم ہوئی افضل نے بُوہلی اُس کے پیچھے کر دیا۔ ایک بار بُوہلی معلوم نہیں کیوں غرّایا۔ اس سے یہ انکشاف ہُوا کہ الیشرداس لانگ جمپ بھی کر سکتا ہے۔

جُوں جُوں ہم آگے بڑھتے جا رہے تھے الیشرداس تھکن اور خوف سے پیلا پڑتا جا رہا تھا۔ وہ ہم سے جو سوال پوچھتا تھا اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ جس مہم پر وہ ہمیں لایا ہے اس سے وہ بھاگنا چاہتا ہے۔ اُس نے کوئی بیس بار پُوچھا ــــ "تم سب وقت پر پہنچ جاؤ گے نا؟... شانو مجھے قتل تو نہیں کر دے گا"؟ ــــ ایک بار اُس نے کہا۔ "میرے دل میں آتی ہے کہ نرائن چند سے کہوں کہ دس کی بجائے پانچ ہزار شانو کو دے کر جان چھڑائے" ــــ اور اُس نے ایک سوال یہ پُوچھا ــــ "قتل میں کتنی دیر لگتی ہے"؟

میرے ایک دوست نے چٹکی بجا کر کہا ــــ "بس اتنی۔ سر میں ایک کلہاڑی یا دل میں ایک چاقو، اور بندہ پار۔"

"ہائیں"۔ ہندو کے منہ سے لمبی ساری "ہائیں" نکلی اور وہ رُک گیا۔ اُس کی آنکھیں اُبل آئیں اور خوف سے مُنہ کھُل گیا۔ افضل نے بُوہلی کو اُس کے پیچھے کیا تو لالہ ایشر داس آگے چل پڑا۔ ہم سب ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ ایشر داس پھر رُک گیا اور روتی ہوئی آواز میں بولا ــــ "ہماری جان پر بنی ہوئی ہے اور تم ہنستے ہو۔ جاؤ، مَیں نہیں جاتا تمہارے ساتھ۔" وہ پیچھے کو چل پڑا۔

"جاؤ لالہ جی!" شاہباز نے کہا ــــ "شانو اسی راستے سے آئے گا" ــــ اور لالہ وہیں سے گھوم کر ہمارے ساتھ چل پڑا۔ اُس کا خوف اور وہم غلط نہیں تھا کیونکہ ہم ہنستے کھیلتے جا رہے تھے جیسے کسی ڈاکو کو نہیں گیدڑ یا خرگوش کو کتّوں سے مروانے جا رہے ہوں۔ یہ تھی بھی حقیقت کہ ہم نے سوچا تھا کہ شانو مل گیا تو دیکھا جائے گا کیا ہوتا ہے، اور وہ نہ ملا تو شکار کھیل کر گھر کو آجائیں گے۔ ایشر داس کو ہم نے مذاق کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ ہم دراصل بے وقوفی کی حد تک دلیر تھے۔

اگر علاقہ میدانی ہوتا تو ہم مقررہ جگہ پر جلدی پہنچ جاتے مگر وہ کھڈ نالوں، گہرے نشیبوں اور گھاٹیوں کا علاقہ تھا۔ ہم تو گھاٹیاں جلدی چڑھ جاتے تھے، ایشر داس کے چڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ ہاتھ گھاٹی پر رکھ کر اُوپر جاتا اور اُوپر جا کر دھڑام سے بیٹھ جاتا تھا۔ اس طرح وقت ضائع ہوتا رہا۔ سورج اُوپر آگیا تھا۔ ہمیں مقررہ جگہ تک جلدی پہنچنا تھا تاکہ شانو کے آنے سے پہلے چھُپ جائیں۔ کچھ اور آگے گئے تو دو آدمی ملے۔ انہوں نے بتایا کہ راستے میں انہوں نے ایک مست بھینسا دیکھا ہے جو پچھلے کسی گاؤں

میں دو آدمیوں اور ایک دو مویشیوں کو زخمی کر آیا ہے۔ انہوں نے اُدھر کو جدھر ہم جا رہے تھے اشارہ کر کے بتایا کہ بھینسا اُدھر جاتے دیکھا ہے، اور یہ بھی کہ وہ بہت طاقتور اور خطرناک ہے۔ اسی لیے لوگوں نے اُس کا تعاقب نہیں کیا۔

ہمارے ساتھ چھ کُتے تھے۔ دو کلہاڑیاں اور چار موٹے ڈنڈے تھے۔ ڈرنے یا احتیاط کرنے کی بجائے ہم خوش ہوئے کہ ایک اور شکار مل گیا۔ ہم شانو کی بجائے مست بھینسے کو مارنے کی باتیں کرنے لگے۔ ایشرداس پریشان ہو گیا۔ اُس نے کہا ــــ "تم شانو کی باتیں کرو، چھوڑو بھینسے کو۔ بھینسے تو پھرتے ہی رہتے ہیں"۔

"لالہ جی"! افضل نے کہا ــــ "شانو سے پہلے بھینسا مل گیا تو وہ دس ہزار روپیہ نقد پر بھی نہیں ملے گا، اس لیے پہلے بھینسا بعد میں شانو"۔

"نہیں، نہیں"۔ ایشرداس نے بچوں کی طرح کہا ــــ "جو پہلے آگیا وہ پہلے"۔

ہم سب نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ایشرداس ہم سب کو احمقوں کی طرح دیکھنے لگا، اور جب اُس نے افضل کے بُوٹ کو دیکھا تو آگے آگے چل پڑا۔ ہم نے دُور ایک گیدڑ کو جاتے دیکھا۔ پھر خرگوشوں کا جوڑا نظر آیا لیکن ہم نے کُتے نہ کھولے کیونکہ ہم کوئی اور ہی شکار کھیلنے جا رہے تھے۔ آخر مقررہ علاقہ آگیا۔ ہم رُک گئے۔ سکیم کے مطابق ایشرداس سے کہا کہ وہ ہم سے الگ ہو کر مقررہ جگہ کی طرف چلا جائے۔ ہمیں چکر کاٹ کر اپنے چُھپنے کی جگہ تک پہنچنا تھا۔ لالہ چند قدم اکیلا چلا تو رُک گیا۔ کہنے لگا ــــ "ایک لڑکا میرے ساتھ آؤ۔ اکیلا گیا تو شانو مار ڈالے گا"۔

ہم نے اپنے ایک دوست کو اُس کے ساتھ کر دیا۔ اس دوست کو ہم بجلی کہا کرتے تھے۔ وہ بجلی کی طرح پھرتیلا اور قدموں کا بہت تیز تھا۔ بے حد دلیر اور

شرارتی۔ اُس کے ساتھ اُس کا کُتّا تھا اور کلہاڑی۔ اُس نے چلتے ہوئے ہم سے کہا
"مَیں لالے کو ڈرا کر بے ہوش کر دوں گا۔ شانو آگیا تو اُسے کہوں گا کہ یہ پیسہ ایک بھی
ساتھ نہیں لایا۔ اسے اُٹھا لے جاؤ"۔

ہم اپنے راستے پر چلے گئے۔ پیچھے دیکھا۔ ایشر داس اور بجلی غائب تھے۔ کسی
نشیب میں اُتر گئے تھے۔ ہم گھاٹیاں اُترتے چڑھتے دُور نکل گئے۔ بہت آگے گئے
ہمیں دھمک دھمک سنائی دی اور آدمیوں کی آوازیں بھی۔ آوازیں ہم سمجھ نہ سکے۔ شور
تھا۔ کوئی گڑبڑ تھی۔ نظر کچھ نہیں آتا تھا۔ جو کچھ تھا وہ قریب کہیں گہرائی میں تھا۔ ہم
اُدھر کا رُخ کر لیا اور تیز چل پڑے۔ ڈیڑھ دو فرلانگ گئے تو ہمیں رُکنا پڑا کیونکہ
ہموار زمین ختم ہو گئی تھی۔ آگے گہرائی تھی اور اس کے اردگرد مٹی کی اُونچی دیواریں
ہم جہاں رُکے تھے وہاں ایسے لگتا تھا جیسے کسی مکان کی منڈیر پر کھڑے ہوں۔ گہرا
وسیع تھی۔ اس کے اردگرد قدرت نے جو دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں وہ ایک جگہ سے
کی بجائے ڈھلانی تھیں۔ ہمارے دیہاتی علاقے میں ایسی گہرائیاں بہت پائی جاتی ہیں
مَیں جس وقت کی بات سُنا رہا ہوں اُس وقت ان کی شکل و صورت کچھ اور تھی۔ اتنی
بعد کئی گہرائیاں بارشوں نے بھر دی ہیں۔

ہمیں آوازیں سنائی دے رہی تھیں، کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ آوازیں تین چار آدم
کی تھیں۔ ایک جگہ سے گرداگرد دیوار میں شگاف تھا۔ یوں سمجھئے کہ یہ ایک راستہ تھا
وہاں سے ایک آدمی دوڑتا اندر آیا۔ اُس کا منہ اور سر صافے میں لپٹا ہُوا تھا اور اُس
ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ اُس کے پیچھے ایک بھینسا آیا۔ وہ بھی دوڑ رہا تھا۔ صافے وا
آدمی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُسے کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ بھینسا اُس سے دس بارہ قدم

تھا۔ یہ وہی بھینسا ہو سکتا تھا جس کی اطلاع ہمیں دو آدمیوں نے دی تھی۔ مَیں آپ کے تصوّر میں نہیں بٹھا سکوں گا کہ وہ بھینسا کتنا بڑا اور کس قدر موٹا تازہ تھا۔ آپ نے شہروں میں بھینسیں اور بھینسے دیکھے ہوں گے۔ ان میں سے کوئی بھی اس کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اتنے قوی ہیکل جسم کی وجہ سے وہ بہت تیز دوڑ سکتا تھا۔ اُس کے آگے بھاگنے والا وہاں سے نکلنے کا راستہ دیکھ رہا تھا۔ وہ غلط جگہ آن پہنچا تھا۔

وہ جس راستے سے آیا تھا وہاں سے دو اور آدمی لاٹھیاں اُٹھائے اندر آئے۔ اُن کے بھی منہ اور سر صافوں میں چھپے ہوئے تھے۔ پہلا آدمی اُس راستے کی طرف دوڑا لیکن بھینسے نے آگے ہو کر راستہ روک لیا۔ دونوں آدمی اُلٹے پاؤں بھاگے اور غائب ہو گئے۔ یہ اکیلا آدمی پیچھے کو دوڑا۔ اُس جگہ کا منظر سٹیڈیم سے ملتا جلتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے روم کے بادشاہ ایک انسان کو جنگلی بھینسے کے مقابلے میں اتار کر تماشہ دیکھ رہے ہوں، مگر ہم زیادہ دیر تماشائی نہ بنے رہے۔ شاہباز خان کی آواز مجھے آج بھی یاد ہے۔ اُس نے بڑی بلند آواز سے کہا ——"گھبرانا نہیں دوست، ہم آ رہے ہیں"—— اس آواز پر اُس نے اُوپر دیکھا اور کہا——"خدا کے لیے جلدی آؤ"۔

اتنے میں بھینسا اُس کے اُوپر آ گیا۔ وہ آدمی پیچھے ہٹا تو مٹی کی دیوار نے اُسے روک لیا۔ اُس کے ہاتھ سے کلہاڑی گر پڑی اور وہ خود بھی ایک طرف گرا۔ آدمی پھرتیلا معلوم ہوتا تھا۔ بڑی تیزی سے ایک طرف لڑھک گیا۔ بھینسے کی ٹکر دیوار کو لگی اور آدمی بچ نکلا۔ ہم نے کُتّے کھول دیئے اور جدھر سے دیوار ڈھلانی تھی اُدھر کو دوڑے اُترنے کے لیے یہ جگہ ٹھیک نہیں تھی لیکن سب مٹی تھی۔ ہم نیچے کو پھسل پڑے۔ کچھ چلے، کچھ پھسلے اور کچھ لڑھکے بھی۔ کتّے ہم سے پہلے اُتر گئے۔ ہمارے ذہنوں سے

شاہنواز گیا۔ ہمارے اشارے پر کتوں نے بھینسے کو گھیر لیا لیکن وہ اتنے بڑے شکار کے عادی نہیں تھے۔ ہم نے انہیں بھینسے جتنے بڑے شکار مارنے کی ٹریننگ نہیں دی تھی۔ انہیں پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اسے پکڑیں کہاں سے اور منہ کہاں ڈالیں۔ افضل کے بوہلی کا داؤ یہ ہوا کرتا تھا کہ شکار کی شہ رگ منہ میں لے لیتا تھا یا گردن کو اوپر سے پکڑ کر ایسا جھٹکا دیتا جس سے شکار کی ہڈی ٹوٹ جاتی تھی لیکن یہ داؤ گیدڑ اور بھیڑیئے پر ہی چل سکتا تھا۔ اس نے دو بھیڑیئے مارے بھی تھے۔ وہ بھینسے کی بھی گردن کو ہی پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور یہ نہیں دیکھتا تھا کہ بھینسے کی گردن اس کے پورے جسم جتنی موٹی ہے۔

بھینسے کی حالت یہ تھی کہ کتوں کی طرف توجہ ہی نہیں دیتا تھا۔ وہ ابھی تک اس آدمی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ ہمارے پاس ایک کلہاڑی اور چار ڈنڈے تھے۔ اس آدمی کے پاس بھی کلہاڑی تھی لیکن ہم نے اعلان کر دیا کہ بھینسے کو کوئی کلہاڑی نہیں مارے گا۔ بھینسے کی پھنکار ایسی تھی جیسے اس کے نتھنوں سے شعلے نکل رہے ہوں۔ ہمارا ایک کتا اس کے سامنے آگیا اور دیوار کے ساتھ ٹکرا کر گر پڑا۔ بھینسا اس پر پہنچ گیا اور ایسی ٹکر ماری کہ کتے کی آواز بھی نہ نکلی۔ اس کی پسلیاں ٹوٹ کر پچک گئیں اور پیٹ ایسا پھٹا کہ انتڑیاں باہر آگئیں۔ کتے کو تڑپنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ بھینسا گھوم کر آیا۔ آگے شاہباز تھا۔ وہ بھی دیوار سے ٹکرا کر گرا۔ میری تو چیخ نکل گئی۔ شاہباز کے بچنے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ عین اس وقت ایک معجزہ ہوا۔ ہمارے ایک کتے نے پیچھے سے بھینسے کی دم منہ میں لے لی، دوسرے نے ٹانگ پر منہ ڈالا اور افضل کا بوہلی ایک طرف سے بھینسے کے منہ پر اچھلا اور پنجہ مارا۔ اس سے بھینسے کا رخ بدل گیا۔ آگے میں تھا۔ میں بھاگنے لگا تو میں بھی دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا۔ جس طرح میں چیخا تھا اسی طرح مجھے شاہباز کی چیخ سنائی دی۔ اب مجھے بھی

کوئی معجزہ ہی بچا سکتا تھا۔ بھینسا میرے اتنی قریب سے گزر گیا کہ اُس کا پاؤں میرے پہلو کے ساتھ پڑا۔ ایک آدھ انچ ادھر پڑتا تو میرا حشر اُس کُتے والا ہوتا جو مجھ سے ذرا ہی دُور کچلا پڑا تھا۔ بوہلی بھینسے کے ساتھ دوڑتا اور اُچھلتا میرے اُوپر سے گزر گیا۔ مَیں نے بھینسے کی پھنکار بہت قریب سے محسوس کی۔ آگ سے کم گرم کیا ہو گی۔ اُس کے میرے قریب سے گزرنے کو صرف وہ فوجی سمجھ سکتا ہے جو میدانِ جنگ میں گرا پڑا ہو اور اُس کے قریب سے دشمن کا ٹینک فائرنگ کرتا گزر جائے۔

وہ آدمی جس کے پیچھے بھینسا آیا تھا وہ بھاگا نہیں ہمارے ساتھ رہا۔ اُس کے پیچھے جو دو آدمی آئے اور بھاگ گئے تھے وہ نظر نہیں آئے۔ مَیں بھی بچ گیا۔ کتوں نے بھینسے کی توجہ انسانوں سے ہٹالی مگر ہمارا ایک اور دوست اس کے آگے آگیا۔ بھینسا اُس کی طرف گیا تو اُس آدمی نے یہ کمال کر دکھایا کہ ہاتھ میں کلہاڑی لے کر ایسا اُچھلا کہ بھینسے کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کلہاڑی بھی سنبھال رہا تھا۔ وہ بھینسے کے سر پر کلہاڑی مارنا چاہتا تھا۔ نیچے سے بُوہلی نے بھینسے کی شہ رگ منہ میں لے لی۔ اُوپر سے اُس آدمی نے کلہاڑی ماری جو بھینسے کے سینگ پر لگی۔ وہ بڑی زور زور سے سر ہلا رہا تھا۔ کلہاڑی لگتے ہی کلہاڑی مارنے والا نیچے آ پڑا۔ اب بھینسا اپنی شہ رگ چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن بوہلی اسے بھنبھوڑ رہا تھا۔ ہمیں اس کا انجام یہی نظر آ رہا تھا کہ بُوہلی بھینسے کے پاؤں تلے کچلا جائے گا۔ بھینسا کبھی تو تیز دوڑتا اور کبھی رُک کر گردن کو زور زور سے ہلاتا تھا۔

ہم نے سامنے سے دیکھا۔ بھینسے کی شاید سانس کی نالی بھی بوہلی کے منہ میں آگئی تھی۔ اُس کا منہ کھُل گیا تھا اور پھنکار کی بجائے اب اس کے حلق سے خراٹے سے نکل رہے تھے۔

ایک بار تو اُس کی اگلی ٹانگیں دُہری ہو گئیں لیکن وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ دوسرے کُتّے اسے کہیں نہ کہیں منہ ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اُن کے لیے یہ کام ممکن نہیں رہا تھا۔ اتنے بڑے جانور کو صرف شیر اور چیتا مار سکتا ہے۔ اِن درندوں کے پنجے لمبے اور ٹیڑھے ہوتے ہیں جو کھال میں اُتر جاتے ہیں اور اُن کے منہ اتنے بڑے ہوتے ہیں جن سے وہ اُوپر سے گردن پکڑتے اور ہڈی توڑ دیتے ہیں۔ اس سے بھینسے جیسا طاقتور جانور بھی بے حال ہو کر گر پڑتا ہے۔ کُتّا درندہ نہیں ہوتا۔ اس کے دانت درندوں کی طرح چیر پھاڑ نہیں کر سکتے۔ یہ تو بُوبلی نے خود ہی گردن کو اُوپر یا نیچے سے پکڑنے کا داؤ سیکھ لیا اور اس میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس کا منہ خاصا بڑا تھا اور وہ طاقتور بھی تھا۔

دوسرے کُتّوں نے بھینسے کی ٹانگوں کو منہ میں لے لیا تھا۔ اب بھینسا شہ رگ جکڑے جانے اور سانس رُک جانے کی وجہ سے بے بس ہو گیا تھا۔ ایک ہی جگہ رُک گیا اور سر کو اِدھر اُدھر مارتا تھا۔ حتیٰ کہ اُس کی اگلی ٹانگیں دُہری ہو کر زمین سے لگ گئیں۔ اس موقع پر اُس آدمی نے جس کا منہ سر ابھی تک صافے میں لپٹا ہُوا تھا ایک دلیرانہ کارنامہ کر دکھایا۔ بھینسے کے سینگ جو خاصے لمبے تھے پیچھے کو سیدھے گئے ہوئے اور آخر میں باہر کو مڑے ہوئے تھے۔ اُس آدمی نے ایک سینگ کا سرا پکڑ لیا اور ہم سے کہا کہ دوسرا سینگ پکڑ لو۔ دوسرے لمحے ہم میں سے دو نے اِدھر کا سینگ پکڑ لیا اور دوسرا سینگ اس آدمی نے اور افضل نے پکڑ لیا۔ اُس کی ہدایت کے مطابق ایک سینگ پوری طاقت سے نیچے دبایا گیا۔ اُدھر سے دوسرا سینگ اُوپر اٹھایا گیا۔ بھینسے کی گردن مُڑنے لگی۔ اگر بھینسے کی شہ رگ بُوبلی کے منہ میں نہ ہوتی یا اُس کے منہ سے نکل جاتی تو بھینسا سر کے ایک ہی جھٹکے سے چاروں کو ہوا میں اُچھال دیتا۔ پھر بھی خطرہ باقی تھا۔ اس بے بسی کی حالت میں بھی وہ ہمیں مکمل

سکتا تھا۔

بھینسے کی گردن مڑ گئی مگر گردن موڑنے والوں نے اتنا زور لگایا کہ اُن کی آنکھیں لال سرخ ہو کر باہر کو آنے لگیں۔ بھینسے کا منہ کھلا ہُوا تھا۔ میرے بُل ٹیریر نے سامنے آکر بھینسے کے نتھنوں کو منہ میں لے لیا، اور اچانک بھینسا اُلٹا ہو گیا۔ اُس آدمی نے بڑی تیزی سے چاقو نکالا جو بہت لمبا تھا۔ اُس نے بڑی زور سے چاقو بھینسے کے پیٹ میں اُتار کر ایک طرف کو کھینچا اور اس کا پیٹ کھول دیا۔ بھینسا تڑپ کر سیدھا ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی بُوبلی کا منہ اکھڑ گیا۔ بھینسا اُٹھ کھڑا ہُوا۔ ہم پیچھے کو دوڑے لیکن بھینسا اب دوڑنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کی انتڑیاں اور پیٹ کے دوسرے حصّے زمین پر آپڑے۔ اس کی ٹانگیں آہستہ آہستہ دوہری ہوئیں اور وہ ایک پہلو کے بل گر پڑا۔

ہم اُس کے مرنے کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر سانس لیتا رہا اور آخر میں ایک خراٹا لے کر بے حس ہو گیا۔ ہمارے کُتّے ابھی تک اُس پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتے تھے۔ ہم میں سے کسی نے کہا ــــ "یار، وہ کہاں چلا گیا ہے؟" ــــ ہم نے دیکھا۔ وہ آدمی غائب تھا۔ کسی نے کہا کہ اُس کے پیچھے دو آدمی آئے تھے جو بھاگ گئے تھے، وہ اُن کے پاس چلا گیا ہوگا۔ اس آدمی نے ہمارا ساتھ دیا تھا۔ قدرتی طور پر ہم اُن کے ساتھ باتیں کرنا چاہتے تھے۔ ہم شکار سے فارغ بھی ہو گئے تھے۔ ہمیں یاد آگیا کہ ہم ایشر داس کے ساتھ شانو نام کے ایک ڈاکو کو پکڑنے آئے تھے۔ ہم نے سوچا کہ اتنی دیر میں شانو اور ایشر داس کی ملاقات ہو چکی ہوگی اور معلوم نہیں وہاں کیا ہُوا ہوگا۔ ہمارا دوست، بجلی بھی ایشر داس کے ساتھ تھا۔ ایشر داس کی نسبت ہمیں اپنے دوست کا زیادہ غم تھا۔ ہم نے کتّوں کے پٹّوں میں زنجیریں ڈالیں اور اُس راستے سے باہر کو چلے جس سے بھینسا

اندر آیا تھا۔

دوسری طرف گئے تو دیکھا کہ یہ وہی جگہ تھی جہاں ہمیں چھپنا تھا۔ میں دوڑ کر گھاٹی چڑھ گیا۔ وہاں ہمیں ایک لڑکے کو چھپا کر بٹھانا تھا۔ اُسے یہ ڈیوٹی دی گئی تھی کہ شانو آتے تو ہمیں اشارہ کر دے۔ میں نے وہاں سے دیکھا تو کوئی دو سو قدم دُور مجھے ایشرداس اور بجلی ایک درخت کے نیچے کھڑے نظر آئے۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ انہیں دیکھ کر مجھے اطمینان ہُوا کہ شانو ابھی نہیں آیا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ مجھے تین آدمی نظر آئے جو اُن کی طرف جا رہے تھے۔ تینوں کے منہ سر صافوں (پگڑیوں) میں چھُپے ہوئے تھے۔ مجھے ایسے شک ہُوا جیسے یہ تینوں وہی ہیں جنہیں ہم نے بھینے کے ساتھ دیکھا تھا۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا ——— "چلو اوئے، وہ آ گئے ہیں ... تین ہیں" ——— میں دوڑتا نیچے آیا۔

ہم سب اُس نشیب سے نکل کر دوسری طرف سے اُوپر گئے۔ اُن تینوں آدمیوں نے ایشرداس اور بجلی کو گھیر رکھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ آدمی ذرا پیچھے ہٹ گئے۔ اُن میں سے ایک ہماری طرف آیا۔ قریب جا کے دیکھا۔ یہ وہی آدمی تھا جس کے پیچھے بھینسا آیا تھا اور جس نے بھینسے کے مرنے تک ہمارا ساتھ دیا تھا۔ ہم تیزی سے آگے چلے گئے بھینسے کے بعد اب ہمارا دوسرا معرکہ ہونے والا تھا۔ ایشرداس ہماری طرف دوڑ پڑا اور چلانے لگا ——— "یہ ہے شانو ڈاکو۔ اسے پکڑ لو۔ یہ ہم سے دس ہزار روپیہ مانگتا ہے" ایشرداس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ہم حیران ہوئے کہ جس نے بھینسے کے معرکے میں ہمارا ساتھ دیا ہے، وہی شانو ہے۔ دوسرے دو اُس کے ساتھی تھے۔ ایشرداس نے واویلا

ہپا کیا تو شانو کلہاڑی اُوپر کر کے اُس کی طرف دوڑا۔ ہندو بھاگ اُٹھا۔ ہم نے شانو کو روک لیا۔

"سنو لڑکو۔" شانو نے شفقت کے لہجے میں کہا ــــ "تم جاؤ ہنسو کھیلو۔ یار تم تو بہت بہادر ہو۔"

ایشر داس اور بکی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہم کتنا خطرناک معرکہ لڑ کر آئے ہیں اور شانو بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ہم میں سے کسی نے شانو سے کہا ــــ "ہم جانتے ہیں کہ تم اس ہندو سے دس ہزار روپیہ لینے آئے ہو۔ تم نے ہمارے گُتّے دیکھ لیے ہیں۔"

"تم اس ہندو کی مدد کرنا چاہتے ہو؟" شانو نے ہم سے پوچھا ــــ "تم مجھے ڈاکو سمجھتے ہو؟"

"ہم نے سُنا تو یہی ہے۔" مَیں نے جواب دیا۔

اُس نے ذرا سی دیر سوچ کر ایشر داس کو وہاں سے دُور بھیج دیا اور ہم سے کہا۔ "تم نے میری جان بچائی ہے۔ مَیں اس احسان کا بدلہ دینا چاہتا ہوں۔ اگر یہ ہندو تمہیں روپے پیسے کا لالچ دے کر ساتھ لایا ہے تو اس سے اتنی رقم لے لو اور مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دو۔ اس سے پہلے میری پوری بات سُن لو۔ مَیں مسلمان ہوں تم بھی مسلمان ہو۔ مَیں اس قسم کا ڈاکو نہیں جیسا تم سمجھ رہے ہوں۔ مَیں ان ہندوؤں سے ایک غریب مسلمان لڑکی کی عزت کا انتقام لے رہا ہوں۔ اگر تم مجھے پولیس کے پاس لے گئے تو کیا کہو گے؟ مَیں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ مَیں نے اس ہندو سے کوئی پیسہ نہیں لیا۔ تھانے میں میری ایک بھی واردات نہیں ہے۔ تھانیدار میرے نام سے بھی واقف نہیں۔ مَیں نے انہیں ایک دھمکی دی ہے جس کا

کوئی ثبوت ہی نہیں۔ مَیں تھانے میں یہ بھی کہہ دوں گا کہ تم سب مجھے راستے میں روک کر لُوٹنا چاہتے تھے" ـــــ اُس نے ہم سے ہمارے گاؤں کا نام پوچھا۔ ہم نے بتایا تو اُس نے میرے والد صاحب، افضل اور شاہبانہ خان کے والد صاحبان کے نام لے کر کہا ـــــ "تم میں اُن تینوں کا کوئی بیٹا بھتیجا ہے؟"

ہم تینوں نے بتایا کہ ہم اُن کے بیٹے ہیں تو شانو نے کہا ـــــ "لعنت ہے تم پر۔ تمہارے باپ تو اتنے بے غیرت نہیں"۔ اُس نے ہمیں ایک درخت کے نیچے لے جا کر بٹھایا اور خود ہمارے درمیان بیٹھ گیا۔ الیشر داس کو بھی اُس نے ہمارے ساتھ بٹھایا، اور بجلی بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ شانو نے ہمیں جو قصّہ سُنایا وہ یُوں تھا کہ نرائن چند کے گاؤں کے ایک کمہار نے اپنی بیوی کے مرنے پر نرائن چند سے دو سو روپیہ سُود پر قرض لیا تھا۔ چونکہ کمہار کے پاس گروی رکھنے کے لیے زیور نہیں تھا اس لیے نرائن چند نے سود زیادہ مقرر کیا۔ کمہار کی برادری بہت تھی۔ ماتم پر اُسے ساری برادری کو روٹی دینی تھی۔ دوسرے اخراجات کے علاوہ چالیسویں کے اخراجات بھی تھے۔ غریب آدمی کے پاس پلّے کچھ بھی نہ تھا۔ اُس نے سُود پر قرض لے لیا۔ قرض لیے دو سال ہو گئے تھے۔ کمہار کچھ نہ کچھ ادائیگی کرتا رہا لیکن رقم دو سو سے کم ہونے کی بجائے چار سَو سے اُوپر ہو گئی۔ کمہار کے گھر جب دانے آتے (جو اُسے گاؤں کی بڑی ذاتوں سے ملتے تھے) وہ نرائن چند لے جاتا اور اپنی مرضی سے ان کی قیمت مقرر کرتا۔ کمہار کو کہیں سے دو چار روپے مل جاتے تو وہ بھی نرائن چند لے جاتا۔

کمہار کا دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اُس کی ایک بیٹی جوان تھی جس کی شادی ہو جانی چاہیے تھی مگر گھر میں ایک پیسہ نہیں تھا۔ وہ سارے گاؤں کی خدمت کرتا لیکن ساری آمدنی

نرائن چند کے گھر چلی جاتی۔ ایک روز نرائن چند نے اُسے کہا کہ وہ اپنی بیٹی کو اُس کے گھر کام کاج کے لیے بھیج دیا کرے اور وہ لڑکی کی مزدوری یا تنخواہ قرضے کی ادائیگی میں لکھ لیا کرے گا۔ کمہار مان گیا۔ اس کی بیٹی نرائن چند کے گھر جانے لگی۔ چند دنوں بعد لڑکی روتی ہوئی گھر آئی۔ اُس نے باپ سے کہا کہ وہ آئندہ اس ہندو کے گھر نہیں جائے گی۔ باپ نے وجہ پوچھی تو وہ روتی ہی رہی۔ وجہ صاف تھی۔ نرائن چند نے اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ کمہار نے برادری کے دو تین آدمیوں کو بتایا۔ وہ سب غریب تھے۔ ہندو ساہوکار سے انتقام لینے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ بڑی ذاتوں والے مسلمان اس ہندو کی بہت عزت کرتے تھے۔

شانو بھی ذات کا کمہار تھا اور وہ بدمعاش تھا۔ دلیر بھی تھا۔ وہ کسی اور گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اُس نے اپنی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ برادری کے آدمیوں نے اس کمہار کو مشورہ دیا کہ وہ شانو سے بات کرے۔ کمہار شانو کے پاس گیا اور اُس کے آگے بہت رویا۔ شانو نے اُسے کہا کہ وہ ایسا بندوبست کرے گا کہ ایک ہی بار اُس کا قرض بھی ادا ہو جائے گا اور اُس کی بیٹی کی بے عزتی کا بدلہ بھی لے لیا جائے گا۔ شانو کی دوستی جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ تھی۔ اُس نے ان سے مدد مانگی۔ انہوں نے اُسے مشورہ دیا کہ نرائن چند کو پیغام بھیجو کہ دس ہزار روپیہ نقد فلاں جگہ پہنچا دے ورنہ اُس کے گھر ڈاکہ پڑے گا اور اُس کی بیٹی کو اغوا کر لیا جائے گا۔

شانو نے پیغام بھجوا دیا۔ اپنا نام بھی بتا دیا۔ پیغام لے جانے والا ان دونوں میں سے ایک تھا جو اُس کے ساتھ تھے۔ اصل جرائم پیشہ یہ دونوں تھے۔ شانو نے دس ہزار روپوں کی تقسیم اس طرح سوچی تھی کہ دو دو ہزار روپیہ ان دونوں کو دے گا۔ دو ہزار خود رکھے گا

اور باقی چار ہزار کمہار کو دے گا جس سے وہ قرض بھی ادا کر دے گا اور اپنی بیٹی کی شادی بھی کرے گا۔ پھر ایشر داس شانو سے ملا اور اُسے کہا کہ وہ رقم میں کچھ رعایت کر دے جو اُس نے نہ کی۔ اُس نے ایشر داس کو جگہ بتا دی۔ دن اور وقت بھی مقرر کر دیا اور کہا کہ اگر اُسے پکڑوانے کی کوشش کی گئی تو وہ نرائن چند اور ایشر داس کے گھر کے بچے بچے کو قتل کر دے گا" ـــــ اس کے بعد جو ہُوا وہ مَیں آپ کو سُنا چکا ہوں۔

"مَیں ذات کا کمہار ہوں اور میری غیرت دیکھو" ـــــ شانو نے کہا ـــــ "تم اونچی ذاتوں والے ہو۔ تم میں غیرت زیادہ ہونی چاہیے لیکن اس گاؤں کے راجوں راجپوتوں کی موجودگی میں ایک کمہار کی عزت غریت کی وجہ سے لُٹ گئی۔ وہ اُن سب کی خدمت کرتا ہے لیکن کسی نے اس سے نہ پُوچھا کہ وہ بیوی کے مرنے پر ساری برادری کو کھانا کہاں سے دے گا اور بیٹی کا جہیز کہاں سے بنائے گا۔ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس غریب کا خون ایک ہندو چُوس رہا ہے۔ اب میں اُس کی مدد کرنے آیا ہوں اور تم ایک ہندو کے ساتھ مل کر مجھے پکڑنے آئے ہو"۔

ہم نے بھڑک کر اُسے صاف بتا دیا کہ ایشر داس نے ہمیں کیا کہا اور کس طرح اپنے ساتھ لایا ہے۔ ایشر داس ہمارے پاس بیٹھا سُن رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ہماری نیت بدل گئی ہے تو وہ خوف سے کانپنے لگا۔ شانو نے اُسے کہا ـــــ "تم مجھے دھوکہ دینے آئے تھے۔ اب سُن لو۔ جو کچھ ہُوا ہے وہ بھول جاؤ۔ اگر تم نے کہیں زبان کھولی یا گھر میں بیٹھ کر بھی کسی سے ذکر کیا تو تمہارے سارے خاندان کی خیر نہیں"۔

ایشر داس نے پہلے تو ہاتھ جوڑے پھر سر شانو کے پاؤں پر رکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ہمارے جن بچّوں نے ہندوؤں کو نہیں دیکھا وہ تصوّر میں بھی نہیں لا سکتے کہ ہندو کتنے بزدل ہوتے ہیں۔ شانو نے مجھے اور شاہباز خان کو الگ لے جا کر کہا۔

"تم نے میری بات سمجھ لی ہے۔ مَیں ساری عمر تمہارا احسان مند رہوں گا۔ مَیں نرائن چند سے بڑا خوفناک انتقام لوں گا اور تم سے یہ اُمید رکھوں گا کہ اپنے ماں باپ کو بھی نہیں بتاؤ گے کہ تم مجھے جانتے ہو۔"

ہم نے غیرت کے جوش میں آکر اُسے یقین دلایا کہ ہم یہ راز اپنے دلوں میں دفن کر دیں گے۔ آج اس راز کو جاننے والے صرف دو آدمی زندہ ہیں۔ ایک شاہباز ہے اور ایک میں۔ آج پہلی بار یہ راز دل سے نکالا ہے جب شانو بھی اس دنیا میں نہیں۔ نرائن چند اور ایشر داس بھی نہیں۔ اُن کی اولاد ہندوستان چلی گئی ہے اور میرے وہ تمام دوست اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں جو اس راز میں شریک تھے... شانو نے ہمیں کہا کہ ایشر داس کو ڈراتے رہنا یہاں سے جا کر یہ نرائن چند سے نہ ملے اور کسی سے آج کے واقعہ کی بات نہ کرے۔

ہم نے شانو سے پوچھا کہ اُسے بھینسا کہاں سے ملا تھا۔ اُس نے بتایا کہ بھینسا راستے میں بیٹھا پھنکار رہا تھا۔ شانو نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کسی کی بھینس کھُل کر آگئی ہے۔ چلو اسے گھیر لے چلیں گے۔ اس کے قریب گئے تو بھینسا اُٹھ کھڑا ہوا اور شانو کے پیچھے پڑ گیا۔

ایک تو شانو نے کمار کی بیٹی کی بات سُنا کر ہمیں بھڑکا دیا تھا۔ دوسرے اُس کی دلیری نے ہمیں اپنا گرویدہ بنایا جس سے اُس نے ہمارے ساتھ بھینسے کا مقابلہ کیا تھا۔ وہ تو بھینسے کی پیٹھ پر چڑھ بیٹھا تھا۔ ہم اُس سے رخصت ہوئے۔ ہمیں ڈر تھا تو صرف یہ کہ ایشر داس بھانڈا پھوڑ دے گا۔ اس کی پیش بندی یہ کی کہ گاؤں پہنچنے تک ہم اسے ڈراتے رہے۔ اُس کی خوفزدگی کا یہ عالم تھا کہ ہر پندرہ بیس قدم پر رُک کر پوچھتا تھا ـــــ "شانو میرے گھر تو ڈاکہ نہیں ڈالے گا؟... اُس نے تمہیں کہا تھا کہ مَیں ایشر داس کو صاف کر دوں گا؟" ـــــ اُس کے سوالوں کے جواب میں ہم اسے دہشت زدہ کرتے رہے۔ اُس نے اپنے بھگوان اور پرماتما

اور دیوتاؤں کی قسمیں کھائیں کہ وہ کسی سے کوئی بات نہیں کرے گا اور وہ نرائن چند سے نہیں ملے گا۔ گاؤں سے دُور ہی ہم نے اُسے الگ کر دیا تاکہ گاؤں والے یہ نہ دیکھ سکیں کہ وہ ہمارے ساتھ گیا تھا۔ گاؤں والوں کو ہم نے بھینسے کے شکار کی کہانی سنائی۔

ہم نے ایشر داس پر نظر رکھی۔ تیسرے روز خبر ملی کہ تین کوس دُور ایک گاؤں میں ایک ہندو ساہوکار کے گھر ڈاکہ پڑا ہے۔ ڈاکو نقدی اور زیورات لے گئے ہیں اور ہندو کی جوان بیٹی کو بھی اُٹھا لے گئے ہیں۔ اس خبر نے ہمارے گاؤں میں سنسنی پھیلا دی۔ ہم جانتے تھے شانو نے نرائن چند سے انتقام لے لیا ہے۔ ہم ایشر داس سے ملے۔ اُس کا رنگ لاش جیسا ہو گیا تھا۔ مَیں نے اسے کہا ــــ "لالہ جی! آپ کی بھی ایک بیٹی جوان ہے۔ کوئی بات منہ سے نہ نکلے" ــــ اُس کے منہ سے سخت گھبراہٹ ہوئی یہ آواز نکلی ــــ "شانو اِدھر تو نہیں آئیگا"

"اگر تم ہلے بولے تو شانو اِدھر ضرور آئے گا" مَیں نے جواب دیا۔

وہ واقعی نہ بولا۔ نرائن چند اُس سے یہ گواہی دلوانے آیا کہ وہ شانو کی دھمکی اور اُس کے ساتھ ملاقات کی تصدیق کر دے لیکن اُس نے یہی رٹ لگائے رکھی کہ اُس کا اس واردات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور وہ کسی شانو کو نہیں جانتا۔ پولیس آتی رہی۔ تفتیش ہوتی رہی۔ دس بارہ دنوں بعد رات کے وقت نرائن چند کی بیٹی گھر آگئی۔ بہت بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ لڑکی کی جسمانی حالت بہت بُری تھی۔ اُس نے گھر میں داخل ہو کر صرف یہ کہا کہ ایک آدمی اُسے گھوڑے پر بٹھا کر گھر کے سامنے اُتار گیا ہے۔ اتنے دن اُس کے ساتھ جو بیتی تھی وہ بتائے بغیر مر گئی۔ پولیس نے بہت مشتبہ لوگ پکڑے۔ انہیں خوب مارا پیٹا مگر اصل مجرم ہاتھ نہ آیا۔ شانو کے جرائم پیشہ دوست اُستاد معلوم ہوتے تھے۔

حاجی اور حاجی کا ڈبو

چاندنی میں اپنے سائے کو بھی وہ ناگ
سمجھتی تھی۔ آدھی رات اور جنگل بیابان۔
اُسے چڑیلیں، جن اور بھوت نظر آنے
لگے۔ اُسے یہ احساس ڈرا رہا تھا کہ وہ
نوجوان اور خوبصورت لڑکی ہے۔

میری محفل کی ایک اور شمع بجھ گئی ہے۔ پچھلے مہینے راولپنڈی سے تار ملا۔ انگریزی کے دو لفظوں کے اِس تار نے جیسے میری رُوح اور جسم کے تار توڑ دیئے ہیں۔ تار میں لکھا تھا ـــــ "حاجی مر گیا ہے" ـــــ حاجی میرا دوست تھا، ہم عمر تھا، بہت دلیر اور غیرت مند تھا۔ وہ حاجی نہیں تھا۔ اُس کا نام حاجی محمد تھا۔ مَیں اپنے بچّوں اور ان کے بچّوں کی عید پوری کرنے کے لیے یہاں شہر میں آجاتا ہوں مگر اتنے بڑے اور اتنی زیادہ رونق والے شہر میں جی لگتا نہیں۔ انسان اپنی مٹی میں ہی خوش رہتا ہے۔ بچّوں سے حیلے بہانے کر کے گاؤں چلا جاتا ہوں۔ راجہ شاہباز خان میری محفل کی آخری شمع ہے۔ معلوم نہیں اب اُس کی باری ہے یا میری۔ شاہباز نے مجھے کئی بار کہا ہے ـــــ "صابر! تم میرے جنازے پر نہیں آؤ گے۔ شہر جانا چھوڑ دو" ـــــ جی میں آتی ہے کہ مریں تو دونوں اکٹھے مریں۔ آپ نے میری کہانیوں میں پڑھا ہوگا کہ جوانی میں ہم دونوں نے کئی بار اکٹھے مرنے کی کوشش کی ہے۔ ہماری جوانی کے کھیل تو خودکشی کی ایک مسلسل کوشش تھی جو کامیاب نہیں ہوئی۔ اس کوشش کا حاصل یہ کہانیاں ہیں جو آپ کو سناتا رہتا ہوں۔

اب حاجی مر گیا ہے تو مَیں اُس کی کہانی بھی سُنا دیتا ہوں۔ سنانے سے پہلے مَیں ایک

کہنا تو بات کہنا چاہتا ہوں جو یہ ہے کہ ہمارے دیہات میں ایسی بے شمار کہانیاں ہیں جیسی میں آپ کو سنایا کرتا ہوں۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ صرف میری اور میرے دوستوں کی زندگی میں ایسے عجیب و غریب واقعات ہوئے ہیں۔ اگر آپ ہمت کریں تو شجاعت، خلوص، محبت اور ایثار کی آپ کو بیسیوں کیا سینکڑوں کہانیاں مل جائیں گی، لیکن ذرا جلدی کریں کیونکہ یہ واردا تیں میری عمر کے بوڑھوں کے سینوں میں دفن ہیں اور ان بوڑھوں کے کفن دفن میں تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں۔ میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ ہماری اُس نسل کے لیے جو انگریزی تہذیب و تمدّن اور فیشن میں پیدا ہوئی ہے، یہ کہانیاں قابلِ یقین نہیں ہوں گی۔ یہ بچے ایسا سمجھنے میں حق بجانب ہیں کیونکہ اب کوئی کسی کے لیے جان نہیں دیتا، کوئی کسی کے لیے قربانی نہیں دیتا، خلوص اور ایثار کا رواج نہیں رہا۔ اب فلمی کہانیاں رہ گئی ہیں اور جسے دیکھو وہ فلمی ہیرو بننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ مردانگی نہیں رہی جو مسلمان کے بچے کا شیوہ تھا اور وہ حجاب نہیں رہا جو مسلمان کی بچی کا زیور تھا۔

میں اُس وقت نوجوان تھا۔ میرے ہمجولی نوجوان تھے۔ موسم بہار کا آغاز تھا اور ہمارے شکار کا موسم تھا۔ پوٹھوہار کی سردی کڑاکے کی ہوتی ہے۔ دس گیارہ بجے تک سورج بھی ٹھٹھرتا رہتا ہے۔ میری جوانی کا وہ موسم بہار شروع ہوا تو ایک صبح ہم نے کتوں کو نکالا۔ ماؤں نے ہمیں اُن دعاؤں سے رخصت کیا جو گالیوں اور بددعاؤں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ ہم کبھی شکار سے باز نہ آئے اور مائیں گالیوں سے باز نہ آئیں۔ موسم بہار میں ہم شکار کو جایا کرتے تو مائیں ہمیں یہ کہہ کر ڈرایا کرتی تھیں کہ ان دنوں بھیڑیا اور جانور انڈے بچے دیتے ہیں۔ اُن کی بددعائیں نہ لو، لیکن ہمیں یقین تھا کہ مائیں ہمیں گالیاں دے کر چوری چھپے دعائیں ضرور دیتی ہیں، اس لیے ہمیں کسی کی بددعا کا ڈر

نہ تھا۔

ہم حسبِ معمول بہت دُور نکل گئے۔ کتوں نے تین خرگوش مار کر کھا لیے اور ہم دوڑ دوڑ کر ہلکان ہو گئے۔ ایک جگہ بیٹھ کر سب نے اپنے اپنے پراٹھے نکالے۔ چار پانچ دوست مرغیاں بھُون کر لائے تھے۔ کسی کے پاس انڈے تھے اور کوئی سرسوں کا ساگ پکوا لایا تھا۔ اتنی زیادہ تھکان میں مل بیٹھ کر کھانے میں عجیب لطف آتا تھا۔ کُتّے اِدھر اُدھر کھیل کود رہے تھے۔ ہمیں دُور سے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے دو کُتّے لڑ رہے ہوں۔ اُدھر گہرائی تھی۔ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ہمارے کُتّوں نے کان کھڑے کر لیے۔ ہم نے انہیں دیکھا۔ وہ پورے تھے۔ کوئی کُتّا غیر حاضر نہیں تھا۔ لڑنے کی آوازیں قریب آنے لگیں۔ ہم نے اُدھر دیکھا۔ وہ علاقہ اُس زمانے میں بیابان تھا۔ کھڈ زیادہ تھے۔ سیدھے کھڑے مٹی کے ٹیلے بھی تھے۔ بارشوں کے پانی نے زمین کو کاٹ کاٹ کر ایسی غاریں بنا رکھی تھیں جن کے منہ اُوپر بھی تھے اور اُس طرف بھی جہاں سے پانی زمین کو کھا کھا کر باہر نکلتا تھا۔ پانی کی ایسی زمین دوز گذرگاہیں بھول بھلیاں سی بن جاتی تھیں۔ پانی کے لیے یہ راستہ جنگلی چوہے بنایا کرتے تھے۔ جنگلی چوہے اتنے بڑے ہوتے تھے کہ دو چوہے ایک بلّی کو آسانی سے پکڑ کر مار سکتے تھے۔ اِن کے بِل اندر سے فراخ ہوتے تھے۔ اِن بلوں میں بارش کا پانی جا کر انہیں اتنا زیادہ فراخ کر دیتا تھا کہ ایک آدمی اس میں سے کہیں جھک کر اور کہیں کھڑا ہو کر گزر سکتا تھا۔ پانی کسی ٹیلے کے دامن سے جا نکلتا تھا۔

ان بلوں یا غاروں کی لمبائی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کوئی انسان ان کے اندر دُور تک جانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اس زیرِ زمین دنیا میں ہمارا شکار رہتا تھا جس میں کیدڑ، سہہ اور گوہ قابلِ ذکر ہیں۔ اور کہیں کہیں ایک دو بھیڑیے یا لومڑ

بھی نظر آجاتے تھے۔ اب وہاں کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔ آبادیاں زیادہ ہوگئی ہیں۔ بیابانوں میں رونق آگئی ہے... ہم کتّوں کی آوازیں سُن رہے تھے۔ ایک بڑی اچھی نسل کا لڑاکا کُتّا ہم سے کوئی ایک سو گز دُور زمین سے اُبھرا۔ اس کے پیچھے دو بھیڑیئے اُوپر آئے۔ کُتّا اکیلا تھا اس لیے دو بھیڑیوں کے سامنے ٹھہر نہ سکا ورنہ لڑنے والا کُتّا مقابلے کے بغیر بھاگتا نہیں۔ ایک بھیڑیئے نے اُس کے پہلو پر آکر اُس پر حملہ کیا۔ ہمارے کُتّوں نے ہمارے اشارے کا انتظار نہ کیا۔ ایک ہی بار دوڑ پڑے۔ وہ کُتّا ہماری طرف بھاگا آرہا تھا۔ ہمارے کتّوں کو دیکھ کر بھیڑیوں نے اُسے چھوڑ دیا اور پیچھے کو بھاگے۔ ایسا شکار ہمیں کبھی کبھی نظر آیا کرتا تھا۔ ہم کھانا وہیں پھینک کر کتّوں کے پیچھے دوڑے۔ وہ سب نیچے اُتر گئے تھے۔ نیچے وادی سی بنی ہوئی تھی جس کے سامنے والے کنارے پر کٹے پھٹے ٹیلے تھے۔ بھیڑیئے اُن میں کہیں غائب ہوگئے۔ ہمارے تازی کُتّے دوسرے کتّوں سے پہلے اُن کے پیچھے گم ہوگئے۔ ان کے بعد تمام کُتّے ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

ہمیں اپنی عمر کا ایک نوجوان نظر آیا جو وادی میں کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں بڑی خوبصورت کلہاڑی تھی۔ ہم نے اُس کی طرف توجہ نہ دی اور اپنے کُتّوں کے پیچھے چلے گئے۔ ایک جگہ عمودی اور خاصا اونچا ٹیلا اتنا کٹا ہُوا تھا کہ اندر وسیع جگہ تھی۔ بھیڑیوں کی بدقسمتی کہ وہ اس میں داخل ہوگئے تھے۔ دس کُتّوں میں اُن کی کیا وقعت تھی ہمارے پہنچنے تک کتّوں نے دو حصّوں میں تقسیم ہو کر انہیں پکڑ لیا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں وہ چیرے پھاڑے گئے۔ ہم نے کُتّوں کو اس شغل میں لگا رہنے دیا اور واپس آگئے۔ ہم اُس نوجوان کو دیکھنا چاہتے تھے جو وادی میں کلہاڑی لیے کھڑا تھا۔ وہ وادی سے نکل کر اُوپر چلا گیا تھا۔ اپنے کُتّے کو اُس نے پکڑ لیا تھا۔ ہم اُوپر گئے تو اُس کے کُتّے

کو خوفزدہ حالت میں دیکھا۔ کُتّے کا مالک بھی ڈرا ہُوا تھا۔ ہم نے سب سے پہلے اُس کے کُتّے کو دیکھا۔ اُس کے جسم پر خُون تھا لیکن زخم معمولی تھے۔ اُس کے مالک نے بتایا کہ وہ راستہ چھوٹا کرنے کے لیے نیچے سے گزر رہا تھا۔ اُس کا کُتّا آگے آگے جا رہا تھا۔ وہ بھونک کر ٹیلے کے کٹاؤ میں چلا گیا۔ مالک کو لڑنے، غرّانے اور بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں تو وہ سمجھا کہ شاید اُس کے کُتّے کو کوئی کُتّا مل گیا ہے۔

وہ دوڑ کر گیا تو کُتّا دو بھیڑیوں سے لڑ رہا تھا۔ بھیڑیئے شاید مالک کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ کُتّا چونکہ لڑنے والا تھا اس لیے مقابلہ کرتا رہا۔ بھیڑیوں نے اس پر بہت حملے کیے۔ وہ بچتا رہا۔ اُس نے ایک بھیڑیئے کی شہ رگ منہ میں لے لی لیکن دوسرے بھیڑیئے نے پیچھے سے اُس کی گردن میں دانت گاڑ دیئے۔ بھیڑیئے کا یہ داؤ خطرناک ہوتا ہے۔ وہ جھٹکا دے کر گردن کی ہڈی توڑ دیتا ہے۔ کُتّے نے دوسرے بھیڑیئے کی شہ رگ چھوڑ کر اپنی گردن چھڑا لی اور بھاگ اُٹھا۔ اس کے مالک نے بھیڑیوں کی خونخواری کے ڈر سے اُن پر کلہاڑی نہ چلائی۔ اُس نے بھیڑیئے پہلی بار دیکھے تھے اور اُن کی بہت خوفناک کہانیاں سُنی تھیں۔ ہم نے اسے یہ بتا کر تسلی دی کہ بھیڑیئے بلاوجہ حملہ نہیں کیا کرتے، بلکہ انسان کو دیکھ کر بھاگ جاتے ہیں... ہم اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ ہمارا کھانا بہت سے کوّے، چڑیاں اور دو چیلیں کھا رہی تھیں۔ پراٹھے بکھرے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ایک کوّے نے ایک پورا پراٹھا منہ میں لے کر اُڑنے کی کوشش کی لیکن اپنے وزن جتنا پراٹھا اُٹھا نہ سکا اور مایوسی کے عالم میں اُڑ گیا۔ چیلیں فاصلے پر رہیں۔ وہ مرغی کی ایک ایک بوٹی پنجوں میں اُٹھا کر اُڑ گئیں۔ پیچھے جو بچا وہ ہم نے جھاڑ پونچھ لیا اور کُتّے کے مالک کو کھانے کی دعوت دی۔

اس نے اپنا نام حاجی محمد بتایا۔ گکھڑ ذات کا نوجوان تھا۔ ہمارے علاقے میں گکھڑ سب سے اُونچی ذات سمجھی جاتی ہے۔ ہمارا علاقہ اب بھی ذات پات کی گرفت میں ہے۔ تاہم یہ گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے۔ میری جوانی کے زمانے میں ذات پات کی پابندی بڑی ہی سخت تھی۔ یہاں تک کہ اُونچی ذات کا آدمی ان پڑھ اور گنوار کیوں نہ ہو، اُس سے نیچے کی ذات والا اُس کی برابری میں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ حاجی محمد امیر زمینداروں کا بیٹا تھا۔ اُس کا باپ صوبیداری پنشن آیا تھا۔ نہری علاقے میں اُسے ایک مربع زمین بھی ملی تھی۔ حاجی محمد کُتّوں کی باتیں کرنے لگا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے دو دوستوں کے پاس بڑے اچھّے کُتّے ہیں لیکن وہ کُتوں کو لڑاتے ہیں یا ساتھ لیے لیے پھرتے اور رات کو رکھوالی کے لیے کھُلا چھوڑ دیتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ وہ کُتوں کو شکار کی ٹریننگ دینا چاہتا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کو دو تین بار شکار پہ لے گیا لیکن شکار دکھائی دیا تو کُتّے آپس میں لڑ پڑے۔ وہ ہمارے کُتوں کو اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے ہم سب کو دعوت دی کہ ہم اُس کے گاؤں آئیں۔ کُتوں کو بھی لائیں اور اکٹھے شکار کو چلیں۔ ہم نے دعوت قبول کر لی اور دس روز بعد کا ایک دن مقرر کر لیا۔ ہم نے اُسے بتایا کہ ہم سورج نکلنے سے پہلے پہنچ جائیں گے۔

حاجی محمد خوبرو اور تنومند نوجوان تھا۔ اس کا گاؤں ہمارے گاؤں سے آٹھ میل دُور تھا۔ ہم جہاں بیٹھے تھے وہاں سے اس کا گاؤں اڑھائی تین میل دُور تھا۔ ہمارے کُتّے واپس آ گئے تھے۔ اُن کی تھوتھنیاں خون سے لال تھیں۔ ہم نے دیکھا کہ اِن میں سے کوئی بھی زخمی نہیں تھا۔ دو اجنبی کُتوں کی پہلی ملاقات ہنگامہ خیز ہُوا کرتی ہے۔ وہ غرّا کر علیک سلیک کرتے اور ایک دوسرے پر جھپٹ کر مصافحہ کرتے اور ایک دوسرے کو

بھنبھوڑ کر اظہار کرتے ہیں کہ دوستی کرنی ہے تو مجھے طاقتور مانو۔ اگر ان میں سے ایک کتا دُم اپنی ٹانگوں میں دبا کر بھاگ اُٹھے یا اپنے مالک کی ٹانگوں میں گھسنے کی کوشش کرے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُس نے امن کے معاہدے پر دستخط کر دیئے ہیں، لیکن کُتے کی نفسیات عجیب ہوتی ہے۔ پہلے ہمارے تمام کُتوں نے اُسے سونگھ کر اور معائنہ کر کے دیکھا کہ وہ نر کہ ہے یا مؤنث۔ انہیں جب اُس کی گریمر سمجھ آگئی تو پیچھے ہٹ کر انہوں نے جائزہ لیا کہ اس میں کُتے والا بیر رکھنے کی جرأت ہے یا نہیں۔ ہمیں توقع تھی کہ وہ اُس پر ٹوٹ پڑیں گے لیکن وہ کُتوں کے منہ سے منہ ملا رہا تھا جیسے اُن کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ انہوں نے اُسے بھیڑیوں سے بال بال بچایا تھا۔ وہ سب کے درمیان بیٹھ گیا۔ ہمارے کُتوں نے اُسے مظلوم سمجھ کر اُس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔

ہمارے کُتے تھکے ہوئے تھے۔ اِدھر اُدھر بیٹھ گئے۔ تب حاجی محمد کا کُتا اُٹھا اور ہمارے ہر ایک کُتے کو اِدھر اُدھر سے سُونگھ کر اپنی گریمر درست کرنے لگا۔ آخر میں وہ ہمارے بُوہلی کے قریب گیا۔ بُوہلی ہمارا بڑا ہی خونخوار کُتا تھا۔ مَیں اُس کی کچھ کہانیاں آپ کو سُنا چکا ہوں۔ بوہلی نے اُس کی طرف توجہ نہ دی۔ وہ جب بُوہلی کی مُشک لینے کے لیے ناک اُس کی دُم کے قریب لے گیا تو بُوہلی کی غیرت بھڑک اُٹھی۔ اُس نے نہایت تیزی سے اُٹھ کر اُس پر حملہ کر دیا۔ میرے دوست افضل نے اُسے ڈانٹا تو بُوہلی رُک گیا۔ حاجی کا کُتا حاجی کے سامنے جا بیٹھا اور اُس کے منہ کی طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو، تم نے پہلے کیوں نہ بتا دیا؟ بُوہلی نے ایک ہی جھپٹے میں اُس کی گریمر درست کر دی تھی۔ حاجی محمد ہم سے پکا وعدہ لے کر چلا گیا۔

ہم بھی اپنے گاؤں کو چل دیئے۔ گاؤں میں ہم نے جب بتایا کہ ہم نے "بھگیاڑ" (بھیڑیئے) مارے ہیں تو لوگ ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ ہم بھیڑیئے کو اپنی زبان میں بھگیاڑ کہتے ہیں۔ آج کل کوئی بھیڑیا نظر نہیں آتا۔ اُس زمانے میں بھگیاڑ ببر شیر سے زیادہ خوفناک درندہ سمجھا جاتا تھا جس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ بھگیاڑ واقعی خوفناک درندہ تھا بلکہ صحیح وجہ یہ تھی کہ زیادہ تر لوگوں نے یہ درندہ کبھی دیکھا نہیں تھا۔ رات کو کبھی کبھی دُور سے اُس کی آواز آتی تھی جو ڈراؤنی سی لگتی تھی۔ مائیں بچّوں کو بھگیاڑ کے نام سے ڈرایا کرتی تھیں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ کوئی چیز اُس وقت تک خوفناک ہوتی ہے جب تک آپ اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اگر آپ اس کے آمنے سامنے آکر ذرا مقابلہ کر لیں تو اُس کے لیے آپ خوفناک بن جائیں گے۔ گاؤں والوں نے ہم سے پوچھنا شروع کر دیا کہ بھیڑیئے کیسے تھے اور ہم نے انہیں کیسے مارا ہے۔ ہم نے کچھ فالتو باتیں ملا کر کہانی کو سنسنی خیز بنا دیا۔ میری ماں نے بھی سُن لیا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اُس نے دانت پیس کر کہا ــــ "تُو باز نہ آیا اپنی کرتوت سے۔ تیرا کلیجہ بھگیاڑ کھائیں گے" ــــ اُس نے بڑے غصّے سے میرے ہاتھ سے کُتّے کی زنجیر چھینی اور اسے اپنی جگہ باندھ کر اُس کے آگے لسّی ڈالی۔ مَیں نے دیکھا کہ ماں کُتّے کو اِدھر اُدھر سے دیکھ رہی تھی کہ اسے کہیں زخم تو نہیں آیا۔ ماں کو اپنے بیٹے کے کُتّے سے بھی پیار ہوتا ہے۔

خدا خدا کر کے دسواں دن آیا۔ ہم بہت سویرے جاگے۔ ماں نے پراٹھے پکا دیئے۔ ہم تیرہ دوست تھے اور دس کُتّے۔ سحر کے اندھیرے میں حاجی محمد کے گاؤں کو روانہ ہو گئے۔ ہمیں آٹھ میل پیدل جانا تھا۔ گندم کے خوشے ہرے تھے اور ابھی فصل اُٹھ رہی تھی۔ اس میں سرسوں اور چھدلیا بھی تھا ــــ بہار کا موسم چھولیا کے لیے خطرناک ہوتا

ہے۔ سیاہ کالی گھٹائیں آتی ہیں۔ ان میں بجلی ہوتی ہے جو چمکتی اور کڑکتی ہے۔ چھوٹا اتنا نازک ہوتا ہے کہ بجلی کی چمک زیادہ ہو تو جل جاتا ہے۔ اسے "چمکارا" پڑ جانا کہتے ہیں۔ اس موسم میں ہمارے ہاں اولے بھی پڑتے ہیں جو گندم کے کھڑے پودوں کو توڑ دیتے ہیں۔ اُن دنوں بارشوں، اولوں اور بجلیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ اس میں ایک خطرہ اور بھی ہوتا ہے۔ عموماً بجلی ہرے درخت پر گرتی ہے۔ ہمیں بزرگ بتایا کرتے تھے کہ بجلی کڑکے تو کتنی ہی بارش کیوں نہ ہو کسی درخت کے نیچے کھڑے نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم چلے تو گئے لیکن خطرہ تھا کہ بارش ہمارا شکار خراب کرے گی۔ راولپنڈی کے علاقے کے لوگ وہاں کے موسم بہار کی بارشوں اور ژالہ باری سے اچھی طرح واقف ہیں۔

سورج نکلنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے جب ہم حاجی محمد کے گاؤں پہنچ گئے۔ ایک جگہ دس بارہ آدمی کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ دُور اتنی ہی عورتوں کو سر جوڑے کھڑے دیکھا۔ پتہ چلتا تھا جیسے گاؤں میں کوئی گڑبڑ ہے۔ حاجی محمد نے ہمیں آتا دیکھ لیا اور وہ ہمارے پاس آیا۔ اُس نے بتایا کہ رات کو ایک بڑی شریف لڑکی لاپتہ ہو گئی ہے۔ اُس کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی اور ابھی اُس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ حاجی محمد نے کہا کہ سارا گاؤں ماتم میں ہے اور غصّے میں بھی، اس لیئے شکار پر جانا اچھا نہیں لگتا، پھر کبھی سہی۔ ہم نے اپنے طور پر شکار پر جانے کا ارادہ کیا تو حاجی محمد نے کہا کہ وہ ہمیں اس طرح تو نہیں جانے دے گا۔ ہمارے انکار کے باوجود ہم سب کو گھر لے گیا۔ اپنے والد صاحب سے تعارف کرایا۔ وہ بڑے ہی پیار سے ملے۔ ہم سب سے باپوں کے نام پوچھے۔ وہ تقریباً سب سے واقف تھے۔ وہ مہمان نوازی اور رکھ رکھاؤ کا زمانہ تھا۔ گاؤں میں سب کو بھی پتہ چلا کہ مہمان آئے ہیں اور کتّے بھی ساتھ ہیں، وہ دُودھ لے آیا۔ ہمارے کتّوں

کے آگے مٹی کی تین کٹانیاں رکھ کر دودھ سے بھر دی گئیں۔ ہمارے آگے دودھ اور گھی میں تلے ہوئے پراٹھے اور انڈے رکھ دیئے گئے۔ اُس زمانے میں ابھی ہم نے چائے نہیں دیکھی تھی۔

اِس خاطر تواضع کے دوران حاجی محمد نے اپنے والد صاحب سے پوچھا کہ اِس حالت میں جب کہ گاؤں کی ایک لڑکی لاپتہ ہو گئی ہے اُسے شکار پر جانا چاہیے یا نہیں۔ والد صاحب نے اُسے اجازت دے دی اور کہا کہ وہ گاؤں میں رہ کر کیا کرے گا۔ حاجی محمد کے دوست بھی ہمارے ساتھ بیٹھے تھے، دوڑے گئے اور کُتے کھول لائے۔ اُن کے تین کُتے تھے۔ ہم شکار کو روانہ ہو گئے۔ ہم نے اُن کے کتوں کو غور سے نہ دیکھا۔ اتنا ہی دیکھا کہ وہ اچھی نسل کے تھے۔ گاؤں سے تین چار فرلانگ دُور جا کر ہم نے کتّوں کی زنجیریں کھول دیں۔ ہم چونکہ لڑکی کی گمشدگی کا قصہ سُن رہے تھے اس لیے کتّوں کی طرف دھیان نہ دیا۔ کُتے عموماً ہمارے آگے آگے جایا کرتے تھے لیکن اُس روز پیچھے تھے۔ اچانک اُن کے لڑنے کی آواز آئی۔ ہم نے پیچھے دیکھا تو ہمارا بُوہلی کتّا اور حاجی محمد کا کُتا ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ ہم نے دَوڑ کر چھڑایا اور انہیں زنجیریں ڈال دیں۔ دوسرے کُتوں کو دیکھا تو اُن کا رویّہ بھی بدلا بدلا سا دیکھا۔ شاہباز نے کہا ــــ "بیڑہ غرق۔ اِن کے ساتھ ایک کتیا ہے" ــــ تب ہم نے دیکھا کہ اُن کے تین کُتوں میں ایک کتیا تھی۔ ہمیں ایک بار بڑا ہی تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ ہم نے کُتیا کے مالک سے کہا کہ ہم یہیں انتظار کریں گے، تم بھاگ کر کُتیا گھر باندھ آؤ ورنہ کُتے ایک دوسرے کو شکار کر لیں گے۔

وہ ہماری بات سمجھ نہیں رہا تھا۔ افضل نے اسے پنڈلی ننگی کر کے دکھائی جس میں بڑے بھدّے زخم کا نشان تھا۔ اُس نے کُتے کے مالک کو بتایا کہ ایک بار اُس کے اپنے کُتے

نے ایک کُتیا کی خاطر اُس کی پنڈلی کاٹ کھائی تھی ۔ ہم میں سے کسی نے کہا " ہمارے کُتے سدھائے ہوئے ہیں مگر ہم اُن کی نیک چلنی کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ کُتیا کو گھر چھوڑ آؤ "۔ وہ مان گیا لیکن اُس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ اُس کی غیرت کو ٹھیس پہنچی ہے۔ اپنی کُتیا پر ہمارے کُتوں کی دست درازی اور چھیڑ خانی پر وہ برہم نظر آتا تھا۔ وہ چلا گیا۔ گاؤں سامنے نظر آرہا تھا۔ ہم اُس کے انتظار میں رُکے رہے ۔ بہت دیر انتظار کیا مگر وہ نہ آیا۔ ہم آگے چلے گئے۔

حاجی محمد ہمیں لڑکی کے متعلق بتا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ نکل جانے والی لڑکی نہیں تھی۔ ہمارے وقتوں میں آج والی آزادی کا تصور ہی نہیں تھا۔ کبھی کبھی کوئی ایسا واقعہ سُننے میں آتا تھا کہ کوئی لڑکی کسی کے ساتھ گھر سے نکل گئی ہے لیکن ایسی لڑکیوں اور عورتوں کے خاندان بھی ایسے ویسے ہی ہوتے تھے۔ عزّت دار گھرانوں میں ایسے واقعات نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہ قسم نہیں کھائی جا سکتی کہ کسی کے دل میں کیا تھا۔ البتہ عشق و محبت کا ڈرامہ چھپایا نہیں جا سکتا۔ اس کی سزا موت ہوتی تھی اور خاندانوں کی دشمنی نسلوں تک چلتی تھی۔ اغوا کی وارداتیں بھی کم ہی سننے میں آتی تھیں۔ گاؤں کی لڑکی سارے گاؤں کی بیٹی سمجھی جاتی تھی۔ لڑکیاں اور لڑکے جوانی میں بھی اکھٹے کھیلا کرتے تھے۔ آج کل منہ بولے بہن بھائی کا رواج ہی نہیں۔ جنس آسیب کی طرح سوار ہو گئی ہے۔ میری جوانی میں منہ بولے بہن بھائی اکثر سننے میں آتے تھے ۔ آج کل شہروں میں تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ مَیں نے جوان لڑکیوں کے باپوں کو کہتے سُنا ہے ــــ " اجی آج کل کون کسی کے چال چلن کی قسم کھا سکتا ہے "۔ یعنی حالت یہ ہو گئی ہے کہ جس طرح ہم اپنے کتّوں کی نیک چلنی کی ضمانت نہیں دے سکتے تھے اسی طرح آج کل اپنی اولاد کے چال چلن کی کوئی قسم نہیں کھا سکتا۔

حاجی محمد ہمیں بتا رہا تھا کہ یہ لڑکی ایسی ویسی نہیں تھی۔ عورتوں کی نظر بڑی گہری ہوتی ہے۔ وہ شک والی بات بھی یقین کے رنگ میں بیان کیا کرتی ہیں، لیکن حاجی محمد نے بتایا کہ اس لڑکی کے متعلق گاؤں کی عورتیں بھی قسم کھاتی ہیں کہ شریف لڑکی تھی۔ البتہ گاؤں کی لڑکیوں کی طرح شوخیاں ضرور کرتی تھی۔ کھیتوں میں لڑکیوں کے ساتھ بھاگتی دوڑتی تھی۔ منہ پھٹ نہیں تھی لیکن کھل کر بات کرتی تھی۔ اُس کا رشتہ طے ہو چکا تھا۔ ابھی منگنی نہیں ہوئی تھی۔ حاجی محمد کو اس لڑکی کے متعلق بہت زیادہ افسوس تھا اور وہ یہاں تک کہتا تھا کہ اگر اُسے بھنک بھی مل جائے کہ اسے کون لے گیا ہے تو وہ اُس کے سارے خاندان کو قتل کر دے۔ اُس نے لڑکی کے ساتھ اپنی وابستگی یہ بتائی کہ حاجی محمد چھ سات سال گزرے کُتے کا ایک بچّہ لایا۔ وہ یہی کُتا تھا جو اب اُس کے ساتھ تھا۔ اُس وقت اِس لڑکی کی عمر دس گیارہ سال اور حاجی محمد کی چودہ پندرہ سال تھی۔ لڑکی اُس کے گھر آتی ہی رہتی تھی۔ وہ اکٹھے کھیلے بھی تھے لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں تھی کیونکہ گاؤں کے لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے کھیلا ہی کرتے تھے۔ اس لڑکی کو کُتے کے پلّے کے ساتھ پیار ہو گیا تھا۔ وہ حاجی محمد کے گھر جا کر پلّے کے ساتھ کھیلتی رہتی تھی۔

حاجی محمد، لڑکی اور یہ کُتا اکٹھے جوان ہوئے۔ کتّا بڑا ہو کر لڑاکا نکلا۔ رکھوالی میں اور زیادہ خونخوار ہو جاتا تھا۔ اُس نے لڑائی میں دوسرے دیہات کے اچھے اچھے لڑنے والے کُتوں کو شکست دی اور شہرت پائی تھی۔ ایک بار ایک بھینس کے پاس سے گزرتے بھینس نے دُم گھمائی تو اتفاق سے کُتے کو لگ گئی۔ کُتے نے بھینس کی پچھلی ٹانگ میں دانت گاڑ دیئے۔ بھینس بھاگ اُٹھی اور کُتے کو ذرا مشکل سے ہی قابو میں کیا گیا۔ حاجی محمد کو معلوم نہیں تھا کہ کُتے کو کس طرح سدھایا جاتا ہے۔ اُس نے کُتے کو خراب کر دیا تھا۔ گھر میں گاؤں کا

کوئی فرد آئے تو بھی غراتا اور بھونکتا تھا۔ آپ سُن کر حیران ہوں گے کہ گاؤں میں رکھوالی کے لیے جو کُتّے رات کو کھُلے چھوڑے جاتے ہیں وہ اندھیرے میں بھی گاؤں کے ہر ایک فرد کو پہچان لیتے ہیں۔ ہر ایک کی بُو اور آواز سے واقف ہوتے ہیں۔ کسی اجنبی کو نہیں بخشتے، مگر حاجی محمد کے کُتّے سے سب ڈرتے تھے۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے گھر کے افراد کے علاوہ صرف یہ لڑکی تھی جسے دیکھ کر کُتا دُم ہلاتا اور بے تاب ہوتا تھا کہ لڑکی اُس کے پاس آئے۔ لڑکی اُسے دودھ پلاتی تھی۔ اُس کے ساتھ کھیلتی تھی۔ حاجی محمد نے بتایا کہ کل بھی لڑکی کُتے کے ساتھ کھیلتی رہی تھی۔

ظاہر ہے کہ لڑکی کے دل میں حاجی محمد کا پیار بھی تھا مگر اس میں شک والی کوئی بات نہیں تھی دونوں کے والدین کو کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ اُن کی ملاقاتیں چوری چھپے کی نہیں تھیں۔ ذات کے لحاظ سے لڑکی کا خاندان حاجی محمد سے دو درجے نیچے تھا اس لیے اُن کی شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ حاجی محمد نے شادی کی سوچی بھی نہیں تھی۔ لڑکی نوجوان تو تھی ہی، وہ خوبصورت کچھ زیادہ ہی تھی۔ اور یہی اُس کے اغوا کا باعث بنا۔ حاجی محمد اور اُس کے دوستوں کی رائے بھی یہی تھی۔ وہ بہت بھڑکے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ گاؤں کا ہر ایک مرد سخت غصّے میں ہے۔ گاؤں کے بزرگ اس مسئلے پر باتیں کر رہے تھے کہ اس علاقے میں جو تین چار رہزن اور ڈاکو ہیں انہیں ملا جائے اور اُن سے لڑکی واپس لی جائے۔ یہ کام انہی میں سے کسی کا ہو سکتا تھا۔ کوئی اور لڑکی کی مرضی کے بغیر ایسی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھی زیرِ بحث آیا کہ پولیس کو رپورٹ دی جائے یا نہیں۔ اس کے متعلق بزرگوں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ گاؤں کے مرد تلاش اور تعاقب اپنے طور پر کرنا چاہتے تھے۔ یہ سارے گاؤں کی عزت کا معاملہ تھا۔

ہم چلے جارہے تھے۔ اس علاقے میں ہم کبھی نہیں آئے تھے۔ زیادہ دشوار گزار علاقہ تھا۔ کٹے پھٹے، اُونچے نیچے ٹیلے زیادہ تھے۔ کہیں میدان تھا جو ذرا آگے جا کر یکلخت ختم ہو جاتا اور ہم کسی بڑے ہی اُونچے مکان کی منڈیر پر کھڑے محسوس کرتے۔ ایسی بلندی کہ شیشم اور پھلاہی کے درختوں کی چوٹیاں ہم سے نیچے ہوتیں۔ ان کھڑی دیواروں میں وہ غاریں تھیں جن میں سے دُور پیچھے سے یا کہیں اوپر سے پانی داخل ہو کر سیلابی ندی کی طرح گزرتا اور زمین دوز فراخ اور بلند چھتوں والے راستے بنا دیتا تھا۔ ایسے ہی ایک نشیب میں جو بہت وسیع تھا ہمیں ایک گوہ نظر آئی۔ گوہ سانڈے اور چھپکلی کی نسل کا جانور ہوتا ہے۔ منہ باریک اور تھوتھنی نوکیلی اور اس کی دُم ہنٹر کی طرح بڑی لمبی ہوتی ہے۔ اس کی کھال بڑی سخت اور پنجوں کی گرفت اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ پرانے زمانے کے ڈاکو اسے کمند کے طور سے استعمال کرتے تھے۔ مضبوط رسّے کا ایک سرا اس کی کمر کے گرد باندھ دیتے تھے۔ جس مکان پر چڑھنا ہو اس کے پچھواڑے سے گوہ کو اُوپر پھینکتے تھے۔ گوہ چھت پر پنجے گاڑ لیتی تھی۔ ذرا اس کی طاقت کا اندازہ کریں کہ ایک تنومند آدمی رسّہ پکڑ کر اور پاؤں دیوار کے ساتھ رکھ رکھ کر اُوپر چڑھ جاتا تھا، گوہ کے پنجے چھت سے نہیں اُکھڑتے تھے۔ اس کے دانت بہت تیز ہوتے ہیں اور یہ دُم کو اپنے دفاع میں ہنٹر کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ اچھا تندرست جوان آدمی اس کی دُم کی ضرب برداشت نہیں کر سکتا۔ ہمارا ایک دوست مارا بھی گیا تھا۔ یہ جانور حملہ نہیں کرتا۔ انسان کو دیکھ کر بھاگ جاتا ہے۔ اگر گھیرے میں آجائے تو بے حد خطرناک ہو جاتا ہے۔

ہم اُوپر رُکے ہوئے نیچے جانے کا راستہ دیکھ رہے تھے۔ نیچے درخت تھے اور گھاس۔ ہمیں گوہ نظر آئی۔ ناک کی نوک سے دُم کے آخری سرے تک اس کی لمبائی دو گز سے زیادہ

ہوگی۔ دُم جسم سے ڈیڑھ گُنا زیادہ تھی۔ اسے معلوم نہیں کیا نظر آیا کہ اُدھر کو دوڑی۔ دوسری طرف سے اتنی ہی بڑی ایک اور گوہ بہت ہی تیز رفتار سے آئی۔ وہاں شاید کوئی کھانے والی چیز تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر جھپٹ پڑیں۔ اُن کی دُموں کے زنّاٹے بڑے بھیانک تھے۔ ایک دوسری کو منہ ڈال کر الٹی ہوتی تھیں تو اُن کے سفید پیٹ نظر آجاتے تھے۔ یہی اُن کا نازک حصہ ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسری کے پیٹ میں پنجے گاڑ کر پیٹ چاک کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہم دیکھ نہ سکے کہ ہمارے کُتّے کس طرف سے نیچے اُتر گئے۔ یہ اُن کا مانوس شکار تھا۔ ہمیں توقع تھی کہ کُتّے انہیں بے خبری میں جا پکڑیں گے کیونکہ وہ آپس میں لڑ رہی تھیں لیکن انہیں خبر ہو گئی اور وہ اکٹھی ایک ہی سمت بھاگ اُٹھیں۔ گوہ کی رفتار بہت ہی تیز ہوتی ہے۔ کتّوں نے ان کا پیچھا کیا۔ ہم سب راستہ دیکھ کر نیچے اُترے۔ کُتّے بہت دُور نکل گئے تھے۔ اس نشیبی میدان میں جو عمودی ٹیلوں میں گھرا ہُوا تھا درخت گھاس اور جھاڑیاں تھیں اور سامنے مٹی کی ایسی دیوار تھی جس میں بڑے بڑے شگاف تھے۔ بعض شگاف اتنے وسیع کہ پہلو بہ پہلو دو آدمی گزر سکتے تھے۔ کُتّے شکار کے پیچھے وہاں کہیں غائب ہو گئے تھے۔

کُتّوں کی آوازوں پر ہم ایک وسیع شگاف میں چلے گئے۔ اس کے پیچھے چوکور، گول اور منحنی شکلوں کے لمبے لمبے ٹیلے کھڑے تھے۔ ان کے درمیان کھلی جگہ بھی تھی۔ کُتّوں نے دونوں گوہوں کو وہاں گھیر لیا تھا۔ گوہ بھاگنے کا کوئی راستہ نہ دیکھ کر مقابلے پر اُتر آئی تھیں۔ کُتّوں کے بھونکنے اور غرّانے کے شور میں گوہوں کے دُموں کے زنّاٹے الگ تھلگ سنائی دے رہے تھے۔ ہمارے کُتّے تو اِن سے واقف تھے، اس لیے اُن کے وار بچا رہے تھے۔ حاجی محمد کے دوست کا کُتّا اندھا دھند آگے چلا گیا۔ گوہ نے اُچھل کر اُس کی زبان اپنے باریک سے منہ میں

لے لی اور دونوں پنجے اُس کی آنکھوں میں گاڑ دیئے۔ کُتّے کا واویلا جگر چاک کرتا تھا، اور وہ سر کو زور زور سے جھٹکے دیتا تھا مگر گوہ کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اُس کے ساتھ اُلٹی سیدھی ہو رہی تھی الگ نہیں ہوتی تھی۔ کُتّے کے منہ اور آنکھوں سے خون جاری ہو گیا تھا۔ گوہ پیچھے سے حملہ کرنے والے کتّوں کو دُور رکھنے کے لیے دُم کو اس قدر شدّت سے گھماتی تھی کہ کُتّے اس کی آواز سے ہی دُور بھاگتے تھے۔ دوسری گوہ کو ہمارے چار کُتّوں نے اس قدر تھکا دیا تھا کہ ایک بار کسی کُتّے کے دھکّے سے اُلٹی ہو گئی۔ کتّوں نے اُسے سیدھا نہیں ہونے دیا۔ مِل کر اُس کا پیٹ چاک کر ڈالا لیکن دوسری گوہ نے جس کُتّے کو پکڑ رکھا تھا وہ جیت رہی تھی۔ کتا قلا بازیاں کھا رہا تھا اور اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔ اُس کا مالک اُسے بچانے کو آگے جاتا تھا تو راستے میں کُتّے آجاتے تھے۔ ہم نے اُسے خبردار کیا کہ گوہ کی دُم کی زد میں نہ آجائے مگر وہ اپنے کُتّے کو اس بُری حالت میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ایک بار آگے چلا گیا۔ اُدھر سے اُس کا کتا گوہ سمیت اُس کی طرف آگیا۔ کسی کُتّے کے دھکّے سے وہ گر پڑا اور اس کے ساتھ ہی اُس کی چیخ نکل گئی۔ اُسے گوہ کی دُم لگ گئی تھی۔ وہ کولہے سہلانے لگا۔ اُس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔

آخر اُس کے کُتّے کی ٹانگیں دوہری ہو گئیں اور وہ پیٹ کے بل گر پڑا۔ گوہ الٹی ہو کر اُس کے نیچے آگئی۔ میرے ایک دوست نے اُچھل کر اُس کی دم پر پاؤں رکھ دیے اور اس پر کھڑا ہو گیا۔ ہمارے کُتّوں نے اُس کے پہلوؤں میں دانت گاڑ کر بھنبھوڑا اور اس پر ایسا قابو پایا کہ کُتّے کو چھڑا لیا اور گوہ کو ختم کر دیا۔ کتا جو اُس کے منہ سے آزاد ہوا تھا بہت تیزی سے اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ وہ ہاتھ نہیں آتا تھا۔ اُسے اُوپر جانے کا راستہ مل گیا۔ وہ اُدھر بھاگا اور حاجی کا دوست اُس کے پیچھے گیا۔ ہم ابھی وہاں سے نہیں جا سکتے تھے کیونکہ

ہمارے کُتّے گوہوں کا خون پی رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم انہیں اُوپر لے گئے۔ حاجی محمد کا دوست اپنے کُتے کو پکڑ لایا تھا۔ اُس کی زبان سے خون ٹپک رہا تھا۔ اُس کی ایک آنکھ کا ڈھیلا نکل گیا اور دوسری آنکھ کے نیچے سے کھال اُدھڑ گئی تھی۔ ہم نے اُسے جو فسٹ ایڈ دی وہ یہ تھی کہ اُس کے زخموں پر پیشاب کیا جو سپرٹ کا کام کرتا ہے۔ زخموں پر مٹی ڈالی اور پگڑی پھاڑ کر پٹی باندھ دی۔ ہمارا یہ طریقہ کامیاب رہتا تھا۔ خون رُک جاتا تھا۔ گاؤں میں آکر ہم باقاعدہ مرہم پٹی کر دیا کرتے تھے۔

اُوپر کا علاقہ کچھ پتھریلا بھی تھا۔ سِلوں کی چٹانیں اور مٹی کے اُونچے ٹیلے تھے۔ درخت بھی تھے اور اُس سے دُور وہ پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں جو جہلم اور گوجر خان کے درمیان سلسلہ در سلسلہ پھیلی ہوئی ہیں۔ ہم حاجی محمد کے گاؤں سے پانچ چھ میل دُور آ گئے تھے۔ وہ جگہ بلند تھی۔ پیچھے دیکھا تو ہمیں پوٹھوہار کی وسعت نظر آئی۔ دُور گوجر خان کا شہر، دائیں طرف سوہاوہ نظر آ رہا تھا۔ کوئی جگہ ہموار نہیں تھی۔ بہت دُور اُفق پر کشمیر کے پہاڑ دکھائی دے رہے تھے جن کی چوٹیوں پر برف کی سفیدی تھی۔ گوجر خان کی طرف سے سیاہ گھٹا اُٹھی۔ ہمارے اُوپر بادلوں کے ٹکڑے تھے۔ گھٹا تیزی سے آ رہی تھی اور اُس کا سیاہ سایہ میلوں وسعت پر دوڑتا آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے منظر دھند میں چھپتا جا رہا تھا۔ یہ بارش تھی۔ بجلی بڑی زور سے چمکتی اور کڑکتی تھی۔ ہم چھپنے کی کوئی جگہ ڈھونڈنے لگے۔ دوڑتے ہوئے آگے چلے گئے۔ ایک جگہ ایک عمودی ٹیلا کھود کر کسی نے گُفا بنائی ہوئی تھی۔ کچھ لڑکے کُتوں کو لے کر اس میں چلے گئے۔ مَیں، حاجی محمد اور میرے دو دوست اس سے کچھ دُور ایک اور جگہ پناہ گزیں ہو گئے۔ وہاں چھپنے کی جگہوں کی کمی نہیں تھی۔ اگر آپ وہ علاقہ دیکھیں تو وہاں اُونٹ اور ہاتھی بھی چھپائے جا سکتے ہیں۔

بارش جو شروع ہوئی تو دو گز پرے کچھ نظر نہیں آتا تھا، اور بجلی کی کڑک سے دل دہلتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ژالہ باری شروع ہو گئی۔ کانچ کی گولیوں جتنے بڑے اولے تھے۔ تو گنگریوں کا مینہ تھا۔ ایک بار بجلی اتنے زور سے کڑکی کہ دل اُچھل کر حلق میں آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی مَیں نے ایک چیخ سُنی جو بارش اور اولوں میں دھیمی سی سُنائی دی۔ مَیں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ انہوں نے ایک چیخ سُنی ہے؟ ایک نے کہا کہ اگر میرے کان نہیں بجے تھے تو مَیں نے چیخ سُنی تھی۔ دوسرے نے کہا ــــ "تم دونوں کے کان بجے ہوں گے" ــــ تیسرے نے بھی کچھ نہیں سُنا تھا۔ بجلی قریب ہی گری تھی۔ ژالہ باری تھم گئی۔ مَیں نے محسوس کیا جیسے کوئی عورت رو رہی ہو۔ مَیں نے پھر ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ آپس میں گپ شپ لگا رہے تھے۔ مینہ بڑی ہی زور کا تھا۔ خوفناک تیز بجلی کے دھماکے تھے۔ اچانک ایسی چمک ہوئی جو دھوپ سے تیز تھی۔ گھٹا کا اندھیرا دو سیکنڈ کے لیے روشن ہو گیا۔ کوئی دو سو گز دُور ہمارے بالکل سامنے شیشم کے ایک درخت میں ہم نے سفید شعلہ چمکتا اور بُجھتا دیکھا۔ ایک ٹھن کڑکڑ کرتا نیچے آ رہا۔ یہ بجلی گری تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ اس دھماکے کے ساتھ ہی مَیں نے وہی چیخ سُنی۔ یہ چیخ میرے ساتھیوں نے بھی سُنی تھی، لیکن حاجی محمد نے کہا کہ بجلی کا شعلہ آسمان سے جب آیا تھا تو یہ اُس کی چیخ تھی۔ بات پھر دل ہو گئی۔ مَیں نے دونوں کانوں میں اُنگلی پھیری۔ میرے کان شاید بند ہو گئے تھے۔

تقریباً نصف گھنٹہ بعد بارش تھم گئی مگر جل تھل کر گئی۔ اسے ابھی اور برسنا تھا۔ میرے ایک دوست نے کُتوں کو دیکھ کر کہا ــــ "پیاسے ہیں۔ انہیں چھوڑ دو" ــــ بارش پانی بہت تھا۔ ہم نے کُتے کھول دیئے اور آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے کہ فوراً

واپس ہو چلیں یا مزید بارش کا انتظار کر کے چلیں۔ اس مسئلے پر بحث ہوتی رہی اور آ
کُتے پانی پی کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ ہم بھی پناہ سے نکلے اور دوسری پناہ میں ساتھیوں کو
دیکھنے گئے۔ حاجی محمد نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا کہ میرا کُتا نظر نہیں آ رہا۔ وہ ہم سے الگ ہو گ
ہے۔ وہاں قدرت نے سِلوں کی چٹانوں اور مٹی کی دیواروں اور ٹیلوں کی صورت میں نظر
سے اوجھل ہونے کا نہایت اچھا انتظام کر رکھا تھا۔ حاجی محمد بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا
مَیں ویسے ہی ٹہلتا ٹہلتا اپنے ساتھیوں سے پرے چلا گیا۔ حاجی محمد کیچڑ میں پھسلتا بڑ
تیزی سے میری طرف آیا۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ منہ کھُلا ہُوا تھا۔ مَیں اُس کی
گیا۔ اُس نے سرگوشی میں پوچھا — "تم نے کبھی چڑیل دیکھی ہے؟ چڑیلیں ہوتی ہیں نا؟"
مَیں نے پوچھا کہاں ہے؟ تو اس نے کہا "اِدھر آؤ یار! وہاں اندر کچھ ہے"۔
اُس کے پاس اپنی رنگدار دستے والی چمکتی ہوئی کلہاڑی تھی۔ مَیں اُس کے سا
گیا اور وہ مجھے کو لے گیا۔ وہاں مٹی اور ریتلے پتھروں کی اُونچی دیوار کھڑی تھی۔ اس
بہت چوڑا شگاف تھا۔ وہ مجھے اس کے قریب لے گیا۔ اس کا کُتا اس میں سے باہ
اسے دیکھ کر وہ عجیب سی آوازیں نکالتا اندر چلا گیا۔ یہ آوازیں دراصل عجیب نہیں
یہ کُتے کی مخصوص آوازیں ہوتی ہیں۔ وہ اپنے مالک کو کچھ بتانے یا دکھانے کی کوشش
کرتا ہے۔ کُتا اندر جا کر ایسی ہی آوازیں نکالتا واپس آ رہا تھا۔ ہمیں ایک زنانہ آ
سنائی دی — "ڈبّو" — یہ حاجی محمد کے کُتے کا نام تھا۔ اُس کے جسم پر چکیلے
سیاہ دھبّے تھے جنہیں ہم ڈب کہتے ہیں۔ یہ زنانہ آواز رو رہی تھی۔ اُس نے
ہوئے ڈبّو کہا تھا۔ حاجی محمد نے کہا — "کہتے ہیں جو انسان قتل کر دیا جاتا ہے
کی رُوح ویرانوں میں بھٹکتی رہتی ہے۔ یہ اُس کی روح ہے"۔

"کس کی؟"

"تاج کی۔" اُس نے جواب دیا ـــــ "وہ لڑکی جو اغوا ہوئی ہے۔ اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ اُس کی رُوح ہے۔"

اگر کوئی ایسی باتیں آج میرے ساتھ کرے تو مَیں نفرت سے منہ پھیر لوں مگر پسماندگی کے اُس دَور میں مجھ پر سنسنی طاری ہو گئی اور مَیں نے اُسے کہا ـــــ "ہاں حاجی! یہ بدرُوح ہے۔"

اندر سے رونے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی کُتا ایسی آوازیں نکالنے لگا جو پیار کا اظہار کرتی ہیں۔ مَیں نے جیب سے چاقو نکال لیا اور حاجی محمد سے کہا کہ کلہاڑی اُوپر کر لو۔ کہتے ہیں کہ لوہے کا چمکتا ہُوا ہتھیار ہاتھ میں ہو تو جن، چڑیل اور بدروحیں بھاگ جاتی ہیں۔ ہم دونوں نے کلمہ شریف پڑھنا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ راستہ دائیں کو مُڑتا تھا۔ حاجی محمد کا کُتا بے تابی سے دُم ہلاتا ہُوا آگے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ جونہی ہم دائیں گھومے، ہم سے سات آٹھ گز دُور ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی جو بہت ہی خوبصورت تھی۔ اُس کے اُوپر ٹیلے کی چھت سی تھی۔ حاجی محمد کا کُتا اُس کی ٹانگوں سے لپٹ لپٹ جا رہا تھا۔ مَیں اور حاجی محمد اونچی آواز سے کلمہ شریف پڑھے جا رہے تھے۔ لڑکی کی آنکھیں کھُلتی گئیں اور ٹھہر گئیں۔ اُس نے آہستہ سے کہا ـــــ "حاجی؟"

اُس کا سر ڈولا اور وہ گر پڑی۔

حاجی محمد نے خوف سے بوجھل آواز میں مجھے کہا ـــــ "یہ تاج ہے۔ اسے کہیں قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ اس کی رُوح ہے۔ کیا کریں صابو؟ بھاگ چلیں؟"

"اگر یہ رُوح یا بدرُوح ہوتی تو غائب ہو جاتی اور کُتا اس کے قریب نہ جاتا۔" مَیں

نے کہا ــــ "کتے، پڑیلوں اور بد روحوں کو دیکھ کر بھونکتے یا منہ آسمان کی طرف کر کے خوفناک آواز میں روتے ہیں۔" میری آواز کانپ رہی تھی۔ میں نے باہر جا کر سب کو بلا لیا اور ہمت کر کے میں آگے گیا۔ ڈرتے ڈرتے اور کلمہ شریف پڑھتے پڑھتے میں نے لڑکی کی نبض پر انگلی رکھی۔ وہ زندہ تھی۔ وہ کیچڑ میں پڑی تھی۔ اُسے اٹھا کر ہم نے پیچھے کر دیا۔ وہاں ٹیلے کی چھت تھی اور نیچے خشکی۔ بارش پھر برسنے لگی۔ حاجی نے اپنی پگڑی بارش میں کی۔ اچھی طرح بھیگ گئی تو لڑکی کے چہرے پر نچوڑی اور اس کے منہ میں بھی پگڑی نچوڑ کر پانی ڈالا۔ اُس نے جب آنکھیں کھولیں تو حاجی محمد اُس پر جھکا ہوا تھا۔ اُس نے کہا ــــ "تاج! زندہ ہو؟"

کچھ دیر بعد وہ پوری طرح ہوش میں آگئی۔ بہت ہی بُری طرح ڈری ہوئی تھی۔ وہ بیٹھ گئی۔ اُس نے حاجی محمد کے دونوں دوستوں کو بھی پہچان لیا۔ ہمارے متعلق حاجی محمد نے اُسے بتایا کہ اُس کے دوست ہیں۔ ایک لڑکے کے پاس ایک پراٹھا بچا ہوا تھا۔ اُسے دیا۔ اُس نے دو لقمے کھا کر پانی مانگا۔ اسے بارش کا پانی پگڑی بھگو کر پلایا۔ یہ ایک معجزہ تھا لیکن بہت ہی ڈراؤنا۔ ہم ڈر ڈر کر باتیں کر رہے تھے اور توقع یہ تھی کہ وہ ابھی غائب ہو جائے گی۔ اُس نے پوچھا کہ اُس کے گھر والے اور گاؤں والے کیا کہتے ہیں؟ حاجی محمد نے اُسے بتایا کہ ایسا شک کسی کو بھی نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ سارا گاؤں غصے میں ہے کہ اُسے اغوا کرنے والے کا سراغ مل جائے تو بے عزتی کا انتقام لیں۔ وہ روتی رہی۔ ہمارے تسلی دلاسے اور حوصلے پر اُس نے بتایا کہ اُس کے ساتھ کیا بیتی ہے۔

اُس روز یعنی گزشتہ روز اس کی سہیلی کی منگنی ہوئی تھی۔ دن کے وقت وہ گھر کی کسی

مصروفیت کی وجہ سے اُس کے گھر نہیں جا سکی تھی۔ شام کے بعد جب رات گہری ہو چکی تھی وہ سہیلی کو مبارک دینے گئی۔ وہ گھر گاؤں سے ہٹ کر تھا۔ درمیان میں تین چار کھیت تھے۔ کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لڑکیاں ڈرپوک بھی نہیں تھیں۔ وہ گھر دُور بھی نہیں تھا۔ سہیلی کے گھر اُسے کچھ دیر ہو گئی۔ واپس آنے لگی تو کھیتوں کے درمیان سے گزرنے کی بجائے وہ گھوم کر خالی کھیتوں میں سے گزری۔ آگے پگڈنڈی تھی۔ چاندنی صاف تھی۔ ایک گھوڑسوار آ رہا تھا۔ وہ لڑکی کے قریب آگیا۔ لڑکی پگڈنڈی پر رُک گئی۔ کنارا اُونچا تھا۔ چاندنی لڑکی کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ سوار نے چلتے چلتے اُسے دیکھا اور ذرا آگے جا کر رُک گیا۔ اُس نے لڑکی سے کہا ــــ "اِدھر آنا بہن۔ اس گاؤں کا کیا نام ہے؟" ــــ لڑکی قریب گئی تو سوار نے گھوڑے سے اُتر کر کہا ــــ "مجھے بہت دُور جانا ہے۔ یہاں رات کس کے گھر گزاروں؟"

یہ تو ہوتا ہی رہتا تھا کہ لوگ پیدل یا گھوڑے ٹٹو پر سفر کرتے تھے۔ جس گاؤں میں شام ہو جاتے رُک جاتے اور جس دروازے پر دستک دیں وہ دروازہ کھل جاتا اور انہیں پُورے احترام سے مہمان ٹھہرایا جاتا تھا۔ لڑکی نے اُسے کہا ــــ "ہمارے گھر میں ٹھہرو۔ میرا باپ ہے۔ چلو میرے ساتھ۔ اتنی سردی میں تمہیں رُک ہی جانا چاہیے۔"

لڑکی نے بتایا کہ وہ جونہی آگے آگے چلی اُس آدمی نے پیچھے سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ اُسی کا دوپٹہ اُس کے منہ میں ٹھونس کر اُسے گھوڑے پر ڈال لیا۔ گھوڑے پر وہ سوار ہُوا اور گھوڑا دوڑا دیا۔ یہ تو گاؤں کے اُن گھروں کے کئی افراد نے بھی کہا تھا کہ انہوں نے دوڑتے گھوڑے کے ٹاپ سُنے تھے۔ لڑکی بے بس تھی۔ آدمی طاقتور تھا۔ بہت دُور جا کر اُس نے گھوڑا روکا اور لڑکی کے منہ سے دوپٹہ نکال کر اُس کے سر پر ڈال دیا۔ اُس نے لڑکی سے کہا کہ

سیدھی ہو کر میرے آگے بیٹھی رہو۔ تمہیں چھڑانے کوئی نہیں آئے گا اور مَیں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ دراصل چاندنی میں اُس نے لڑکی کی خوبصورتی اور عمر دیکھ لی تھی۔ یہی اُس کی مصیبت کا باعث بنی۔ گھوڑے پر جاتے ہوتے لڑکی نے اُس کی بہت منت سماجت کی، اور روتی رہی۔ سوار نے اُسے کہا کہ وہ خاموش نہیں رہے گی تو وہ اُسے بے عزت کر کے قتل کر دے گا۔ لڑکی چُپ ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ ہر طرف سے خیال ہٹا کر وہ دل میں خدا کو یاد کرنے لگی۔ اُس نے خدا سے مدد مانگی اور کہا ــــ "میرے خدا! اگر مَیں نے کوئی گناہ کیا ہے تو مجھے اِس سے بھی زیادہ سزا دے، اگر نہیں تو آج ثابت کر دے کہ تُو میرا سچا خدا ہے۔"

اس حالت اور ایسی بے بسی میں لڑکی اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ چاند اور زیادہ صاف ہوتا جا رہا تھا۔ وہ گھوڑے پر آگے بیٹھی تھی اور سوار نے ایک بازو اس کے گرد لپیٹ کر اُسے اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ گھوڑا عام چال چلا جا رہا تھا۔ بہت دیر بعد گھوڑا اس علاقے سے بھی گزر کر آگے چلا گیا جہاں لڑکی ہمیں ملی تھی۔ اچانک گھوڑا رُک گیا اور ہنہنایا۔ سوار نے باگ کو جھٹکا دیا اور ایڑ لگا کر کہا ــــ "کیا ہو گیا؟ کیا نظر آ گیا ہے؟" گھوڑا کھڑے کھڑے ذرا سا کانپا اور پیچھے ہٹا۔ سوار کے منہ سے نکلا ــــ "اوہ! سانپ۔ جو ڑا ہے۔" لڑکی کو سانپ نظر نہیں آتے۔ سوار نے گھوڑے کو شاید دائیں بائیں کرنے کی کوشش کی۔ گھوڑا دو قدم چلا تو بدک کر اُچھلا۔ پیچھے بھی ہٹا، پھر اس نے اگلی ٹانگیں اتنی اٹھا دیں کہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ ہنہنایا اور اس قدر سخت جھٹکے سے اگلی ٹانگیں نیچے کر کے دوڑا کہ لڑکی ایک طرف لڑھک گئی۔ سوار بھی توازن کھو بیٹھا۔ گھوڑا پھر رُک گیا۔ لڑکی گر پڑی۔ سوار اس کے ساتھ ہی گرا۔ گھوڑا سرپٹ دوڑ پڑا۔ سوار اس حالت میں گھوڑے کے ساتھ ہی گیا کہ اس کا ایک پاؤں گھوڑے کے ساتھ تھا اور وہ زمین پر پڑا تھا۔ اس کا پاؤں رکاب

ں پھنس گیا ہوگا۔ اگر گھوڑا بدک جائے تو سوار رکابوں سے پاؤں ذرا پیچھے کر لیا کرتے
یں۔ اگر پاؤں رکاب سے آگے چلا جائے اور سوار گر پڑے تو رکاب ٹخنے کو اسی طرح پکڑ لیتی
ہے جس طرح ہتھکڑی ہاتھ کو۔ پھر وہ بد کے ہوئے گھوڑے کے ساتھ ہی جاتا ہے۔

لڑکی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے چاندنی میں گھوڑے کو سرپٹ بھاگتے اور سوار کو اس
کے ساتھ گھسٹتا ہوا جاتے دیکھا۔ گھوڑا سانپوں سے ڈر کر بھاگا تھا اس لیے اس کے جلدی
آنے کا امکان نہیں تھا۔ جانور سانپوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ سانپ کے سامنے گھوڑے کا
رویہ یہی ہوتا ہے جو لڑکی نے بیان کیا تھا... سوار کا زندہ رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ بڑی ہی
بُری موت مرا ہوگا۔ لڑکی ایسی مصیبت میں پھنس گئی کہ وہ جب ہمیں سُنا رہی تھی تو اس
کی آنکھیں پھٹ گئیں، زبان ہکلا گئی اور وہ خوف کے مارے حاجی محمد کے قریب ہو گئی۔ اس
نے بڑی کوشش سے اپنے آپ کو سنبھال سنبھال کر سنایا کہ اسے پہلا ڈر سانپوں کا تھا جو اس
نے نہیں دیکھے تھے۔ چاندنی میں اپنے سائے کو بھی وہ ناگ سمجھتی تھی۔ وقت آدھی رات کا
اور جنگل بیابان تھا۔ اُسے ہر طرف چڑیلیں، جن اور بھوت نظر آنے لگے۔ اس نے دُعا کی
کہ زمین پھٹ جائے اور اُسے نگل لے مگر خدا نے یہ دُعا قبول نہ کی۔ اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ
اس کا گاؤں کس طرف ہے۔ راستہ جو اُس نے دیکھا تھا وہ بہت ہی خوفناک تھا۔
رات کو دیواروں جیسے ٹیلے اور عجیب عجیب شکلوں والے ٹیلے اس کی جان نکال رہے
تھے، اور اس خیال سے تو اُسے غشی آنے لگی کہ گھر والے اُسے تلاش کر رہے ہوں گے اور
گاؤں والے کہیں گے کہ کسی کے ساتھ نکل گئی ہے۔

نماز کے سوا اُسے اور کوئی آیت یا وظیفہ یاد نہیں تھا۔ اس نے الحمد شریف کا وِرد
شروع کر دیا اور واپس چل پڑی۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ قدم خوف کے مارے

اُٹھتے نہیں تھے۔ اللہ کے کلام نے اُسے کچھ حوصلہ دیا مگر اپنے ہی قدموں کی آہٹ اُسے ڈرا دیتی اور وہ بدک جاتی تھی۔ اُسے یہ ڈر بھی تھا کہ سوار مرا نہیں ہوگا وہ واپس آجائے گا۔ اس خیال سے وہ دوڑ پڑی اور جہاں تک ٹانگوں نے ساتھ دیا وہ دوڑتی گئی۔ آخر ایک جگہ بے سُدھ ہو کر گر پڑی۔ سانس ٹھکانے آئے تو وہ پھر چل پڑی۔ رات کی آوازیں اُسے ڈرا رہی تھیں۔ گیدڑوں کی چیخیں اُسے زیادہ خوفزدہ کرتی تھیں۔ ایک جگہ تو اس نے کہا کہ اس کا دماغ قابو میں نہ رہا۔ اس نے اپنی ماں کے ساتھ، پھر باپ کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ اس نے کہا کہ دونوں اسے اپنے سامنے کھڑے نظر آرہے تھے۔ پھر گاؤں کے کتنے ہی آدمی اُسے نظر آئے۔ وہ اُن کے درمیان چلتی رہی۔ وہ شاید نیند میں چل رہی تھی۔ اسی ذہنی کیفیت میں وہ اپنے آپ سے نکل گئی۔ اُسے یاد نہیں تھا کہ کتنا وقت ایسے ہی گزر گیا، اور وہ کتنی دُور اور کس طرف نکل گئی۔

وہ جب ہوش میں آئی تو زمین پر پڑی تھی اور ارد گرد ٹیلے تھے۔ سورج نکل آیا تھا۔ وہ اسے خواب سمجھ رہی تھی۔ دماغ بیدار ہُوا تو پھر وہی خوف دل پر آگیا۔ وہ سامنے آنے سے ڈرتی تھی۔ رات ایک مرد نے اسے دیکھ کر گاؤں کے اندر سے اغوا کر لیا تھا۔ اس ویرانے میں اُسے ڈر تھا کہ کوئی بھی آدمی ملا وہ اُسے اُٹھا لے جائے گا۔ اُسے احساس تھا کہ وہ نوجوان اور خوبصورت ہے، وہاں رُکے رہنا بھی کوئی حل نہیں تھا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ وہ کچھ بھی سوچ نہیں سکتی تھی۔ وہ چھُپ چھُپ کر اس جگہ پہنچ گئی جہاں وہ ہمیں ملی تھی۔ اس علاقے میں گاؤں بہت ہی کم تھے۔ وہ کسی گاؤں کے قریب سے نہیں گزرنا چاہتی تھی۔ اس پر اغوا کے خوف کے ساتھ یہ ڈر سوار ہو گیا تھا کہ لوگ اسے دیکھ کر آوارہ لڑکی سمجھیں گے۔ یہ اس کی غلط فہمی تھی وہ کسی بھی گاؤں میں چلی جاتی اور

بتاتی کہ اس پر یہ واردات گزری ہے تو گاؤں والے اُسے اپنی بیٹیوں کی طرح گھوڑے پر بٹھا کر گھر چھوڑ جاتے۔

وہ اس جگہ پہنچی ہوئی تھی کہ بارش اور ژالہ باری شروع ہوگئی۔ جب بجلی کڑکی تو اس نے خوف سے چیخیں ماری تھیں اور وہ زور زور سے روئی بھی تھی۔ یہ اسی کی چیخیں تھیں جو مَیں نے سُنی تھیں لیکن بہت دھیمی تھیں۔ بارش تھمنے کے بعد ہم نے کُتوں کو کھولا تو وہ اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے لگے۔ حاجی محمد کا کُتا لڑکی کے بیان کے مطابق، زمین کو سونگھتا اندر گیا تھا اور لڑکی کو دیکھ کر کُتا اس کی طرف دوڑا۔ لڑکی ڈر گئی۔ کُتا اس سے پیار کرنے لگا۔ تب لڑکی نے پہچانا کہ یہ تو حاجی کا ڈبو ہے۔ اسے وہ خواب یا دماغ کی خرابی سمجھتی رہی لیکن کُتا دوڑ کر باہر آتا اور پھر اندر لڑکی کے پاس چلا جاتا تھا۔ کُتے کا اندر جانا اتفاق نہیں تھا۔ آپ تصور نہیں کر سکتے کہ کُتا مانوس بُو کو کس قدر یاد رکھتا ہے۔ جو لوگ کُتے کی سُونگھنے کی حس اور نفسیات سے واقف ہیں، اُن کے لیے یہ بالکل حیران کُن نہیں کہ کُتا وہاں چلا گیا تھا جہاں لڑکی چھپی ہوئی تھی۔ لڑکی کی کُتے کے ساتھ جو پرانی محبت تھی اس کا اِسے صِلہ مل گیا تھا۔ یہ کُتے کی بچپن کی محبت تھی۔ یہ کُتے کی فطرت میں شامل ہے کہ محبت کی پوری قیمت دیتا ہے اور ضرورت پڑے تو اپنی جان بھی دے دیتا ہے۔ اس کی بے چینی پر ہی حاجی محمد مجھے ساتھ لے کر اندر گیا تھا۔

لڑکی کو ہم گاؤں میں لے آئے۔ اس کے جسم میں جان آگئی تھی۔ رات کی تھکان کے باوجود وہ چلنے میں ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ گاؤں میں لوگوں نے اور اس کے گھر والوں نے جس طرح اس کا استقبال کیا اس کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے گاؤں والوں کو یہ ساری واردات سنائی۔ اس کے والد صاحب کو بھی سنائی اور ہم نے یہ رائے

دی کہ لڑکی نے جو بیان دیا ہے وہ صحیح ہے۔ گاؤں کے بعض آدمیوں نے کہا کہ وہ اُس علاقے میں جا کر اِدھر اُدھر کے گاؤں سے پتہ کریں گے کہ انہوں نے سوار کو گھسیٹتے ہوئے کسی گھوڑے کو دیکھا ہے؟... ہم اپنے گاؤں آ گئے اور وہاں سب کو یہ واردات سُنائی۔ سب نے اپنی اپنی رائے دی اور کسی نے یہ بھی کہا کہ لڑکی اپنی مرضی سے گئی ہو گی۔ سوار گر کر رکاب میں پھنسا رہ گیا۔ اُسے گھوڑا گھسیٹ کر لے گیا اور لڑکی اکیلی رہ گئی اور اُس نے یہ کہانی گھڑلی ہے۔

لڑکی اپنے گھر پہنچ گئی مگر یہ واردات اپنے انجام کو نہ پہنچی۔ کوئی ایک ماہ بعد حاجی محمد میرے گھر آیا۔ وہ گھبرایا ہُوا اور پریشان تھا۔ شکار کے دوران ہی وہ میرا دوست بن گیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ مجھ سے مدد لینے آیا ہے۔ بات یہ تھی کہ اس لڑکی کا رشتہ طے ہو چکا تھا۔ ابھی منگنی نہیں ہُوئی تھی۔ لڑکے والوں نے یہ کہہ کر رشتہ لینے سے انکار کر دیا کہ لڑکی اُن کے کام کی نہیں رہی۔ حاجی محمد نے یہ بھی سُنایا کہ جس روز ہم لڑکی کو واپس لائے تھے اس کے اگلے ہی دن گاؤں کے چار آدمی لڑکی کے بتائے ہوئے علاقے میں گھوڑوں پر گئے تھے۔ انہوں نے دُور دُور تک گھوم کر چار پانچ گاؤں سے پوچھا کہ کوئی گھوڑا اپنے سوار کو گھسیٹتا ہُوا انہوں نے دیکھا ہے یا نہیں۔ پہلے دو گاؤں سے انہیں صرف یہ شہادت ملی کہ رات کو انہوں نے بھاگتے ہوئے گھوڑے کی آوازیں سُنی تھیں۔ تیسرے گاؤں والوں نے ایک اور گاؤں کا راستہ بتا کر کہا کہ وہاں ایک گھوڑا دیکھا گیا تھا جس کی ایک رکاب میں اس کے سوار کا پاؤں پھنسا ہُوا تھا۔ وہ لوگ اگلے گاؤں گئے تو انہوں نے بتایا کہ ایک روز صبح سویرے ایک گھوڑا اُن کے گاؤں کے قریب فصل کھا رہا تھا۔ اُسے موڑنے کے لیے گئے تو دیکھا کہ اس کی ایک رکاب میں سوار کا پاؤں پھنسا ہُوا تھا۔ سوار مر چکا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ جسم پر کھال نہیں تھی۔ بعض جگہوں سے ہڈیاں بھی ننگی ہو گئی تھیں۔ چہرہ بھی خراب ہو گیا تھا لیکن پہچانا جاتا

تھا۔ گاؤں والوں نے اِرد گرد سارے علاقے میں آدمی دوڑائے، لیکن کسی بھی گاؤں سے نہ کوئی گھوڑا غائب تھا نہ سوار۔ گاؤں والے لاش اور گھوڑا تھانے لے گئے۔ سب کے بیان لیے گئے۔ اس کے بعد انہیں کچھ پتہ نہیں چلا کہ کسی نے لاش شناخت کی تھی یا نہیں۔

حاجی محمد نے مجھے بتایا کہ اس ثبوت کے باوجود کہ لڑکی کو اغوا کیا گیا تھا اس کا رشتہ ٹھکرا دیا گیا، اس کی ذات کے دو اور گھر اُس کا رشتہ مانگ رہے تھے، انہوں نے بھی رشتہ لینے سے انکار کر دیا اور لڑکی بدنام ہو گئی۔ وہ ہنسنے کھیلنے والی لڑکی اسی عمر میں روگی ہو گئی۔ حاجی محمد لڑکی سے تنہائی میں ملا اور اُسے کہا کہ اگر اُس کے والدین مان جائیں تو وہ اس کے ساتھ شادی کر لے گا۔ یہ ایک نہ ہونے والی بات تھی۔ لڑکی کی قسمت میں اب ساری عمر کا کنوارپن لکھا جا چکا تھا۔ اس کی برادری اور ذات کے گھروں میں صرف تین رشتے تھے۔ تینوں نے تہمت لگا کر جواب دے دیا تھا۔ حاجی محمد نے اپنے والدین سے بات کی تو انہوں نے اُسے بُرا بھلا کہا۔ اُس زمانے میں ذات برادری سے باہر شادی کرنا توہین اور جُرم سمجھا جاتا تھا۔ حاجی محمد نے لڑکی کو تیار کر لیا کہ اس پر یہ تہمت لگائی گئی ہے کہ وہ اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اب اس کے روگ کا علاج یہی ہے کہ وہ بھاگ کر دکھا دے ورنہ وہ ساری عمر گھر بیٹھی رہے گی اور بدنام بھی رہے گی۔ لڑکی کو اس نے راضی کر لیا۔ لڑکی کو جس طرح حاجی محمد کے کُتے نے بچایا اور اب حاجی محمد جس طرح اس کے لیے قربانی کر رہا تھا اس سے لڑکی اُس کی مرید بن گئی۔

آدھی صدی پہلے کے حاجی محمد کے الفاظ مجھے آج بھی یاد ہیں۔ اس نے کہا۔ "صابو! تم بھی اُونچی ذات کے جوان ہو۔ کیا تم میری طرح ایک قربانی کر سکو گے؟... مَیں لڑکی کو یہاں لے آؤں تو مجھے پناہ دو گے؟ دیکھو صابو! تم نے لڑکی کی حالت اپنی آنکھوں دیکھی اور اس

پر جو بیتی وہ اپنے کانوں سُنی تھی۔ اگر مرد ہو تو میری مدد کرو، ورنہ مَیں خود بھی زہر کھالوں گا اور لڑکی کو بھی زہر دے دُوں گا۔"

یہ بہت بڑی بغاوت تھی۔ اتنا دلیرانہ فیصلہ کہ اُس وقت کا دیہاتی معاشرہ اسے قبول نہیں کر سکتا تھا بلکہ اس جرم کی سزا موت تھی۔ کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ کلہاڑیوں سے کتنے سر کُھل جائیں گے۔ ہم ابھی جوان تھے جنہیں بزرگ نادان کہا کرتے تھے۔ مَیں نے راجہ شاہباز خان کو بلایا۔ اس نے دو اور دوستوں کو بُلایا۔ ہم نے کانفرنس کی اور فیصلہ کیا کہ بزرگوں کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے۔ حاجی محمد کو ہم نے واپس بھیج دیا اور ہم نے بزرگوں کو قائل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ بوڑھے تو راضی نہ ہوئے۔ چار اُدھیڑ عمر حضرات مان گئے۔ تین چار روز بعد حاجی محمد پھر آیا۔ مَیں نے اور میرے دوستوں نے اُسے کہا کہ لڑکی کو لے آؤ۔ ہم نے ایک کمہار کے گھر انہیں چوری چھپے رکھنے کا انتظام کر لیا اور کمہار سے کہا کہ جب تک ہم نہ کہیں وہ کسی سے بات تک نہ کرے۔ اُسے ہم نے پیسے بھی دیئے۔

دوسری رات حاجی محمد لڑکی کو لے آیا۔ وہ اُسے کس طرح نکال لایا؟ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس نے لڑکی کو ذرا دُور بٹھایا اور میرے گھر آیا۔ مَیں اُسے کمہار کے گھر لے گیا۔ لڑکی کو بھی وہاں پہنچا دیا۔ حاجی محمد دوسرے دن پھر اپنے گاؤں چلا گیا۔ شام سے ذرا پہلے واپس آیا۔ اس کے ساتھ اس کا باپ، ایک چچا اور ایک ماموں تھا اور ان کے ساتھ لڑکی کا باپ بھی تھا۔ ہمارے بزرگ دوسرے گاؤں کے معززین کو دیکھ کر استقبال کے لیے بڑھے۔ انہیں شاہباز خان کے والد صاحب اپنے گھر لے گئے۔ حاجی محمد نے مجھے بتایا کہ اس نے گاؤں میں جا کر اعلان کر دیا تھا کہ لڑکی کو رات وہ نکال لے گیا ہے اور لڑکی فلاں گاؤں میں ہے۔ اگر کوئی مجھے زنجیریں ڈالنا چاہتا ہے یا قتل کرنا چاہتا ہے تو آگے آجائے۔ باپ نے اور

دوسرے بزرگوں نے اُسے لعنت ملامت کی۔ باپ اُسے مارنے کو آیا تو حاجی محمد نے للکار کر کہا ــــ "تم سب بے غیرت ہو۔ سب نیچ ذات کے لوگ ہو۔ تم نے گاؤں کی ایک شریف اور مظلوم بیٹی پر تہمت لگائی ہے۔ تم نے اس کے شریف باپ کی پگڑی میلی کر دی ہے۔ مَیں لڑکی کو لے گیا ہوں، اور جہاں لے گیا ہوں وہیں شادی کروں گا اور ساری عمر وہیں رہوں گا۔"

گاؤں میں زلزلہ آگیا لیکن اس نوجوان مرد نے جذبات کے جوش میں ایسی ایسی باتیں کیں کہ سب چُپ ہو گئے۔ اُس نے اپنے باپ سے اور لڑکی کے باپ سے کہا کہ میرے ساتھ چلو۔ مَیں چور نہیں ہوں اور لڑکی بدمعاش نہیں ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ اگر تم لوگوں نے ہم دونوں پر زبردستی کی تو تمہیں ہم دونوں کی لاشیں ملیں گی ... لڑکا پاگل ہُوا جا رہا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی اور بے مثال دلیری تھی۔ وہ لوگ اس کے ساتھ چل پڑے۔ ہمارے گاؤں میں آئے تو انہوں نے ہمارے بزرگوں سے شکایت کی کہ اُن کے گاؤں کی ایک لڑکی ان کے گاؤں میں آگئی ہے۔ ہمارے بزرگوں کو تو علم ہی نہیں تھا۔ وہ بہت پریشان ہوئے۔ ہم نے بتا دیا کہ لڑکی کہاں ہے۔ ہمارے بزرگوں نے جونہی ہمیں گالیاں دینی شروع کیں تو حاجی محمد برس پڑا۔ اس نے چھوٹے بڑے کا لحاظ نہ کیا۔ اس نے پہلے تو لڑکی کے اغوا کا قصہ سنایا پھر یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے لڑکی کی بے گناہی کا یہ ثبوت دیا کہ لڑکی کو معجزے کی طرح بچا لیا مگر اللہ تعالیٰ کے بندوں نے بالشت بھر لمبی زبانیں نکال کر اُسے بدمعاش کہہ دیا۔ اس کا شتہ لینے سے انکار کر دیا۔ یہ میرا باپ ہے، یہ لڑکی کا باپ ہے، یہ میرا چچا اور یہ میرا ماموں ہے۔ یہ لڑکی کو لینے آئے ہیں۔ یہ اسے اُسی دوزخ میں جا پھینکیں گے جہاں سے مَیں اُسے نکال لایا ہوں۔

اُس نے ہمارے بزرگوں سے مخاطب ہو کے چلا کر کہا ــــ "کیا تم میرے باپ نہیں ہو؟

کیا تم میرے چچے اور ماموں نہیں ہو؟ کیا تم میں اِس لڑکی کا باپ بننے کے لیے کوئی تیار نہیں ہے جس پر ظلم ہُوا، جسے خدا نے بچا کر تمہارے حوالے کیا اور تم اُسے ٹھکرا رہے ہو؟" ——— اس نے اپنے باپ کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا ——— "اگر مَیں تمہیں جیتی جاگتی لڑکی واپس کر دوں تو مَیں اس باپ کا بیٹا نہیں ہوں" ——— اس کے ساتھ ہی اس کے آنسو جاری ہو گئے۔

بزرگوں میں بہت دیر تک بحث ہُوئی۔ صلح صفائی ہُوئی، صلاح مشورے ہُوئے اور حاجی محمد کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی گئی لیکن اُس نے اپنے گاؤں جانے سے صاف انکار کر دیا۔ آخر فیصلہ ہُوا کہ اسی گاؤں میں ان کی شادی کر دی جائے۔ دونوں باپوں کے لیے یہ صورت حال بڑی ہی عجیب اور تکلیف دہ تھی لیکن حاجی محمد کا باپ اپنے جوان اور اتنے دلیر بیٹے کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ قصّہ مختصر یہ کہ چوتھے پانچویں روز اِن کی شادی پوری رونق سے ہمارے گاؤں میں ہُوئی۔ لڑکے کو راجہ شاہباز خان کے گھر جگہ دی گئی تھی اور لڑکی کو ہمارے گھر میں دلہن بنایا گیا تھا... حاجی محمد کو ہمارے بزرگوں کے سلوک کی وجہ سے اور ہماری دوستی کی وجہ سے ہمارے گاؤں کے ساتھ اتنی محبت ہو گئی کہ اُس نے ماں باپ سے کہا کہ وہ باقی عمر اسی گاؤں میں گزارے گا۔ اس نے کسی کی نہ مانی۔ ہم نے بھی کوشش کر دیکھی۔ آخر اس نے باپ کو یہ کہہ دیا کہ مجھے جائیداد کا حصہ دے دو، مَیں یہیں مکان بنالوں گا۔ باپ نے مجبور ہو کر اسے ہمارے گاؤں میں بڑا اچھا مکان بنوا

حاجی محمد اپنے گاؤں جایا کرتا تھا۔ اس کے عزیز رشتہ دار اور لڑکی کے والدین کے گھر آتے رہتے تھے لیکن لڑکی نے گاؤں نہ جانے کی قسم کھالی تھی۔ وہ صرف دو دفعہ اپنے گاؤں گئی تھی۔ ایک بار اپنی ماں کی وفات پر اور دوسری بار باپ کی وفات پر۔ ا

کا کوئی بھائی نہ تھا۔ ایک بڑی بہن شادی شدہ تھی۔ دونوں بہنوں نے زمین اور مکان تقسیم کر لیا تھا۔ وہ ہمارے گاؤں کے فرد بن گئے۔ ہم نے اکٹھے شکار کھیلے اور اکٹھے بوڑھے ہوئے، مگر پچھلے مہینے دو لفظوں کے اس تار نے مجھے بے حال کر دیا —— "حاجی مر گیا ہے" —— تاج چار سال پہلے مر گئی تھی۔ مَیں گاؤں گیا۔ حاجی محمد کو نہلایا جا چکا تھا۔ مَیں نے اس کا منہ دیکھا اور اس کے منہ پر ہاتھ پھیر کر کہا —— "تم چلو دوست۔ میں بھی آتا ہوں۔"

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ہمارے بھیڑیئے، شاہ جی کے جن

جلتا ہُوا دِیا جس کی صرف لَو نظر آ رہی تھی، ہوا میں چلا جا رہا تھا۔ رات بڑی خاموش تھی۔ اندھیرا گہرا تھا۔

آپ نے رات کو کبھی دیئے کی لَو ہوا میں چلتی دیکھی ہے؟ اگر دیکھی نہیں تو سُنی ضرور ہوگی۔ ہمارے علاقے میں آج بھی سُننے میں آتا ہے کہ رات کو ایک جلتا ہُوا دیا ہوا میں جاتا نظر آتا ہے جو فلاں خانقاہ یا مزار کے دیئے جلا کر واپس چلا جاتا ہے۔ سنانے والے قسمیں کھا کر سُناتے ہیں کہ دیا کسی کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ کوئی انسان نہیں ہوتا، یہ ایک غیبی دیا ہے جو کسی پہنچ والے پیر کی رُوح نے یا جن نے اُٹھا رکھا ہوتا ہے۔ ہمارے گاؤں سے دو میل دُور ایک چٹان پر بہت پرانی قبر ہے۔ مَیں بچپن سے اس قبر کو دیکھ رہا ہوں۔ میرے والد صاحب مرحوم کہتے تھے کہ یہ اُن کے بھی وقتوں سے پہلے کی ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ اس بلندی پر کسے دفن کیا گیا تھا۔ لوگوں نے قبر کے اِرد گرد پتھروں کی تین فٹ اُونچی چار دیواری کھڑی کر رکھی ہے۔ اس میں درختوں کی خشک ٹہنیاں گڑی ہوئی ہیں جن کے ساتھ سُرخ، سبز، نیلے، پیلے چیتھڑے بندھے پھڑ پھڑاتے رہتے ہیں۔ یہ کبھی جھنڈے تھے جو عقیدت مندوں نے لکڑیوں کے ساتھ باندھے تھے۔

اس قبر کے متعلق آج بھی مشہور ہے کہ ہر جمعرات کی رات جب لوگ سو جاتے ہیں، جلتا ہُوا ایک دیا اس قبر سے اُٹھتا ہے اور اس علاقے کی تین خانقاہوں میں دیئے جلا کر

واپس اس قبر پر چلا جاتا ہے۔ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ جنہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا وہ بھی کہتے ہیں کہ دیا ہوا میں اُڑتا جاتا ہے مگر اپنی آنکھوں سے دیا کسی نے دیکھا نہیں۔ ہر کوئی کسی اور کا حوالہ دے کر بات کرتا ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ راتوں کو پیدل سفر کرنے والا اس دیئے کو دیکھ لے اور اس کے راستے میں آجائے تو اُسے آواز دیتا ہے "میرے راستے سے ہٹ جاؤ"۔۔۔ مسافر بے ہوش ہو جاتا ہے اور جب ہوش آتا ہے تو مسافر ہوش میں آجاتا ہے۔

مَیں پون صدی سے اس قبر سے دو میل دُور موجود ہوں۔ یہ دیا مَیں نے نہیں دیکھا۔ میرے گاؤں کے کسی فرد نے نہیں دیکھا۔ میرے گھر کے کسی فرد نے نہیں دیکھا لیکن سب کہتے ہیں کہ دیا ہوا میں جاتا ہے اور تین خانقاہوں کے دیئے جلا کر واپس آجاتا ہے۔ البتہ اپنے گاؤں سے چودہ پندرہ میل دُور ایک جلتا ہُوا دیا رات کے وقت ہوا میں جا رہا تھا جسے مَیں نے اور میرے تین دوستوں نے اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔ اُس وقت میری عمر غالباً چوبیس سال تھی مَیں اپنے آپ کو بہت دلیر اور نڈر سمجھا کرتا تھا۔ میرے دوست مجھ سے زیادہ دلیر اور نڈر تھے۔ دیئے کی لَو جب زمین سے تقریباً سات فٹ اُوپر آہستہ آہستہ جاتی نظر آئی تو میرے دل پر ایسا خوف آگیا تھا جو پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ میرا حلق خشک ہو گیا تھا۔ دوسرے دن میرے دوستوں نے اپنی حالت بیان کی تو مجھے خوشی ہُوئی کہ وہ بھی میری طرح ڈر گئے تھے اور اُن کے حلق اتنے خشک ہو گئے کہ اُن کے منہ کھُل گئے تھے۔ دیا کم و بیش بیس قدم گیا اور غائب ہو گیا تھا۔ یہ مَیں نے اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔ لَو بالکل اس طرح تھی جس طرح مٹی کے دیئے کی اور موم بتی کی ہوتی ہے۔ ہم اُس گاؤں کی ایک چھت پر تھے جہاں ہم مہمان ٹھہرے تھے۔ اسے دیا کہہ لیں یا جو جی میں آئے کہہ لیں، ایک لَو تھی جو ہم سے پانچ چھ فرلانگ دُور سے

گزری تھی۔ اس کی رفتار معمولی تھی۔

وہ گاؤں ہمارے گاؤں سے چودہ پندرہ میل دُور تھا۔ اب یہ گاؤں "تھا" کے صیغے میں آگیا ہے۔ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ مدّت ہوئی اُجڑ گیا ہے۔ اب وہاں سے ساون کی بارشوں کا پانی گزرتا ہے۔ آپ راولپنڈی سے جہلم کی طرف جائیں تو گوجر خان سے آگے سوہاوہ آتا ہے۔ یہاں سے ذرا ہی دُور پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ وہ گاؤں پکّی سڑک سے ہٹ کر چار پانچ میل اندر کی طرف پہاڑیوں کے تقریباً دامن میں تھا۔ وہ ایک اتفاقیہ واقعہ تھا جو ہمیں اُس گاؤں تک لے گیا تھا۔ میری عمر چوبیس سال ہو چکی تھی۔ چھ سات مہینے پہلے میری شادی ہُوئی تھی۔ میری ماں کہتی تھی کہ میری شادی ہو جائے گی تو میں کتوں کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دوں گا، مگر ماں کی یہ اُمید پوری نہ ہُوئی۔ میری شادی ہُوئی تو میں کُتوں کے پیچھے پہلے سے زیادہ بھاگنے لگا۔ میں دوستوں سے یہ نہیں کہلانا چاہتا تھا کہ صابو زن مرید ہو گیا ہے۔ میں بیوی کو بھی اس خوش فہمی سے باز رکھنا چاہتا تھا کہ اُس کے آجانے سے میرے دل سے اپنے پیارے کُتوں کی محبت نکل گئی ہے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں بیوی پر اپنی بہادری کا رُعب گانٹھنا چاہتا تھا۔ میں نے شادی کے چھٹے روز جب میری دُلہن میکے میں دو دن گزار کر واپس آگئی تھی، کھُرلی پہ بندھے بَیل کو بلاوجہ لاٹھی ماری تھی۔ اس بے گناہ کو لاٹھی مارنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ میں دُلہن کو بتانا چاہتا تھا کہ ذرا خیال رکھنا میں غصّے کا بڑا کڑا ہوں۔ میں نے آگے ہو کر کھُرلی میں چارہ ڈالا تو بَیل نے غصّے میں آکر مجھے سینگ مارا۔ نوکیلے سینگ نے میری ٹانگ کو چھُوا تک نہیں لیکن لٹھے کی شلوار پھاڑ ڈالی۔ میری دُلہن اور ماں دیکھ رہی تھیں دوڑی آئیں۔ میں نے اپنی ٹانگ پکڑ لی جیسے سینگ ٹانگ میں اُتر گیا ہو۔ میں نے کہا "کمبخت نے ٹانگ بیکار کر دی ہے"۔ حالانکہ صرف شلوار بیکار ہُوئی تھی۔ دُلہن اور ماں کو پریشان دیکھ

کر مَیں نے کہا ــــ "گھبراؤ نہیں۔ مَرد بیلوں کی ٹکروں سے گرنے لگے تو ہو چکی مردانگی" ــــ
مَیں کام میں لگا رہا۔ بناوٹی لنگڑا پن پیدا کر لیا۔ والد صاحب نے ٹانگ دیکھنا چاہی تو مَیں نے سر اُونچا کر کے کہا ــــ "اندر کی چوٹ ہے۔ کوئی پرواہ نہیں" ــــ حقیقت یہ تھی کہ بیل نے میری شلوار سے سینگ پھنسا کر مجھے کہا تھا ــــ "اوئے صابو! مجھے لاٹھی کیوں ماری تُو نے؟"

چھ سات مہینے گزر گئے۔ اس دوران ہم دو دفعہ شکار پر گئے تھے۔ اب تیسری دفعہ جانے لگے تو ماں نے مجھے الگ کر کے کہا ــــ "صابو! اب شرم کر۔ چار پانچ مہینے بعد تُو باپ بننے والا ہے۔ اب کُتوں کا ساتھ چھوڑ دے"۔ مَیں نے جواب دیا ــــ "ابھی چار پانچ مہینے پڑے ہیں بے جی!" ــــ اور مَیں دونوں کُتے کھول کر نکل گیا۔ باہر دوست انتظار کر رہے تھے۔ اُن کی تعداد گیارہ اور کُتوں کی تعداد دس تھی۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ گندم پک رہی تھی۔ کٹائی تک فرصت ہی فرصت تھی۔ سورج نکلنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ ہم گاؤں سے نکل گئے اور سورج نکلنے تک ہم اُس علاقے میں پہنچ گئے جس کے خدوخال اپنی بہت سی کہانیوں میں بیان کر چکا ہوں۔ کہیں کھڈ، کہیں نالے، کہیں بلندی، کہیں گہرائی، کہیں پتھر، کہیں ریت، مگر ہمارے لیے سب میدان تھا۔ عمر ہی ایسی تھی کہ ہمارے سامنے بلندیاں پست ہو جاتی تھیں، سیلابی ندیاں راستہ دے دیتی تھیں۔

ہمارا رُخ پہاڑیوں کی طرف تھا جو بہت دُور تھیں۔ بُوگیر کُتے ناک زمین کے ساتھ لگائے اِدھر اُدھر اور آگے ہی آگے دوڑتے، رُکتے، چلتے اور گھوم گھوم کر ہمیں دیکھتے جا رہے تھے۔ دونوں تازی کُتوں کو بھی ہم نے کھول دیا تھا۔ باقی ابھی زنجیروں میں تھے۔ سُورج اُوپر آ چکا تھا۔ بُوگیر کُتے لمبے سانس سے بھونکنے لگے۔ تازی کُتے دوڑتے گئے۔ یہ

ہماری ٹیم تھی۔ کُتّے ایک دوسرے کی زبان سمجھتے تھے۔ بُوگیر کُتّے شیشم کے ایک درخت کے تنے کے قریب جاکر رُک گئے۔ انہوں نے تنے کے گرد تیزی سے گھوم کر اُوپر دیکھا اور اگلی ٹانگیں اُٹھا کر درخت پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ کُتا درخت پر نہیں چڑھ سکتا۔ ہم ابھی دُور تھے۔ تازی کُتے بھی منہ اُوپر کرکے بھونک رہے تھے اور تنے کے اردگرد بھاگتے بھی تھے۔ ہمارا شکار گیدڑ، خرگوش، سہہ اور گوہ وغیرہ ہُوا کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی درخت پر چڑھنے والا جانور نہیں تھا۔ گوہ درخت پر چڑھ سکتی ہے لیکن چڑھتی نہیں، بھاگ کر بِل میں گھس جاتی ہے۔ پرندوں کی طرف کُتوں نے کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ پھر درخت پر کیا ہوسکتا تھا؟

جن کُتوں کو ہم نے پکڑ رکھا تھا وہ منہ زور ہونے لگے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی زبان سمجھتے تھے۔ انہیں ساتھی بلا رہے تھے۔ ہم نے ان کے پٹوں سے زنجیریں کھول دیں۔ ایک ہی منٹ بعد درخت کے نیچے دس کُتّے منہ اُٹھائے اچھل اچھل کر اور اِدھر اُدھر دوڑ کر بھونک رہے تھے۔ درخت پر کوئی خاص چیز تھی۔ ہم دوڑ کر گئے۔ اُوپر دیکھا تو ایک ٹہن پر جنگلی بِلّا بیٹھا ہُوا کُتوں کو دانت دکھا رہا تھا۔ ہمارے بہت سے قارئین نے جنگلی بِلّا نہیں دیکھا ہوگا۔ یہ گھریلو بلّیوں کی ہی نسل کا جانور ہے۔ فرق یہ ہے کہ گھریلو بلّیاں پیار اور محبّت سے ہمارے ساتھ رہتی ہیں اور جنگلی بِلّی انسان سے دُور جنگلوں اور ویرانوں میں رہنے کی وجہ سے انسان کے پیار اور محبّت سے واقف نہیں ہوتی۔ انسان کو اپنا دشمن سمجھتی ہے۔ آزادی سے رہنے کا اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کا قد کاٹھ گھریلو بلّیوں سے دُگنا نہیں تو ڈیڑھ گُنا ضرور ہوتا ہے۔

مَیں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اُس وقت ہمارے علاقے میں آبادیاں بہت ہی کم، جنگل اور پہاڑی ویرانے زیادہ تھے۔ یہاں بھیڑیئے بھی ہوتے تھے۔ اب ان درندوں

کا نام و نشان نہیں رہا۔ جنگلی بلّوں کے متعلق سُنا تھا کہ کہیں کہیں نظر آتے ہیں، دیکھے کبھی نہیں تھے۔ بھیڑیئے بھی زیادہ نہیں تھے۔ بہرحال یہ دونوں درندے ہمارے علاقے میں موجود تھے۔ اب جنگلی بلّیاں شاید کشمیر کے جنگلوں میں یا ہندوستان کے اُن جنگلوں میں ہوں جہاں دھاری دار شیر بھی ہوتے ہیں۔ ہمارا علاقہ اب آباد ہو گیا ہے۔ سڑکیں اور واپڈا کی بجلی کے بڑے بڑے کھمبے سارے علاقے میں پھیل گئے ہیں۔ موٹریں اور سکوٹر وغیرہ عام ہو گئے ہیں اور بندوقوں والے ایسے شکاری بھی گھومتے پھرتے رہتے ہیں جو کارتوس صرف چلاتے ہیں مگر مرتا کچھ بھی نہیں۔ انہوں نے خرگوشوں اور گیدڑوں کو بھی ملک بدر کر دیا ہے۔

جنگلی بلّا بلّی کی نسبت زیادہ بڑا اور موٹا تازہ ہوتا ہے۔ اُس کا چہرہ چوڑا اور بڑا ہوتا ہے اور گردن جیسے سُوجی ہوئی ہو۔ ہم نے شیشم کے درخت پر جو بلّا دیکھا وہ غیر معمولی طور پر موٹا تازہ تھا۔ اچھی طرح دیکھا تو اس کے پنجوں کے نیچے مرا ہوا خرگوش نظر آیا۔ جنگلی بلّے چوہوں، خرگوشوں اور بڑے سانپ کی چھپکلیوں کو جنہیں ہم سانڈے کہتے ہیں کھایا کرتے تھے۔ جنگلی چوہے، گھریلو بلّی جتنے بڑے بھی ہوتے ہیں۔ اِس بلّی نے خرگوش مارا تھا جسے وہ درخت پر لے جا کر کھا رہا تھا کہ ہمارے کُتے پہنچ گئے۔ جنگلی بلّے کے متعلق ہمیں بتایا گیا تھا کہ انسان پر حملہ نہیں کرتا۔ دیکھ کر بھاگ جاتا ہے۔ البتہ اسے کئی آدمی گھیر لیں اور بلّا جب دیکھے کہ وہ بھاگ نہیں سکتا تو کسی ایک آدمی پر اس طرح حملہ کر دیتا ہے کہ اُچھل کر گولی کی رفتار سے گردن تک پہنچتا اور گردن کو دانتوں اور پنجوں میں جکڑ لیتا ہے۔ اگر آپ گھریلو بلّی کو کمرے میں بند کر کے اُسے پریشان کریں تو وہ بھی تنگ آ کر آپ پر حملہ کر دے گی۔

وہ بلّا ہمیں بڑا خوفناک نظر آیا۔ ایسا شکار پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ اِسے ہم نہیں چھوڑنا چاہتے تھے مگر اسے درخت سے اتارنا مشکل تھا۔ ہم اسے ڈھیلے اور پتھر مارنے لگے۔ وہ بلندی پر

تھا۔ اس نے خرگوش کو منہ میں لیا اور اُٹھ کر اور اُوپر چلا گیا۔ ایک جگہ تین ٹھن ملتے تھے۔ وہ ان کے درمیان بیٹھ گیا۔ ابھی تک اُسے کوئی پتھر اور ڈھیلا نہیں لگا تھا۔ پتھر اُس کے قریب ٹھن سے لگتا تھا تو وہ دانت نکال کر غصّے سے غرّاتا تھا۔ تین ٹھنوں میں بیٹھ کر وہ ہر طرف سے ڈھیلوں اور پتھروں سے محفوظ ہو گیا۔ کُتّے اُسے دیکھ دیکھ کر اچھل اور بھونک رہے تھے۔ ہم میں سے کسی نے کہا کہ اُوپر جا کر اسے ڈنڈوں سے مارتے اور نیچے کودنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس میں خطرہ یہی تھا کہ وہ حملہ کر دے گا۔

آپ نے میری سُنائی ہوئی کہانیوں میں میرے ایک دوست کا نام پڑھا ہو گا جسے ہم موٹر کہتے تھے۔ وہ بہت تیز دوڑنے والا بے حد شرارتی اور حیران کُن حد تک دلیر لڑکا تھا۔ اُس کا نام راجہ اللہ داد خان تھا۔ اُس کی پھُرتی، تیز رفتاری اور تیز تیز باتیں کرنے کے لحاظ سے اُس کا نام موٹر پڑ گیا تھا۔ اُس دَور میں ہماری نظروں میں دنیا کی سب سے زیادہ تیز چیز موٹر تھی۔ اللہ مغفرت کرے عمر کے ستر ویں سال فوت ہو گیا ہے۔ موٹر ہمارے ساتھ تھا۔ اُسی نے کسی سے ڈنڈا لیا جو وہ منہ میں لے کر درخت پر چڑھنے لگا۔ ہم نے اُسے روکا، مگر وہ سر ہلاتا رہا۔ منہ میں ڈنڈے کی وجہ سے بول نہیں سکتا تھا۔ وہ اُوپر چلا گیا اور ایک ٹھن پر جا کھڑا ہُوا۔ بِلّا اُس سے ابھی دُور تھا۔ ہم ایسے تجربہ کار شکاری نہیں تھے جو درندوں وغیرہ کی نفسیات سمجھ سکتے۔ ہم نے یہ سوچا ہی نہیں کہ بِلّا شکار کو لیے بیٹھا ہے، بھوکا ہے اور اس وقت شیر بھی اس کے قریب گیا تو وہ اپنے شکار کو بچانے کے لیے حملہ کر دے گا۔

موٹر اتنی اُوپر چلا گیا جہاں سے اس کا ڈنڈا بِلّے تک پہنچ سکتا تھا۔ اس نے ڈنڈا آگے کر کے بِلّے کو چھیڑا تو بِلّا بڑی زور سے غرّایا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس کے تیور بتا رہے تھے کہ حملہ کرے گا۔ مَیں نے ایک ڈنڈا منہ میں لیا اور موٹر کی مدد کو دوسرے ٹھن پر جانے کے لیے

اُوپر چڑھ گیا۔ مَیں نے بھی بلّے کو چھیڑا لیکن میرے سامنے ایک اور عمودی ٹھن تھا۔ اچانک بلّا اس طرح آگے کو گیا جس طرح تیراک پانی میں ڈائیو کرتے ہیں یا چیل جھپٹے میں آتی ہے۔ بڑا مجھ سے تین گز دُور بائیں ٹھن پر تھا۔ بلّا اُس کے سینے کے ساتھ چپک گیا۔ موٹر نے ایک ہاتھ سے اُوپر کا ٹھن پکڑ رکھا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ سے چھُوٹ گیا۔ موٹر توازن قائم نہ رکھ سکا۔ دائیں کو گھما۔ بلندی اتنی تھی جہاں سے گرنے سے ہڈی پسلی ٹوٹ سکتی تھی۔ مَیں وہاں سے موٹر کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کے دونوں پاؤں ٹھن سے سرک گئے اور وہ نیچے کو گیا۔ وہ بہت پھُرتیلا اور ذہین لڑکا تھا۔ اُس نے بازو اُوپر کیے اور اسی ٹھن کو پکڑ لیا جس پر وہ کھڑا تھا۔ اس طرح ٹھن کے ساتھ لگ کر نیچے جانے سے یہ ہُوا کہ بلّا جو اس کے سینے کے ساتھ چپک گیا تھا اُسے ٹھن زور سے لگا تو وہ موٹر کے سینے سے الگ ہو کر نیچے کو دُوگیا۔ اس سارے عمل میں یعنی بلّے کے جھپٹے سے لے کر موٹر کے گرنے اور اُس کے سینے سے بلّے کے الگ ہونے تک ڈیڑھ یا دو سیکنڈ لگے ہوں گے۔ مَیں نے سُنانے میں زیادہ وقت لیا ہے۔

مَیں نے نیچے تو نہیں دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے، موٹر تک پہنچا۔ وہ بازی گروں کی طرح ٹانگیں اُوپر کر کے ٹھن پر آکر بیٹھ گیا۔ اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا لیکن وہ ہنس بھی رہا تھا۔ مَیں گھبرایا ہُوا تھا۔ اُس کے سینے پر دیکھا۔ خون کے تین چار داغ نظر آئے۔ گلے سے کُرتہ پھٹ گیا تھا۔ معجزہ یہ ہُوا کہ بلّا اُس کی گردن میں منہ نہیں ڈال سکا۔ اس معجزے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ موٹر فوراً گر پڑا اور بلّا ٹھن سے ٹکرا کر الگ ہو گیا تھا۔ دوسری یہ کہ موٹر کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا جو اتفاق سے اس کے سینے سے آگے تھا۔ ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھُوٹ تو گیا لیکن اس کے سینے اور بلّے کے درمیان اس طرح آگیا کہ اس کا اُوپر والا سرا موٹر کی

ٹھوڑی اور ناک کے سامنے سے ہوتا ہُوا سر تک چلا گیا تھا۔ بلّے نے موٹر کی شہ رگ منہ میں لینے کی کوشش ضرور کی ہو گی لیکن آگے ڈنڈا آ گیا۔ بہر حال جو کچھ ہُوا اللہ کا خاص کرم تھا اور اور یہ موٹر کی کسی نیکی کا اجر تھا کہ وہ بال بال بچ گیا۔ اس کے سینے میں بلّے نے پنجے گاڑے تھے لیکن صرف تین جگہ ناخن ذرا سے اُترے تھے۔ کُرتہ ہٹا کر دیکھا۔ خون صاف کیا۔ بہت معمولی خراشیں تھیں۔

نیچے دیکھا تو عجب ہنگامہ نظر آیا۔ دس میں سے چار کُتّے اُس مرے ہوئے خرگوش کے حصّے بخرے کر کے کھا رہے تھے جو بلّے کے پنجوں سے نیچے گرا تھا۔ ہمارے ایک دوست ہادی حسن کا بُل ٹیریئر کُتا لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ بلّا اس کی دونوں اگلی ٹانگوں سے چپکا ہُوا اور کُتے کی شہ رگ اُس کے منہ میں تھی۔ باقی پانچ کُتے جن میں ہمارا بُوبی بھی تھا اس بُل ٹیریئر کے اِرد گرد دوڑتے اور بلّے پر حملہ کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر وہ کُتا بلّے کے شکنجے میں آیا ہُوا ایسی بُری طرح قلابازیاں کھاتا اور بلّے کو جھٹکنے کی کوشش کرتا تھا کہ بلّا ہر کُتے کے جھپٹے سے بچ جاتا تھا۔ کُتوں کے سامنے دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ ہادی حسن اپنے اتنے اچھے کُتے کو بچانے کی بجائے دوسرے کُتوں کو روک رہا تھا اور سب سے کہہ رہا تھا ــــ "اپنے کُتے پکڑ لو۔ اسے لڑنے دو ذرا" ــــ مَیں نے اُوپر سے چلّا کر کہا ــــ "ہادی، مت مرواؤ اسے" ــــ مگر ہادی اپنے کُتّے کو بڑی ہی خطرناک ٹریننگ دینا چاہتا تھا۔

ہم دونوں نیچے اُترے۔ موٹر کو دیکھ کر سب کو اطمینان ہُوا کہ وہ بچ گیا تھا۔ ہادی کے کہنے پر سب نے کُتوں کو زنجیریں ڈال لی تھیں۔ ہادی کے بُل ٹیریئر کی ٹانگوں اور شہ رگ سے خون بہہ رہا تھا۔ اُس نے پچھلا ایک پنجہ بلّے کی پچھلی ٹانگوں کے درمیان رکھ کر دبایا تو بلّے کی گرفت نیچے سے ڈھیلی ہو گئی۔ اُس کی ٹانگیں زمین سے لگیں تو کُتے نے اگلے دونوں پنجے بلّے کے پیٹ

میں رکھ کر دبائے اور گردن کو اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ بلّے کا منہ اُکھڑ گیا۔ کُتّا طاقتور بھی تھا اور تجربہ کار بھی۔ بلّا بھاگ اُٹھا۔ کُتّے کی گردن نیچے سے بُری طرح کٹ گئی تھی اور ٹانگوں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ کُتّے نے بلّے کو دُور نہیں جانے دیا۔ وہ غصّے میں تھا۔ اس نے بلّے کو جا لیا۔ آپ کُتّے اور بلّے کی لڑائی پر حیران ہوں گے مگر وہ جنگلی بلّا تھا۔ بھوکا تھا اور اُس سے شکار چھن گیا تھا۔ کُتّوں نے اُسے گھیر لیا تھا۔ وہ آخر شیر کا خالو تھا۔ اُس نے دیکھا کہ اتنے سارے کُتّوں سے بچ نکلنا ممکن نہیں تو ہادی کے کُتّے پر حملہ کر دیا۔

اب کُتّے نے اس کا پیچھا کر کے اُسے پکڑ لیا تو اُن کی لڑائی نے ہمارے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ دوسرے کُتّے زنجیریں تڑوا رہے تھے۔ ہم نے انہیں قابو میں رکھا۔ بلّا کُتّے کی نسبت آدھا تھا لیکن اس نے لڑ کر مرنے یا مارنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ دونوں ظالموں کی طرح ایک دوسرے کو لہولہان کر رہے تھے۔ اس معرکے کا انجام یہ ہُوا کہ بلّا اپنی شہ رگ اور پیٹ کٹوا کر آہستہ آہستہ تڑپنے لگا۔ کُتّے نے اُسے دیکھا پھر ہم سب نے ہادی کی طرف دیکھا۔ اُس کی بھی شہ رگ کٹ چکی تھی۔ نازک اعضا بھی کٹ گئے تھے۔ تین چار جگہوں سے کھال اُکھڑ گئی تھی۔ اس کے جسم میں خون نہیں رہا تھا۔ وہ ڈگمگا کر ہادی کی طرف آیا۔ ہادی آگے بڑھا۔ کُتّا اس کے قدموں میں گر پڑا اور مر گیا۔ ہم سب کے آنسو نکل آئے۔ ہم نے کُتّوں کو چھوڑ دیا۔ وہ مرے ہوئے بلّے پر ٹوٹ پڑے۔ ہم مرے ہوئے بُل ٹیریر کو اُٹھا کر شیشم کے درخت کے نیچے لے گئے۔ چاقوؤں اور ایک کلہاڑی سے گڑھا کھود کر اسے دفن کر دیا۔

اتنے اچھے کُتّے کے مرنے کا غم ضرور تھا لیکن ایک کُتّا ضائع ہو جانے کا افسوس نہیں تھا۔ ہم اُس وقت تک شکار میں دو ایسے دوست ضائع کر چکے تھے جو نوجوان تھے اور ماؤں بہنوں کی آنکھوں کا نُور تھے۔ کُتّے کو دفن کر کے ہم آگے چلے گئے۔ کھانا ساتھ تھا۔ کسی اچھی جگہ کی

نالش میں جہاں پانی بھی ہو، ہم ڈیڑھ ایک میل آگے نکل گئے۔ ایک کس (برسانی نالہ) میں شفاف پانی کی لکیر سی بہ رہی تھی۔ اسی کے کنارے بیٹھ گئے۔ شکار کا نشہ پورا ہو چکا تھا۔ وہاں نیل گائے اور ہرن تو نہیں تھے جو مار کر گاؤں لے جاتے۔ ہمارا شکار لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ تھا۔ دوست کہہ رہے تھے کہ آگے چلو۔ کھانا کھا کر، کتوں کو اور اپنے آپ کو پانی پلا کر ہم کس سے پار چلے گئے۔ آگے مٹی کے ٹیلے اور گہرے کھڈ تھے۔ شکار کوئی نظر نہ آیا۔ اس علاقے سے نکلے تو آگے سرسبز علاقہ آگیا۔ کچھ کھیت بھی تھے اور درختوں کی بہتات تھی۔

ہمیں چار پانچ فرلانگ دور ایک گھوڑا سرپٹ بھاگتا دکھائی دیا۔ اس پر سوار بھی تھا۔ گھوڑا ہماری طرف آتے آتے دائیں کو مڑ گیا۔ تھوڑا آگے جا کر پھر ہماری طرف آیا۔ اسے دائیں بائیں مڑتے اور اندھا دھند ایک کھیت میں جاتے دیکھا تو ہم جان گئے کہ گھوڑا منہ زور اور بے قابو ہو گیا ہے۔ ہمارے کتے کھلے ہوئے ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔ سوار نے چلانا شروع کر دیا — "کتوں کو پکڑ لو۔ گھوڑا بدکا ہوا ہے۔ خدا کے لیے کتوں کو پکڑ لو" — کتوں نے گھوڑے کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ کسی کے گھوڑے کو وہ شکار نہیں سمجھا کرتے تھے۔ ہم سوار کو خوش کرنے کے لیے کتوں کو پکڑنے کے لیے دوڑے لیکن بے لگام گھوڑے نے مہلت نہ دی۔ وہ ہمارے درمیان سے سرپٹ دوڑتا گزرا۔ سوار تجربہ کار معلوم ہوتا تھا۔ وہ لگام کھینچ رہا تھا۔ گھوڑے کو دیکھا۔ اس کی پچھلی ٹانگوں کے بالائی حصے سے خون پھوٹ رہا تھا۔ شاید راستے میں کسی کے لڑاکا کتے نے اس پر حملہ کیا تھا۔

گھوڑا دور جا کر کھڈوں کے علاقے میں اتر کر غائب ہو گیا۔ ہم ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔ پانچ سات منٹ بعد وہ ایک اور سمت سے زمین سے ابھرا۔ اس کا رخ پھر ہماری طرف ہو گیا۔ اب اس کی رفتار سست تھی۔ گھوڑا معلوم نہیں کب سے بھاگ رہا تھا۔ زخمی بھی تھا۔ ہم سب

کو گھوڑ سواری کی اچھی خاصی مشق تھی۔ ہمارا ایک دوست شہباز سواری کا ماہر تھا۔ اُس نے کہا کہ سوار کو معلوم نہیں کہ منہ زور گھوڑے کو کس طرح روکتے ہیں۔ اتنے میں گھوڑا قریب آگیا۔ شہباز اس کے راستے میں ذرا بلند جگہ جا کھڑا ہُوا۔ گھوڑے کی رفتار پہلے والی نہیں رہی تھی۔ گھوڑا شہباز کے قریب آیا تو شہباز اس کے ساتھ دوڑا، پھر اس نے یہ کمال کر دکھایا کہ اُوپر کو اُچھل کر سوار کے آگے گھوڑے پر پیٹ کے بل جا پڑا۔ سوار نے رکاب سے پاؤں نکال دیا۔ اس میں شہباز نے پاؤں رکھا۔ سوار نے اس کی مدد کی اور وہ گھوڑے پر سوار ہو کے آگے بیٹھ گیا۔ باگ اس نے ہاتھ میں لے لی اور سوار نے اس کی کمر میں بازو ڈال کر مضبوطی سے پکڑ لیا۔ شہباز گھوڑے کی گردن پر پیٹ کے بل لیٹا۔ تھوڑا ہی دُور جا کر گھوڑا رُک گیا۔ دونوں سوار اُترے۔ ہم دوڑتے ہُوئے اُن تک پہنچے۔

گھوڑا اور سوار دونوں ہی اچھی نسل کے تھے۔ گھوڑا پیچھے سے زخمی تھا۔ سوار دُور کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اس پر دو بھیڑیوں نے حملہ کیا ہے۔ گھوڑا تیز دوڑنے والا نہ ہوتا تو سوار ہمارے پاس زندہ نہ کھڑا ہوتا۔ اس نے جو قصّہ سُنایا، مجھے آج تک یاد ہے۔ اس نے کہا "پہاڑیوں کے قریب ایک گاؤں ہے۔ کوئی ایک مہینے سے یہ دونوں بھیڑیے جو غالباً نر اور مادہ ہیں اس گاؤں کا بہت نقصان کر چکے ہیں۔ اب شام کے بعد لوگ باہر نہیں نکلتے۔ گاؤں اور پہاڑیوں کے درمیان علاقہ بہت خراب ہے۔ جھاڑیاں زیادہ ہیں۔ کھڈ بھی ہیں اور بڑے بڑے پتھر بھی ہیں۔ گاؤں کے ساتھ ہی قدرتی تالاب ہے جس کی ایک طرف بلند جنگلی پودے ہیں۔ ایک شام سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے بھیڑیوں نے سات آٹھ بکریوں پر حملہ کیا۔ بکریوں کے ساتھ ایک لڑکا تھا۔ بھیڑیوں نے ایک بکری کو پکڑا اور گھسیٹ کر لے گئے۔ دو تین روز بعد شام کے ہی

وقت بھیڑیوں نے ایک بیل کو گرا لیا مگر بیل طاقتور تھا۔ اُس نے بھیڑیوں کا مقابلہ کیا اور بھاگتا ہُوا گاؤں کی طرف بھی آتا رہا۔ گاؤں کے لوگوں نے دیکھ لیا۔ وہ کلہاڑیاں اور لاٹھیاں لے کر دوڑے گئے۔ بھیڑیئے بھاگ گئے مگر بیل کی شہ رگ کٹ چکی تھی۔ مالک نے اسے ذبح کر دیا....

پھر ایک رات بھیڑیئے گاؤں میں آگئے۔ انہیں اور تو کچھ نہ ملا، ایک کُتّے کو کھا گئے۔ کُتّے کے جسم کے کچھ حصے تالاب کے قریب پڑے ملے۔ میرا گاؤں اس گاؤں سے تین میل دُور ہے۔ ہمارے گاؤں کے دو آدمی دن کے وقت اُدھر سے گزرے تو بھیڑیوں نے ان کا راستہ روک لیا۔ آدمیوں کے پاس لاٹھیاں تھیں۔ انہوں نے لاٹھیاں گھمانی شروع کر دیں۔ بھیڑیئے ان کے ساتھ ساتھ چلتے اور غرّاتے رہے۔ انہوں نے ان آدمیوں کا بہت دُور تک پیچھا کیا پھر چلے گئے۔ اس گاؤں میں جس کے قریب تالاب ہے، ایک کشمیری شاہ جی ہیں۔ وہ مسجد میں پیش امام ہیں۔ پھُنک والے ہیں۔ جنّوں کو حاضر کر لیتے ہیں تعویذ بھی دیتے ہیں۔ اللہ نے اُن کے ہاتھ میں غیب کی طاقت دی ہے۔ ان کی آواز اتنی سُریلی ہے کہ اذان دیتے ہیں تو آندھی بھی رُک جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کی اذان سننے کے لیے جن بھی آجاتے ہیں۔ ہوا خواہ کتنی ہی تیز ہو، جب شاہ جی اذان دیتے ہیں تو جہاں تک ان کی آواز پہنچتی ہے وہاں تک کسی درخت کا پتّا بھی نہیں ہلتا... شاہ جی نے کہا ہے کہ یہ بھیڑیئے دراصل جن ہیں لیکن بے مذہب ہیں۔ ایسے جن مشکل سے قابو میں آتے ہیں۔ اُن کے کہنے پر اس گاؤں نے دو بکرے ذبح کر کے شاہ جی کو دیئے ہیں۔ شاہ جی نے گوشت پر کچھ پڑھ کر آدھا گاؤں میں تقسیم کیا تھا۔ باقی میں سے آدھا مسجد میں رکھا اور آدھا گاؤں کے اردگرد بکھیر دیا تھا۔ ایسی ہی قربانی ہمارے گاؤں نے بھی دی ہے کیونکہ ہم لوگ اکثر اِدھر سے

گزرتے ہیں...

"شاہ جی کو اس گاؤں میں آئے تین مہینے ہو گئے ہیں۔ ان تین مہینوں میں دس مرتبہ ایک جلتا دیا ہوا میں جاتا نظر آیا ہے۔ شاہ جی کہتے ہیں کہ یہ جن ہیں۔ وہ رات کو بہت دور سے آتے ہیں۔ یہ جن شاہ جی کو جانتے ہیں۔ اُن کے گاؤں کے قریب سے گزرتے ہیں تو اُن کے دیئے کی روشنی نظر آنے لگتی ہے۔ وہ شاہ جی کو روشنی دکھاتے ہیں۔ آگے جا کر روشنی غائب ہو جاتی ہے۔ شاہ جی کہتے ہیں کہ روشنی ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے لیکن یہ روشن رہتی ہے۔ اسے صرف جن دیکھ سکتے ہیں۔ رات کو وہ روشنی کے بغیر چل نہیں سکتے... ان بھیڑیوں سے تنگ آ کر دونوں گاؤں کے لوگوں نے ارادہ کیا تھا کہ سوہاوہ تھانے میں جا کر درخواست دیں کہ ان بھیڑیوں کو ختم کیا جائے مگر شاہ جی نے انہیں روک دیا اور کہا کہ یہ جن ہیں، جو کوئی ان کے خلاف کارروائی کرے گا مارا جائے گا۔ مَیں نے آج مان لیا ہے کہ شاہ جی نے جو کچھ کہا ہے سولہ آنے سچ ہے۔ مَیں سوہاوہ تھانے جا رہا تھا۔ بھیڑیوں نے آٹھ روز گزرے ایک جوان آدمی کو مار ڈالا ہے۔"

اس شخص نے بڑا ڈراؤنا قصہ سنایا۔ اُس زمانے میں لوگ پیدل سفر کیا کرتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں سفر کرنے والے دیہاتی رات کے آخری پہر، تین بجے کے لگ بھگ چل پڑتے تھے تاکہ سورج نکلنے تک منزل پر پہنچ جائیں۔ دن کی گرمی میں سفر مشکل ہو جاتا تھا۔ یہ شخص جس گاؤں کا رہنے والا تھا اس کی ایک لڑکی شاہ جی کے گاؤں سے کچھ دُور ایک اور گاؤں میں بیاہی گئی۔ شادی کے بعد لڑکی پہلی بار گاؤں آئی تھی۔ دُولہا ساتھ تھا۔ وہ دلہن کو اپنے گاؤں واپس لے جانے کے لیے رات کے پچھلے پہر چل پڑا۔ دُلہن ٹٹو پر سوار تھی دولہا باگ پکڑے آگے آگے چل رہا تھا۔ راستے میں بھیڑیوں نے دولہا پر حملہ کر دیا۔ ٹٹو

کی ہاگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ٹٹو بدک کر دوڑ پڑا۔ لڑکی گری نہیں۔ ٹٹو شاہ جی کے گاؤں میں داخل ہوگیا۔ لڑکی چیخ چلا رہی تھی۔ گاؤں والوں کی آنکھ کھلی تو وہ اسے چڑیل سمجھ کر ڈر گئے۔ کوئی باہر نہیں آتا تھا۔ بے لگام ٹٹو گاؤں کے اندر ہی دوڑتا رہا اور لڑکی مدد کے لیے دُہائی دُہائی کرتی رہی۔ آخر چار پانچ نوجوان کلہاڑیاں لے کے نکل آئے۔ انہوں نے بھی گاؤں والوں کو للکارا۔ قصہ مختصر یہ کہ ٹٹو کو پکڑ لیا گیا۔ لڑکی گری نہیں تھی۔

لڑکی نے انہیں بتایا کہ اس کے دُولہا کو بھیڑیوں نے پکڑ لیا ہے۔ شاہ جی کو جگایا گیا۔ وہ مسجد سے ملحق ایک مکان میں رہتے تھے۔ انہوں نے لڑکی کو دیکھا تو اسے اپنے مکان میں لے گئے۔ لڑکی پر دہشت سوار تھی۔ اسے اپنے دُولہا کا بھی غم تھا معلوم نہیں شاہ جی نے اسے کس طرح سنبھالا۔ اذان کے وقت سارا گاؤں شاہ جی کے گھر جمع ہوگیا۔ صبح طلوع ہوئی تو گاؤں والے دولہا کی تلاش میں نکلے۔ گاؤں سے ڈیڑھ دو میل دُور دُولہا کی لاش مل گئی۔ دونوں ٹانگیں اور بازوؤں کا کچھ گوشت کھایا ہُوا تھا۔ اس کے گاؤں اطلاع دی گئی۔ کہرام بپا ہوگیا۔ دُلہن کے لواحقین بھی آگئے۔ شاہ جی نے انہیں بتایا کہ جنّوں کو وہ حاضر کر کے پوچھ چکے ہیں۔ جنّوں نے بتایا ہے کہ یہ لڑکی انہیں اتنی پسند آئی ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے دُولہا کو ختم کرنا ضروری سمجھا۔ شاہ جی نے گاؤں والوں سے کہا ــــ "جنّوں نے مجھے کہا ہے کہ لڑکی خوش قسمت ہے کہ آپ کی پناہ میں آگئی ہے ورنہ ہم اس کے دُولہا کو مار کر اسے اٹھا لے جاتے ... اب تم لوگ فکر نہ کرو۔ مَیں نے لڑکی کے گلے میں تعویذ ڈال دیا ہے اور اس کے گرد حصار بھی کھینچ دیا ہے لیکن یہ جن بے مذہب ہیں۔ ہمارے کلامِ پاک کو نہیں مانتے۔ تم لڑکی کو لے جاؤ۔ اسے سات شام میرے پاس چھوڑ جایا کرو۔

بر عمل پورا ہو لے تو پھر یہ محفوظ ہو جائے گی" ـــــ چنانچہ لڑکی کو اُس کے والدین ہر شام شاہ جی کے مکان میں چھوڑ جاتے تھے جہاں شاہ جی تنہا رہتے تھے۔ ان کا بال بچہ نہیں تھا۔

یہ سوار جلدی میں تھا کیونکہ اس کا گھوڑا زخمی تھا۔ وہ ڈرا ہوا بھی تھا۔ وہ بھیڑیوں کو درندے نہیں جن کہہ رہا تھا۔ اس نے ہمیں کہا کہ ہم اُسے گاؤں تک چھوڑ آئیں۔ اس کا گاؤں خاصا دُور تھا۔ ہم تھکے ہوئے بھی تھے مگر اُسے ہم تنہا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ ہم سب اس کے ساتھ ہو لیے۔ کُتوں کو ہم نے کھلا چھوڑ دیا۔ اُس زمانے میں بے شک ہمارے علاقے میں بھیڑیے اور تُومڑ موجود تھے لیکن یہ ہم پہلی بار سُن رہے تھے کہ بھیڑیوں نے مویشیوں اور انسانوں پر حملے شروع کر دیئے ہیں۔ ان دو بھیڑیوں کے حملے بالکل اس طرح کے تھے جس طرح آپ انگریزی کتابوں اور اُردو رسالوں میں آدم خور شیروں کی کہانیاں پڑھا کرتے ہیں۔ اُس وقت جس وقت کی مَیں بات سُنا رہا ہُوں، ہم آدم خور شیروں اور انگریز شکاریوں کے کارناموں سے ناواقف تھے۔ مَیں نے یہ کہانیاں بہت بعد میں پڑھنی شروع کی تھیں۔

جہاں تک جنوں کا اور جلتے دیئے کے ہوا میں اُڑنے کا تعلق ہے، اس کی ہم تردید نہیں کر سکتے تھے۔ وہ زمانہ پسماندگی کا تھا۔ تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ ذرائع آمدورفت نہیں تھے۔ ہمارا علاقہ دشوار گزار اور ڈراؤنا تھا۔ لوگ جِنّوں بھوتوں کو مانتے تھے۔ ہم بھی مانتے تھے۔ آج جب زمانہ سائنس کے زور پر اتنی ترقی کر گیا ہے کہ انسان چاند تک بھی ہو آیا ہے ہم لوگ جِن اور راتوں کو اُڑتے ہوئے دیئے دیکھتے ہیں۔ اس گھوڑ سوار نے کشمیر کے شاہ جی کی کرامات سُنائی تو ہم انہیں دیکھنے کے لیے بے چین ہونے لگے۔ اُن دنوں اس قسم کے عاملوں اور بزرگوں کا احترام اس قدر زیادہ تھا کہ ہمارے بادشاہ انگریز نہیں بلکہ عامل، پیر اور تعویذ

دینے والے مولوی تھے۔ ہم لاابالی عمر کے لڑکے تھے۔ ہم ابھی خدا اور رسولؐ کے سوا کسی اور کو نہیں مانتے تھے۔ جوانی کا تازہ خون ہمیں پہاڑوں سے ٹکرا دیا کرتا تھا۔ ہم فلمی گانوں اور عشقیہ کہانیوں کے پروردہ نہیں تھے۔ ضمیر صاف تھے۔ دل میں کوئی خوف نہیں تھا اور دماغ جنسی خیالات سے پاک رہتے تھے۔ خوف اور گندے خیالات انسان کو جوانی میں ہی مُردہ کر دیتے ہیں۔ ہمیں کسی نے ابھی یہ زہر نہیں دیا تھا۔ ہم نے ان بھیڑیوں کو دیکھنے کا پکّا ارادہ کر لیا۔

ہم سوار کو اُس کے گاؤں لے گئے۔ اُس نے ہماری خاطر مدارات دل کھول کر کی۔ اپنے گاؤں کو واپس جاتے ہوئے ہم نے شاہ جی کے گاؤں آنے اور بھیڑیوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ہمارے دوستوں کی زیادہ تعداد ہمارے خلاف تھی۔ وہ کہتے تھے کہ جنوں سے ٹکر لینا ٹھیک نہیں۔ میری طبیعت میں خودسری اور سرکشی زیادہ تھی۔ میرے تین دوست، شہباز، موڑ اور افضل بھیڑیوں والے گاؤں میں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہم اپنے گاؤں سورج غروب ہونے کے بعد پہنچے۔ وہاں ہمارے پُرجوش استقبال کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ہم اتنی دیر سے کبھی واپس نہیں آئے تھے۔ ہم سب کی مائیں گاؤں کے باہر کھڑی تھیں۔ باپ اور چچے تائے ان کے پیچھے کھڑے تھے۔ اس سے پہلے شکار میں کئی حادثے ہو چکے تھے۔ ہمارے دو دوست مارے بھی جا چکے تھے، اس لیے اُس روز اتنی دیر ہو جانے سے سارا گاؤں پریشان تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی ماؤں نے گالیوں کی باڑ ماری۔ ہر ماں نے اندھیرے میں اپنے اپنے بیٹے کو ڈھونڈ لیا اور خیر خیریت گالیوں کی زبان میں پوچھی۔ انہیں جب پتہ چلا کہ ایک کُتّا مارا گیا ہے، اور موڑ تھوڑا سا زخمی ہے تو ماؤں کے غصّے میں غم بھی آ گیا مگر اس غم و غصّے میں غم کی مقدار بہت ہی تھوڑی تھی۔

ہمارے پاس بھیڑیوں کی سنسنی خیز خبر تھی جو ہم نے مردوں کی محفل میں بیٹھ کر سنائی۔ ایسی کہانیاں لوگ دلچسپی سے سُنا کرتے تھے۔ سب نے اپنی اپنی رائے دے کر متفقہ طور پر کہا کہ یہ بات بالکل سچ ہے۔ جلتا ہُوا دیار ات کو ضرور گزرتا ہے اور یہ دونوں بھیڑیئے جن ہیں۔ ہم بزرگوں سے جن اور دیا دیکھنے کی اجازت چاہتے تھے۔ ہم نے دوسرے دن اپنے بزرگوں کے سامنے کچھ بہانے پیش کر کے اس گاؤں میں جانے کی اجازت لے لی۔ وہ زمانہ موٹروں اور سکوٹروں کا نہیں گھوڑوں اور ٹٹوؤں کا تھا۔ ہم چاروں دوستوں کا اچھا زمیندارہ تھا۔ چاروں کے گھروں میں گھوڑے تھے۔ ہم شکار پر پیدل اس لیے جایا کرتے تھے کہ ہمارے سب دوستوں کے پاس گھوڑے نہیں تھے۔ ہم نے اُسی وقت گھوڑوں پر زینیں ڈالیں اور چودہ پندرہ میل کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ کُتوں کو ہم ساتھ نہیں لے گئے۔ سب کے پاس ایک ایک چابُک تھا۔ شہباز اور موٹر کے پاس کلہاڑیاں بھی تھیں۔ میں نے اور افضل نے چابُکوں کو ہی کافی سمجھا تھا۔

راستے میں ہم نے گھوڑ دوڑ کا مقابلہ بھی کیا اور جلدی ہی اُس گاؤں میں پہنچ گئے۔ وہ کوئی اتنا بڑا گاؤں نہیں تھا۔ ہمارے اندازے کے مطابق گھروں کی تعداد تیس اور چالیس کے درمیان تھی۔ تمام مکان کچے تھے۔ یہ اُن لوگوں کا گاؤں تھا جن کی اپنی زمین نہیں ہُوا کرتی تھی۔ دوسروں کی کھیتوں میں بٹائی پر کاشت کاری کرتے تھے۔ کہیں ویرانے میں تھوڑی جگہ کام کی نظر آجائے تو اسے ہل کدال سے قابلِ کاشت بنا لیتے تھے۔ ہماری کھیتیاں آج بھی بارشوں کی محتاج ہیں۔ یہ علاقہ نہروں کے قابل نہیں۔ یہ لوگ اسی قسم کے کسان تھے۔ اُن کے ساتھ ضرورت کے مطابق لوہار، ترکھان اور بڑھئی تھے۔ جہاں اُن کے مکان تھے وہ زمین بھی ان کی ملکیت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ زمینوں کی تلاش میں نقلِ مکانی کرتے رہے اور گاؤں اُجڑ گیا۔ آج اُس کا نشان بھی نظر نہیں آتا۔ ہمارے علاقے میں میرے سامنے اس

نسل کے لوگوں نے گاؤں آباد کیے اور ایک ایک کر کے جانے کہاں چلے گئے۔

اس گاؤں کا نام ڈھوک مست تھا۔ ہم وہاں گئے تو گاؤں والے ہمارے گھوڑوں اور کپڑوں سے ایسے مرعوب ہوئے کہ اپنے چہروں کا تاثر چھپا نہ سکے۔ ہم نے گھوڑوں سے اُتر کر بھیڑیوں کا ذکر چھیڑ دیا اور دلچسپی کا اظہار کیا۔ ہمارے لیے چارپائیاں، کھیس اور سرہانے آ گئے۔ ایک درخت کے نیچے ہمیں بٹھایا گیا۔ بھیڑیوں کے متعلق انہوں نے بالکل وہی باتیں بتائیں جو وہ گھوڑ سوار ہمیں سُنا چکا تھا جس پر بھیڑیوں نے حملہ کیا تھا۔ اپنے شاہ جی کے کہنے پر انہیں پورا پورا یقین تھا کہ یہ بھیڑیئے جن ہیں۔ ذرا سی دیر میں گاؤں کے سارے ہی آدمی، بوڑھے، جوان اور بچے ہمارے اِردگرد جمع ہو گئے۔ ہمیں بھیڑیوں کی باتیں سُنانے والوں کے لہجے میں خوف تھا اور یہ خوف ہر کسی کے چہرے پر تھا۔ اگر بھیڑیئے صرف مویشیوں پر حملے کرتے تو کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ انہوں نے ایک نوجوان لڑکی کو شادی کے چوتھے پانچویں روز بیوہ کر دیا تھا اور پھر ایک گھوڑ اسوار پر بھی حملہ کیا تھا۔ ان حادثوں کی دہشت اس گاؤں کے ماحول میں صاف نظر آ رہی تھی۔ ان لوگوں کو اپنے شاہ جی پہ بھروسہ تھا۔ ہر بات میں اُن کا حوالہ دیتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں دس بار ایک جلتا ہُوا دِیا ہوا میں جاتا نظر آیا ہے۔

ہم چاروں دوست دانشمند نہیں تھے۔ ہم صرف جوان تھے اور خطروں میں کُود جانے کا ہمیں خبط تھا۔ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ بھیڑیئے جن نہیں ہیں۔ ہم بھی اسی دیہاتی معاشرے کے فرد تھے۔ ہم اس کی بھی تردید نہیں کر سکتے تھے کہ رات جلتا ہُوا دِیا ہوا میں چلتا ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ تھی کہ ہم جِن بھی دیکھنا چاہتے تھے اور دیا بھی۔ اس کے ساتھ ہی معلوم نہیں ہمارے اندر وہ کونسا جِن داخل ہو گیا تھا جو ہمیں کہہ رہا تھا کہ کُتے لے آؤ اور بھیڑیوں کو مارو۔ یہ ہماری احمق اور نادان جوانی کا فتور تھا کہ ہم نے گاؤں والوں سے کہہ دیا

کہ ہمارے پاس درجن سے زیادہ شکاری اور خونخوار کتے ہیں۔ ہم بھیڑیوں کو کتوں سے مروا دیں گے۔

گاؤں کے لوگ تڑپ اُٹھے۔ بعض نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ ایک بوڑھے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یہ امیروں کے چھوکرے زمینوں اور گھوڑوں کے نشے میں ہم سب کو مروائیں گے۔ یہ شاہ جی کی برابری کرتے ہیں"۔۔۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہم نے سارے گاؤں کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ ہم نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔

شاہ جی آ گئے۔ سارے لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سب ماتھوں پر ہاتھ رکھ کر جھک گئے۔ ہم بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شاہ جی نے ہمیں گھور کر دیکھا اور اُس چارپائی پر بیٹھ گئے جو اُن کے لیے خالی کر دی گئی تھی۔ ہم ساتھ والی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ہماری یہ حرکت نہ شاہ جی کو پسند آئی نہ گاؤں والوں کو۔ کہ ہم شاہ جی کے برابر چارپائی پر بیٹھ گئے تھے۔ یہ اُن کے چہرے سے پتہ چلتا تھا۔ شاہ جی کی عمر تیس سال سے ذرا زیادہ ہو گی۔ اُن کا قد کاٹھ درمیانہ تھا۔ چہرہ سپید اور گلابی۔ ڈیڑھ دو انچ لمبی داڑھی تھی جس کا رنگ بھورا تھا۔ آنکھوں کا رنگ شربتی تھا لیکن ان آنکھوں میں معلوم نہیں جلال تھا یا کوئی جادو کہ انہوں نے جب میری آنکھوں میں دیکھا تو میرے دل کو دھکا سا لگا۔ مجھے وہ آنکھیں آج پچاس سال بعد بھی اس طرح یاد ہیں جیسے مجھے اب بھی گھور رہی ہیں۔ میرا یہ کہنا جھوٹ نہیں ہو گا کہ شاہ جی کی آنکھیں اُس جنگلی بلّے کی آنکھوں سے ملتی جلتی تھیں جس نے درخت پر موٹر پر حملہ کیا تھا۔ مَیں نے اُس بلّے کی آنکھوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور بلّے کی آنکھوں نے مجھے اسی طرح دیکھا تھا جس طرح شاہ جی دیکھ رہے تھے۔ مجھے یقین آ گیا کہ اگر یہ شخص خود جن کے بدلے ہوئے روپ میں نہیں تو اس کے قبضے میں جن ضرور ہیں اور یہ دونوں بھیڑیئے بھی جن ہیں۔

"سُنا ہے تم بھیڑیوں کو کُتّوں سے مروانے کی باتیں کر رہے ہو؟" شاہ جی نے جلالی کیفیت میں ہم سے پوچھا ـــــ "ان غریب لوگوں کو جنّوں سے تباہ کرانا چاہتے ہو؟"

"سرکار!" راجہ شہباز خان نے کہا ـــــ "ہم نادان ہیں۔ یہی سمجھ کر آئے ہیں کہ بھیڑیا بھیڑیا ہی ہوتا ہے جن نہیں ہو سکتا۔ ہم اس گاؤں کو اس مصیبت سے بچانا چاہتے ہیں۔"

"کل ایک آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر اس گاؤں کو مصیبت سے بچانے چلا تھا۔" شاہ جی نے کہا ـــــ "وہ پولیس کی مدد لینے جا رہا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ انگریز بادشاہ بھیڑیوں کو مارنے کا بندوبست کر دے گا۔ مَیں اسے بلاتا ہوں۔ اس سے پوچھنا کہ تم تھانے تک پہنچ گئے تھے؟"

"ہم اُسے دیکھ چکے ہیں سرکار!" ـــــ مَیں نے کہا اور شاہ جی کو بتایا کہ اس کی ہم سے کس طرح ملاقات ہُوئی تھی۔

"سنو لڑکو!" شاہ جی نے کہا۔ "تین مہینے گزرے مَیں اس گاؤں سے گزر رہا تھا۔ یہ دونوں شاگرد میرے ساتھ تھے۔" اُن کے پاؤں میں دو اُدھیڑ عمر آدمی بیٹھے تھے جو پوٹھوہاری معلوم نہیں ہوتے تھے۔ وہ شاہ جی کے چیلے تھے۔ شاہ جی نے کہا ـــــ "مجھے بہت دُور جانا تھا۔ کشمیر سے ایک جن میرے قبضے سے فرار ہو کر سکیسر کی پہاڑیوں میں چلا گیا تھا۔ مَیں اس کے پیچھے جا رہا تھا۔ اس گاؤں کے قریب آیا تو مجھے آواز آئی کہ یہ گاؤں صاف کرو پھر آگے چلیں گے۔ مَیں نے آواز پہچان لی۔ یہ جنّوں کی آواز تھی۔ مَیں رُک گیا اور سوچنے لگا کہ مَیں آگے نکل گیا تو اس گاؤں کے لوگ بے گناہ مارے جائیں گے۔ مَیں نے جنّوں کو پکارا اور پوچھا کہ تمہارا مذہب کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارا کوئی مذہب نہیں، تم جہاں جا رہے ہو جاؤ۔ یہ دونوں گواہ ہیں۔ ان سے پوچھو۔ مَیں نے جنّوں سے کہا کہ مَیں اسی گاؤں میں رُک جاؤں گا۔ ہمت ہے تو گاؤں کے قریب آنا۔ مَیں نے مسجد میں ڈیرہ ڈال دیا۔ ان

لوگوں نے مجھے مسجد کے ساتھ والا مکان دے دیا۔ جن چونکہ بے مذہب ہیں اس لیے انہوں نے مجھے بہت تنگ کیا۔ کبھی میرا لوٹا غائب کر دیتے، کبھی کپڑے اُٹھا لے جاتے، کبھی مصلّے باہر پھینک دیتے۔ ایک رات انہوں نے میرا قرآن مجید پھاڑ ڈالا لیکن مَیں نے انہیں گاؤں کے کسی آدمی کے قریب نہیں آنے دیا۔"

شاہ جی کی آواز میں اور لہجے میں ایسا جادو تھا کہ محفل پر سناٹا طاری ہو گیا۔ ہماری یہ حالت تھی جیسے ہمارے سروں پر جن اُڑ رہے ہوں۔ شاہ جی نے کہا ـــــ "وہ جن بدبخت بے مذہب ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ مجھ میں اتنی طاقت ہے جو انہیں گاؤں میں نہیں آنے دیتی تو وہ بھیڑیوں کے رُوپ میں گاؤں کے لوگوں کو تنگ کرنے لگے۔ مَیں انہیں قابو کر لوں گا۔ میرے دو جن کشمیر میں جھیل سیف الملوک میں ہیں۔ مَیں نے انہیں بلایا ہے۔ جنّوں کو بلانا آسان کام نہیں ہوتا۔ اس میں میری جان ہر وقت خطرے میں رہتی ہے۔ اُن تک میرا پیغام پہنچ گیا ہے۔ وہ تین چار دنوں تک آ جائیں گے ... اگر تمہیں میری طاقت پر شک ہے تو آج رات یہیں ٹھہرو۔ میرا ایک جن گاؤں کے اردگرد پہرہ دیتا رہتا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں دِیا ہوتا ہے۔ رات کو تمہیں اُس کا دِیا دکھاؤں گا۔ تم بھیڑیوں کو مارنے کا خیال دل سے نکال دو۔ خود بھی مارے جاؤ گے اور اس پورے گاؤں کو بھی مروا ؤ گے۔"

چند اور باتوں کے بعد ہم نے ہوا میں دِیا دیکھنے کی خواہش ظاہر کی لیکن ہم اُس رات وہاں ٹھہر نہیں سکتے تھے کیونکہ گھر والوں کو یہ بتا کر آئے تھے کہ ہم شام سے پہلے پہلے آ جائیں گے۔ شاہ جی کے گھٹنے چھو کر ہم رخصت ہوئے۔ ہم چاروں دوست قائل ہو گئے تھے کہ بھیڑیے دراصل جن ہیں۔ اب ہم جلتا دیا ہوا میں جاتا دیکھنا چاہتے تھے ... دوسرے دن ہم نے گھر والوں سے اجازت لے لی اور سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے شاہ جی کے گاؤں چلے

گئے۔ ہم انہی کے گھر کے سامنے گھوڑوں سے اُترے۔ شاہ جی باہر آئے۔ ہمیں اندر لے گئے۔ ہمارے گھوڑے اُن کے دونوں چیلوں نے پکڑ لیے۔ ہم اندر بیٹھے ہی تھے کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی اندر آیا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ وہ خوبصورت تھی مگر اس کا چہرہ مریضوں جیسا تھا اور اس کی آنکھوں کی حالت ایسی تھی جیسے غنودگی میں ہو۔ شاہ جی نے بتایا کہ اس لڑکی کے دولہا کو جنّوں نے مار ڈالا ہے اور اب اسے ڈراتے رہتے ہیں... شاہ جی نے لڑکی کے باپ سے کہا کہ اسے اندر لٹا دو اور تم جاؤ۔

باپ اپنی بیٹی کو شاہ جی کے کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ شام کی نماز کا وقت ہو گیا۔ ہم نے شاہ جی کی اذان سُنی۔ اللہ نے کیا پُرسوز آواز دی تھی شاہ جی کو۔ لوگوں کا یہ کہنا غلط نہیں لگتا تھا کہ شاہ جی کی اذان سُننے کے لیے جن بھی رُک جاتے ہیں۔ ہم چاروں دوستوں نے شاہ جی کے پیچھے نماز پڑھی۔ انہوں نے ہمارے لیے مرغیاں پکوائی تھیں۔ اُن کے دونوں چیلوں نے ہمیں کھانا کھلایا اور رات کا اندھیرا چھا گیا۔ ہمیں رات ٹھہرانے کے لیے ایک اور گھر میں انتظام کیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد ہمیں وہاں لے گئے۔ شاہ جی ساتھ تھے اور اُن کے ساتھ ایک ہی چیلا تھا۔ دوسرا معلوم نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ شاہ جی وجد میں آ کر ہمیں جنّوں اور چڑیلوں کے قصّے سناتے رہے، اور ہم ان کی کرامات کے قائل ہو گئے۔

شاہ جی نے اچانک کہا ـــــ "وہ اُس طرف آ گئے ہیں۔ اُٹھو" ـــــ وہ ہمیں اسی مکان کی چھت پر لے گئے۔ رات کا اندھیرا گہرا تھا۔ کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ ہمارے ساتھ چھت پر کئی اور آدمی موجود تھے۔ شاہ جی نے کہا ـــــ "انہیں اس وقت اُدھر ہونا چاہیئے"۔ انہوں نے تالاب کی طرف اشارہ کیا اور بلند آواز سے کہا ـــــ "او تے کہاں ہو۔ پہرہ نہیں دے رہے"؟ ـــــ ہم سے کہنے لگے ـــــ "جن بھی انسانوں کی طرح کام چور

ہوتے ہیں۔ میں انہیں گاؤں کی چوکیداری پر لگاتا ہوں تو کبھی کبھی سوجاتے ہیں" ——
انہوں نے چونک کر کہا —— "وہ دیکھو"

ہم نے اُدھر دیکھا۔ کوئی دو اڑھائی فرلانگ دُور ایک دیئے کی لَو زمین سے سات آٹھ فٹ اُوپر نظر آئی اور آگے چل پڑی۔ بیس پچیس قدم آگے گئی اور غائب ہوگئی۔ وہیں سے پھر نظر آئی اور واپس چل پڑی۔ اللہ توبہ! میری دلیری اور مردانگی جواب دے گئی۔ ہمارے پاس جو آدمی کھڑے تھے انہوں نے بلند آواز سے کلمہ شریف کا وِرد شروع کر دیا۔ ہم چاروں دوست بھی کلمہ شریف پڑھنے لگے۔ جلتا ہُوا دِیا جس کی صرف لَو نظر آ رہی تھی ہوا میں چلا جا رہا تھا۔ رات بڑی ہی خاموش تھی۔ اندھیرا دہشت ناک تھا۔

دِیا غائب ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اُدھر سے کسی کی چیخ کے ساتھ بھیڑیوں کے بھونکنے اور غرّانے کی مِلی جُلی آوازیں بھی سنائی دیں۔ شاہ جی کے منہ سے آواز نکلی —— "اوہ خدایا" —— ہم کتّوں کی اُس وقت کی آوازوں کو پہچانتے تھے جب وہ شکار کو جھنجھوڑتے تھے۔ ہمیں ویسی ہی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں اور یہ بھی معلوم ہوتا تھا جیسے ان آوازوں میں کسی کے کراہنے کی بلند آوازیں بھی شامل ہیں۔ میں نے کہا —— "ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے بھیڑیوں نے کسی کو پکڑ لیا ہے" —— شاہ جی کچھ بھی نہ بولے اور چھت سے اُتر گئے۔ ہم بھی اُترے۔ ہماری ذہنی اور جذباتی حالت عجیب تھی۔ ہوا میں چلتا ہُوا دیا آنکھوں کے سامنے سے ہٹتا نہیں تھا اور جب یہ خیال آتا کہ وہ کیسی آوازیں تھیں اور شاہ جی کے منہ سے "اُوہ خدایا" کیوں نکلی تھی اور وہ کیوں چلے گئے تھے تو دل میں خوف زیادہ ہو جاتا تھا۔ ہم نے آپس میں اس پر تبادلہ خیالات کیا تو مجھے معلوم ہُوا کہ میرے دوست بھی ڈرے ہُوئے ہیں۔ مجھے خوشی ہُوئی کہ میں اکیلا خوفزدہ نہیں۔

ہم سو گئے۔

صبح شاہ جی کی اذان پر ہماری آنکھ کھلی۔ ہم مسجد میں چلے گئے۔ شاہ جی گھبرائے ہوئے لگتے تھے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ رات کی طرح کوئی بات نہ کی۔ اکھڑی اکھڑی ایک دو باتیں کیں۔ ان کا وہ چیلا آگیا جو رات چھت پر اُن کے ساتھ تھا۔ شاہ جی نے اس سے پوچھا ــــ "گئے تھے؟" ــــ اس نے جواب دیا ــــ "نہیں"۔ شاہ جی نے غصّے میں اسے کہا ــــ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اسی وقت جانا کیوں ضروری ہے"ــــ چیلے نے جواب دیا ــــ "اپنی جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ روشنی ہونے تک میں نہیں جاؤں گا"۔ شاہ جی نے اُسے غصّے سے گھورا اور چُپ رہے۔ اتنے میں گاؤں کے لوگ مسجد میں آنے لگے۔ ہم نے شاہ جی کے پیچھے باجماعت نماز پڑھی۔ نماز کے بعد گاؤں کے بہت سے آدمی مسجد میں ہی بیٹھے رہے اور شاہ جی سے باتیں کرنے لگے۔ صبح کی روشنی صاف ہوگئی تھی۔ شاہ جی نے ہمیں کہا ــــ "تم چاروں اپنے گاؤں کو روانہ ہو جاؤ۔ پھر کبھی بھیڑیوں کو مارنے کا نام نہ لینا"۔

ہم اِن سے ہاتھ ملا کر باہر نکلے اور اُس گھر تک گئے جہاں ہمارے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ایک آدمی تالاب کی طرف سے دوڑتا آرہا تھا اور کہہ رہا تھا ــــ "ظلم ہوگیا۔ لوگو ظلم ہوگیا"ــــ ہم نے اُسے آگے ہو کر روک لیا۔ وہ بہت ہی گھبرایا ہُوا تھا۔ اس نے کہا۔ شاہ جی کے شاگرد کی لاش وہاں پڑی ہے۔ بھیڑیوں نے آدھی لاش کھالی ہے"۔

ہم نے اور کچھ نہیں سُنا۔ شہباز اور موٹر دوڑ کر اندر گئے اور اپنی کلہاڑیاں اُٹھا لائے۔ ہم دوڑتے ہوئے تالاب کی طرف گئے۔ وہاں گاؤں کے تین آدمی کھڑے تھے۔ جا کر دیکھا۔ شاہ جی کے چیلے کی لاش پڑی تھی۔ چہرہ صاف تھا۔ سینے اور کندھوں سے گوشت کھایا ہُوا تھا۔

ایک ٹانگ کی صرف ہڈیاں رہ گئی تھیں اور عجیب چیز یہ دیکھی کہ لاش سے دو تین گز دور مٹی کا دیا اُلٹا پڑا تھا۔ تیل زمین پر گرا ہُوا تھا۔ لاش کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ اس کے قریب ایک ماچس پڑی تھی۔ زمین پر بھیڑیوں کے پنجوں کے نشان بالکل صاف تھے۔ ہم فوراً سمجھ گئے کہ یہ سب فراڈ ہے۔ مَیں نے دِیا اور ماچس اُٹھائی۔ دِیا اس چیلے کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے ہاتھ اوپر کر رکھا تھا۔ اسی لیے دِیا زمین سے سات آٹھ فٹ اُوپر نظر آتا تھا۔ دراصل دِیا نہیں دیئے کی لَو نظر آتی تھی۔ شاہ جی کا یہ چیلا بلند پودوں کے پیچھے تھا۔ اچانک بھیڑیئے آگئے اور چیلے کو پکڑ کر کھا لیا۔ لوگ جمع ہونے لگے اور شاہ جی بھی آگئے۔ انہوں نے عجیب و غریب حرکتیں اور باتیں کیں جن کا لُبِ لباب یہ تھا کہ مَیں نے اس شاگرد کو منع کیا تھا کہ جنّوں کے ساتھ میری دشمنی ہے۔ رات کو گاؤں سے باہر نہ جانا مگر موت اِسے گاؤں سے باہر لے گئی۔ اب تم لوگ دیکھنا، مَیں ان بے مذہب جنّوں کو تمہارے سامنے جلاؤں گا۔ پھر انہوں نے ہمیں غصّے کے عالم میں کہا۔ "یہ موت تمہاری وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ تم بھیڑیوں کو مارو گے۔ تم نے جنّوں کا دِیا دیکھ لیا ہے۔ اب تم چاروں یہاں سے چلے جاؤ۔"

گاؤں کے لوگوں نے ہمیں اس طرح دھتکارا کہ اگر ہم ذرا دیر اور وہاں رُکتے تو وہ ہمیں جان سے مار ڈالتے۔ مورڑ طبیعت کا تیز تھا۔ اس نے ایک غلطی کر دی۔ اس نے مجھے اور شاہ جی کو پرے بلایا اور الگ لے گیا۔ مجھے کہنے لگا۔ "صابو! شاہ جی کو دِیا اور ماچس دکھاؤ۔" مَیں نے بھی کم عقلی کی۔ کُرتے کی جیب سے دیا اور ماچس نکال کر شاہ جی کو دکھائی۔ مَیں نے اس ارادے سے یہ دونوں چیزیں جیب میں ڈال لی تھیں کہ سوہاوہ تھانے میں اس واقعہ کی رپورٹ لکھوائیں گے اور یہ چیزیں تھانیدار کو دیں گے۔ شاہ جی نے گھبراہٹ کے لہجے میں کہا۔ "ارے بدبخت لڑکے یہ مجھے دے دے۔ یہ جنّوں کی چیزیں ہیں۔ تمہیں وہ راستے میں ہی ختم

کر دیں گے۔"

مَیں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "اب اپنی خیر مناؤ شاہ جی! ہم تمہیں یہ بھیڑیئے مار کر دکھا دیں گے۔" مَیں نے دِیا اور ماچس جیب میں ڈال لی۔ یہاں ایک غلطی مجھ سے بھی ہو گئی۔ مَیں نے کہا — "یہ چیزیں تھانے جا رہی ہیں۔ ایک آدمی مارا گیا ہے۔ یہ قتل کی واردات بھی ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے ایک اور آدمی مارا گیا ہے اور تم ان موتوں کو چھپا رہے ہو" — شہباز اور افضل بھی ہمارے پاس آ گئے تھے۔ ہم نے انہیں کہا کہ چلو بھائیو۔

ہم اپنے گھوڑے لینے کے لیے گاؤں میں گئے۔ زِینیں کس رہے تھے تو گاؤں کے وہ سارے آدمی آ گئے جو لاش دیکھنے چلے گئے تھے۔ اُن کے آگے اُن کا شاہ جی تھا۔ اُس نے للکار کر کہا — "خبردار، گھوڑوں پر سوار نہ ہونا۔ وہ چیزیں یہاں رکھ دو۔"

ہم نے اُن لوگوں کے ارادے بھانپ لیے۔ شاہ انہیں بھڑکا کر لایا تھا۔ وہ لوگ اس کے جادو میں گرفتار تھے اور اُن پر اُس نے جنّوں کی دہشت طاری کر رکھی تھی۔ اس کے اشارے پر وہ مرنے مارنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ ہم چاروں بڑی پھُرتی سے گھوڑوں پر سوار ہُوئے اور ایڑ لگا دی۔ گھوڑے اچھے تھے، یکلخت سرپٹ دوڑ پڑے۔ لوگوں نے ہمیں رُکنے کے لیے للکارا۔ ہم اس ہجوم کو چیرتے ہُوئے نکل گئے۔ گاؤں سے دُور جا کر مَیں نے موڑ کو اور اپنے آپ کو کوسا کہ ہم نے شاہ پر اپنا ارادہ ظاہر کر دیا تھا۔ اب جو ہو گیا سو ہو گیا تھا۔ ہم یہ جان چکے تھے کہ یہ شاہ بہت بڑا فراڈ کھیل رہا ہے اور ہمیں "جِنّوں کا دِیا" دکھانے کے لیے اپنا ایک چیلا مروا بیٹھا ہے۔

اُس زمانے میں سوہاوہ تھانہ نہیں پولیس چوکی تھی۔ سوہاوہ گاؤں تھا اب تو قصبہ

بن گیا ہے۔ ہم چوکی میں چلے گئے۔ تھانیدار مسلمان تھا۔ ہم اسے بالکل نہیں جانتے تھے۔ پتہ چلا کہ کیمبل پور کے کسی گاؤں کا رہنے والا ہے اور اس کا نام ملک امداد حسین ہے۔ اُس روز قتل کا ایک کیس آگیا تھا جس میں تھانیدار مصروف تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد اس نے ہمیں اندر بلایا۔ ہمارے گھوڑوں نے اس پر اچھا اثر ڈالا۔ ہم نے اُسے ساری کہانی سنائی۔ اس نے نہایت دلچسپ گالیاں دے کر کہا ــــ "میرے کیمبل پور کے علاقے میں اور یہاں پوٹھوہار میں اس سے بھی زیادہ عجیب اور خطرناک واقعات ہوتے ہیں۔ لوگ اتنے جاہل ہیں کہ نوسر بازوں کے چکر میں آجاتے ہیں"۔

اُس دَور کی پولیس آج کی پاکستانی پولیس کے اُلٹ تھی۔ آج کل تھانے والے قتل کے کیس سے بھی جان چھڑانے یا دونوں پارٹیوں سے پیسے جھاڑنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ملک امداد حسین نے ہماری بات پوری دلچسپی سے سُنی۔ دِیا اور ماچس دیکھ کر ہنس پڑا۔ کہنے لگا "میرے علاقے میں بھی رات کو جلتے ہُوئے دیئے اُڑا کرتے ہیں" ــــ یہ کہہ کر اُس نے ایک سپاہی کو آواز دے کر کہا ــــ "گھوڑا تیار کرو اور چار آدمی رائفلوں والے باہر نکالو" اس شخص نے ذرہ بھر ٹال مٹول نہ کی، وقت بھی ضائع نہ کیا اور سپاہیوں کو گاؤں کا نام بتا کر کہا کہ چل پڑو، ہم آتے ہیں۔ اُن کی روانگی سے تھوڑی دیر بعد تھانیدار ہمارے ساتھ روانہ ہوگیا۔ حالانکہ اس کے سر پر قتل کا کیس سوار تھا۔ اس نے ہمارے سامنے لاش گوجر خان سرکاری ہسپتال کو برائے پوسٹمارٹم روانہ کی تھی، مگر ذرا سا بھی اکتایا ہُوا نہیں تھا۔ آج اس تھانیدار کو یاد کرتا ہوں تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملک امداد حسین نہیں ملک احمد یار خان تھا۔ ڈیوٹی کا پابند، خوش مزاج اور چُست و چالاک۔ ہم چونکہ عمر میں اُس سے بہت چھوٹے تھے اس لیے وہ ہمارے ساتھ بڑی دلچسپ اور مزاحیہ گپیں مارتا گیا۔ اس نے ہمیں اس پرانو

بہت ہی شاباش دی کہ ہم نے جنّوں بھوتوں سے ڈرنے کی بجائے اسے جرم کی واردات سمجھا اور چوکی میں اطلاع دے دی۔

ملک امداد حسین نے تو وقت ضائع نہیں کیا لیکن بہت وقت گزر گیا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تو ملک قتل کے کیس میں مصروف ہونے کی وجہ سے ہمیں مل ہی نہیں سکا تھا۔ گاؤں پانچ چھ میل دُور تھا۔ آنے جانے میں وقت لگا۔ اس کا نتیجہ بڑا خراب نکلا۔ ہم جب گاؤں میں پہنچے تو گاؤں کے لوگ قبر کھود چکے تھے۔ لاش جنازے کے لیے تیار تھی اور ابھی گاؤں میں پڑی تھی۔ اسے کھدر کے کفن میں لپیٹ دیا گیا تھا اور لوگ شاہ جی کے انتظار میں تھے۔ جنازہ انہیں ہی پڑھانا تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ جب ہم گھوڑے دوڑاتے گاؤں سے نکل گئے تو شاہ نے انہیں بڑے غصّے میں کہا —— "مَیں ان چاروں کو ختم کروا کے آتا ہوں۔ مجھے دو ٹٹّو دو" —— گاؤں میں ایک بھی گھوڑا نہیں تھا۔ لوگوں نے اسے دو ٹٹّو تیار کر دیئے۔ ایک پر شاہ خود سوار ہوا، دوسرے پر اس نے اپنے چیلے کو سوار کرایا اور دونوں چلے گئے۔ تھانیدار کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ شاگرد جس ٹٹّو پر سوار ہوا تھا اس پر ایک بڑی سی گٹھڑی بھی تھی اور ایسی کوئی چیز شاہ جی کے ٹٹّو پر بھی تھی۔ ہمارے اندازے کے مطابق انہیں گئے ہوئے چار گھنٹے گزر گئے تھے۔ شاہ کو ہم غلطی سے بتا چکے تھے کہ ہم تھانے رپورٹ کریں گے اس لیے وہ چیلے سمیت بھاگ گیا تھا۔

ملک امداد حسین نے کہا —— "لو بھئی! وہ تو گئے۔"

پوٹھوہار کا علاقہ ایسا ہے کہ فرار آسان اور تعاقب بہت مشکل ہے۔ اُس دَور میں جب جنگل اور ویرانے زیادہ اور آبادیاں کم تھیں، تعاقب ناممکن تھا۔ شاہ اور اس کا چیلا اُس گاؤں سے بھاگے تھے جس کے قریب پہاڑیاں تھیں۔ تھانیدار نے لاش دیکھی پھر

موقعہ واردات پر گیا اور شام تک مختلف لوگوں کے بیان لیتا رہا۔ اُس نے اُس دلہن کو بھی بلایا جسے بھیڑیوں نے بیوہ کر دیا تھا، اُس نے تین عورتوں سے بھی بیان لیے۔ ہر ایک سے الگ الگ بیان لیے گئے تھے۔ تھانیدار جرح بھی کرتا رہا۔ آخر اُس نے ہمیں شاہ اور چیلوں کے جرم کو اس شکل میں واضح کیا کہ وہ گھاگھ جرائم پیشہ ہے۔ اُس نے ان سیدھے سادے لوگوں کو اپنے ساتھیوں کی مدد سے راتوں کو ہوا میں چلتا دیا دکھا کر اور کئی ایک شعبدہ بازیوں سے دہشت زدہ کر لیا اور ان کا رکھوالا بن گیا۔ اس نے ان غریبوں سے نقدی بھی اینٹھی اور تین گھروں سے زیورات تک ہتھیا لیے۔ اُس کی نظر جس عورت اور لڑکی پر پڑی اُسے اُس نے خراب کیا۔ قدرت نے دو خونخوار بھیڑیئے بھیج کر اس کی مدد کی۔ اس نے بھیڑیوں سے یہ فائدہ اُٹھایا کہ لوگوں کو قائل کر لیا کہ یہ جن ہیں۔ یہ صرف اتفاق کی بات تھی کہ ایک آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر تھانے رپورٹ دینے جا رہا تھا کہ بھیڑیوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ شاہ کے اس فلسفے کو لوگوں نے برحق مانا کہ جو کوئی بھیڑیوں کے خلاف کارروائی کرے گا وہ مارا جائے گا۔ شاہ اس بیوہ دلہن کو راتوں کو اپنے پاس رکھ کر اسے کوئی نشہ پلا کھلا کر خراب کرتا رہا۔ اسی نشے اور شاہ کے مجرمانہ سلوک کا اثر تھا کہ لڑکی مریض لگتی تھی۔ آخر ڈرامے کو بھیڑیوں نے اس طرح ختم کیا کہ شاہ کے چیلے کو ہی کھا گئے۔ اگر ہم چار دوست یہاں نہ آتے تو شاہ اتنے بڑے حادثے کے بعد بھی ان لوگوں کی عقل پر پردہ ڈالے رکھتا۔

ہمیں یاد آیا کہ صبح مسجد میں شاہ اپنے چیلے سے کہہ رہا تھا کہ تم ابھی جاؤ، مگر چیلا کہہ رہا تھا کہ اپنی جان ہر کسی کو پیاری ہوتی ہے، روشنی ہوگی تو جاؤں گا۔ شاہ دراصل اپنے چیلے کی لاش اور دیا غائب کرنا چاہتا تھا لیکن خود وہاں جانے سے ڈرتا تھا۔ اس کا چیلا بھی ڈرتا تھا۔ اس طرح اُن کا راز فاش ہو گیا۔

تھانیدار نے گاؤں والوں کو بہت شرمسار کیا، انہیں دِیا اور ماچس دکھا کر بتایا کہ یہ دِیا شاہ کے چیلے کے ہاتھ میں تھا، کسی جن کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اور انہیں بتایا کہ وہ کل ہی بھیڑیوں کے مارنے کا انتظام کر دے گا۔ یہ یقین ہو گیا تھا کہ بھیڑیئے رات کو اس گاؤں کے قریب آتے ہیں۔ اب انہوں نے یہاں ایک اور انسان کھا لیا تھا اس لیے ان کا یہاں دوبارہ آنا قدرتی امر تھا۔ پینے کے لیے وہاں پانی بھی تھا۔ ملک امداد حسین نے ہمیں بتایا کہ کل رات وہ دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لائے گا اور تالاب کے کنارے بکرا بندھوا کر درخت پر کانسٹیبلوں کو بٹھا دے گا۔ مَیں نے اسے کہا — "ملک صاحب! یہ کام ہمیں کرنے دیں۔ ہم کل شام کُتے لے آئیں گے۔ آپ بھی آجائیں۔ یہ کھیل ہمیں کھیلنے دیں۔"

وہ مان گیا۔ آدمی خوش مزاج تھا۔ طے ہُوا کہ کل شام کو ہم کُتے لے کر آجائیں گے اور وہ بھی آجائے گا۔ اُس نے ہمیں یہ بھی بتا دیا کہ اس کے لیے یہ کام کھیل تماشہ نہیں۔ یہ اس کی ڈیوٹی ہے اور اسے ان دو واموات کو اپنے ریکارڈ پر لانا ہوگا اور بھیڑیوں کے خاتمے کو بھی اپنی کارروائی کی ڈائری میں لکھنا ہوگا، لہٰذا وہ یہ کام ہمارے سپرد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس میں ہماری جان کا خطرہ تھا۔

رات ہم بہت دیر سے اپنے گاؤں میں گئے اور سب کو یہ واقعہ سُنایا اور انہیں بتایا کہ ہم اگلے روز بھیڑیوں کو مارنے جا رہے ہیں۔ اس مسئلے پر بڑے آدمیوں یعنی باپوں، چچوں وغیرہ میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اختلاف یہ تھا کہ یہ بھیڑیئے جن ہی ہوں گے۔ لہٰذا لڑکوں کو نہ جانے دیا جائے۔ میرے والد صاحب اور تین اور والد صاحبان کہتے تھے کہ یہ بھیڑیئے ہیں اور لڑکوں کو جانا چاہیے۔ ہماری ماؤں کو پتہ چلا تو اُن کا ردِ عمل ایسا تھا جیسے وہ ہمیں کُتوں کے ساتھ زنجیروں سے باندھ دیں گی۔ دوسرے دن یہ واردات سارے گاؤں میں مشہور

ہوگئی۔ میری خالہ آئی تو مجھے کہا ــــ "صابو پتر! تم نہ جانا" ــــ ساس آئی تو اس نے کہا ــــ "صابو! خبردار جو تو گیا تو" ــــ میں نے انہیں تسلّی دی تو ماں نے کہا ــــ "یہ کیوں نہیں جائے گا۔ یہ اپنے باپ کا اصل حرامی بیٹا ہے" ــــ معلوم ہُوا کہ میرے ہر ایک دوست کے ساتھ یہی کچھ ہُوا تھا۔

دوپہر کے بعد ہماری پوری کی پوری شکاری ٹیم اور دس کُتّے اور چار والد صاحبان اور چھ چچا صاحبان گاؤں سے روانہ ہُوئے۔ ہمارے بزرگ گھوڑوں پر سوار تھے۔ عورتیں صدائے احتجاج بلند کر رہی تھیں۔ اُن کے کوسنے پیچھے رہ گئے اور ہم گاؤں سے دُور نکل گئے۔ ہمیں معلوم تھا کہ ان کوسنوں اور گالیوں میں دل سے نکلی ہُوئی دعائیں تھیں۔ فاصلہ چودہ پندرہ میل تھا۔ راستے میں بزرگ گھوڑوں سے اُترے اور ہم لڑکے باری باری سوار ہُوئے۔ ایک جگہ پڑاؤ کیا اور چل پڑے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہم متعلقہ گاؤں میں داخل ہو گئے۔ کُتّوں، انسانوں اور گھوڑوں کی فوج دیکھ کر گاؤں کے لوگ بہت حیران ہوئے۔ انہیں معلوم تھا کہ ہم بھیڑیوں کو مارنے آئے ہیں۔ انہوں نے ہماری خوب آؤ بھگت کی مگر وہ بُری طرح ڈرے ہُوئے تھے۔ انہوں نے گھوڑوں کو چارہ اور کُتّوں کو دودھ دیا۔ اتنے میں ملک امداد حسین چار سپاہیوں کے ساتھ آگیا۔ سپاہیوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ روشنی کے لیے وہ تین بڑے سائز کی ٹارچیں لے آیا تھا۔ دو ٹارچیں ہمارے پاس تھیں۔

ہم نے تالاب کے دوسرے کنارے پر ایسی جگہ منتخب کی جہاں بڑ کا درخت تھا۔ اس سے ذرا دُور گندم کی فصل کھڑی تھی۔ طے یہ ہُوا کہ دو کانسٹیبل ٹارچیں اور رائفلیں لے کر بڑ پر بیٹھیں گے۔ ہماری درخواست پر طے ہُوا کہ بھیڑیے آئیں تو سپاہی گولی نہیں چلائیں گے۔ صرف ٹارچوں کی روشنی دیں گے۔ تیسری ٹارچ ایک اور سپاہی کے پاس تھی جسے نیچے رہنا

تھا اور ضرورت کے مطابق روشنی دیتی تھی۔ ہمیں کتوں کے ساتھ گندم کے فصل میں چھپنا تھا۔ فصل پک گئی تھی۔ اس کی بلندی ہمارے لیے کافی تھی۔ ہم نے دو ٹارچیں اپنے دوستوں کو دیں اور انہیں ہدایت دی کہ وہ ضرورت کے مطابق روشنی دیں گے۔ ملک امداد حسین کو ہمارے ساتھ رہنا تھا۔ اس کے پاس پستول تھا اور اس کے ساتھ چوتھا سپاہی تھا۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا۔ تھانیدار نے گاؤں سے بکری کا بچہ لے لیا تھا، اور اس کی قیمت ادا کر دی تھی۔ اس کی قیمت ایک روپیہ تھی۔ آپ سُن کر حیران ہوں گے کہ جس دیہاتی کا بچہ تھا اس نے ایک روپے کے سکے کو دیکھ کر تھانیدار سے پوچھا تھا ــــ "جناب! کتنے پیسے رکھوں؟" ــــ ایک روپیہ قیمت خاصی زیادہ تھی۔ اُس دَور میں تین روپے میں دودھ دینے والی بکری مِل جاتی تھی۔ جب ملک امداد حسین نے اسے کہا ــــ "پورا روپیہ رکھ لو" ــــ تو دیہاتی کا مُنہ حیرت اور خوشی سے کھُل گیا تھا۔ میں بھی حیران اور خوش ہُوا تھا کہ تھانیدار ہو کر وہ آٹھ آنے کے مینمنے کا ایک روپیہ دے رہا تھا۔

ہم نے بڑ کے درخت کے نیچے کیل گاڑ کر بکری کا بچہ باندھ دیا اور دس کُتے قریب کے فصل میں لے گئے۔ ہم نے کُتوں کے منہ کپڑوں اور رسّیوں سے باندھ دیئے تھے تاکہ بھونک کر بھیڑیوں کو بھگا نہ دیں۔ ملک امداد حسین وثوق سے کہتا تھا کہ بھیڑیئے ضرور آئیں گے۔ ہم کُتوں کو پکڑ کر ذرا بکھر کر فصل میں بیٹھ گئے۔ کتوں کو بازوؤں میں لے لیا تاکہ مِل جُل کر آواز پیدا نہ کریں۔ دو سپاہی بڑ پر چڑھ گئے اور انتظار شروع ہو گیا۔ مینمنے نے ہماری یہ مدد کی کہ تنہائی کی وجہ سے زور زور سے ممیانے لگا۔ اس کی آواز رات کی خاموشی میں دُور دُور تک جاتی تھی۔ ہمارے لیے شکار کا یہ تجربہ انوکھا اور دلچسپ تھا۔ ہم نے یہ سوچ لیا تھا کہ بھیڑیئے ہمارے پیچھے سے آکر ہم پر بھی حملہ کر سکتے ہیں۔ اس صورت کے لیے ہمارے پاس کلہاڑیاں اور چاقو تھے۔

ہمارے ساتھ جو سپاہی تھا اسے ہم نے کہہ دیا تھا کہ اگر بھیڑیئے ہمارے اُوپر آجائیں تو وہ گھبرا کر گولی نہ چلا دے۔

خدا کا شکر ہے کہ بھیڑیوں نے زیادہ انتظار نہ کرایا۔ انہیں اسی جگہ اور اسی وقت انسان کا تازہ گوشت ملا تھا۔ وہ دو گھنٹے بعد اسی جگہ آگئے۔ اُن کے غرّانے کی آوازیں سنائی دیں۔ بکری کا بچہ بڑی زور سے ممیایا۔ ہمارے سانس رُک گئے۔ بھیڑیئے دوسری بار غرّائے تو معلوم ہوگیا کہ بہت قریب آگئے ہیں۔ تھانیدار نے سرگوشی کی "کُتّوں کے منہ کھول دو" — ہم نے ان کے منہ کھول دیئے۔ فوراً بعد بھیڑیئے بہت ہی زور سے غرّائے۔ اس کے ساتھ میمنے کی جو آواز نکلی اُسے میں آج تک نہیں بھولا۔ ہم نے معصوم سے میمنے کو بیدردی سے مروا دیا تھا۔ بڑکے درخت سے ٹارچیں روشن ہوگئیں۔ ملک امداد حسین نے کہا — "کُتّے چھوڑ دو۔ روشنی کرو" — سپاہی نے ٹارچ روشن کر دی۔ میرے دو دوستوں نے بھی ٹارچیں روشن کر دیں۔ ہمارے کُتّے پہلے ہی بے قابو ہو گئے تھے۔ پٹوں سے زنجیریں الگ کیں تو وہ فصل سے نکل گئے۔ وہ شکاری کُتّے تھے۔ بھیڑیوں کی آواز اور بُو نے انہیں بھڑکا دیا تھا۔

ہم اُٹھے تو ٹارچوں کی روشنی میں دیکھا کہ دونوں بھیڑیئے میمنے کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ بڑے خوفناک بھیڑیئے تھے۔ یہ منظر ہم چند سیکنڈ تک ہی دیکھ سکے۔ کُتّے فوراً پہنچ گئے اور بھیڑیوں کو بے خبری میں جا لیا مگر انہوں نے مقابلہ بڑی دلیری سے کیا۔ دس کُتّوں میں دو بھیڑیئے کر ہی کیا سکتے تھے۔ ذرا سی دیر میں کُتّوں نے بھیڑیوں کو خون میں نہلا دیا۔ ایک کی پچھلی دونوں ٹانگیں الگ ہوگئیں۔ کُتّے انہیں کھانا چاہتے تھے۔ ملک امداد حسین نے ہمیں کہا کہ کُتّے پکڑ لو تاکہ گاؤں والے بھیڑیوں کو دیکھ لیں۔ ہم نے بڑی مشکل سے کُتّوں کو

پکڑا۔ گاؤں جاگ رہا تھا۔ کُتوں اور بھیڑیوں کے شور سے ڈر کر لوگ گھروں میں گھُس گئے تھے۔ سب سے پہلے ہمارے بزرگ پہنچے۔ پھر گاؤں کے لوگ آئے۔ انہیں مرے اور چیرے پھاڑے ہوئے بھیڑیئے دکھائے گئے اور انہیں بتایا گیا کہ شاہ اور اس کے چیلے بدمعاش آدمی تھے اور یہ بھیڑیئے جن نہیں تھے۔ ایک روز پہلے تھانیدار انہیں دیا اور ماچس دکھا کر بتا چکا تھا کہ ہوا میں اُڑتے دِیئے کی حقیقت کیا تھی۔

آج آدھی صدی گزر گئی ہے۔ تعلیم اتنی عام ہو گئی ہے کہ جس گاؤں میں مڈل پاس کوئی نظر نہیں آتا تھا اب وہاں گریجوایٹ پا افراط ملتے ہیں مگر شاہ جی اور اُن کے چیلے ابھی تک دیہات میں موجود ہیں۔ اُن کی نوسربازیاں بھی موجود ہیں اور اب بھی دِیئے ہوا میں اُڑتے ہیں۔[4]

رکھ سلیمان کی ایشری

رکھ سلیمان کی پہلی اور آخری حسین چڑیل
جلا دی گئی اور رکھ سلیمان کی کہانی ختم ہو گئی۔
موجے ڈاکو کو ستائیس سال سزائے قید ملی۔

ہمارے گاؤں میں بھی ٹیلی ویژن سیٹ آگیا ہے۔ ٹرانسسٹر سے جو کسر پوری نہیں ہوئی تھی وہ صرف ایک ٹیلی ویژن سیٹ نے پوری کر دی ہے۔ ہمارے لڑکے شہروں میں جا جا کر شہری فیشن میں رنگے گئے ہیں۔ لڑکیاں محفوظ تھیں لیکن ٹیلی ویژن شہری بے حیائی کو ہمارے گاؤں میں لے آیا ہے جس سے اب لڑکیاں بھی محفوظ نہیں رہیں۔ جس گھر میں ٹیلی ویژن سیٹ ہے وہ رات کو سینما ہال بنا ہوا ہوتا ہے۔ پروگرام انگریزی کا ہو، اُردو یا پنجابی کا، بے حیائی ایک جیسی ہوتی ہے۔ مَیں اور میرے بوڑھے دوست گاؤں سے بھاگ کر کہاں جائیں؟ کبھی کبھی ہم بھاگ جاتے ہیں اور اپنے ماضی میں جا پناہ لیتے ہیں۔

کوئی ایک مہینہ گزرا، ایک لڑکا ماضی کا ایک واقعہ یاد دلا گیا ہے۔ مَیں آپ کو وعظ نہیں سُناؤں گا۔ یہ واقعہ سُن لیں اور اپنے بچوں کو بھی سُنا دیں۔ ایک وقت تھا کہ مَیں اپنے لڑکپن اور جوانی کے واقعات اس طرح سنایا کرتا تھا جیسے لطیفے سُنائے جاتے ہیں۔ جُوں جُوں وقت گزرتا جا رہا ہے، یہ واقعات دردناک بنتے جا رہے ہیں۔ اس درد کی وجہ یہ نہیں کہ مَیں بوڑھا ہو گیا ہوں اور مجھے جوانی کی باتیں یاد آتی ہیں تو دُکھ ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مَیں اپنے گاؤں میں، اپنے علاقے میں اور شاید سارے پاکستان میں اُس مردانگی کو ڈھونڈ رہا ہوں جو ہمارا

فخر اور ہمارا غرور ہُوا کرتی تھی۔ میرے لڑکپن میں مردانگی ایسے ہی تھی جیسے لباس۔ لوگ لباس کو اتنی اہمیت نہیں دیتے تھے جتنی مردانگی یعنی مردانہ وقار کو، مگر آج کے لڑکوں کو دیکھتا ہُوں تو بہت افسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے لباس اور زیبائش کو اتنی زیادہ اہمیت دے دی ہے کہ مردانگی کو بھول گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں ایک سال سے خاموش ہُوں۔ آپ کو کوئی واقعہ نہیں سُنایا۔ سوچتا ہُوں کہ ہمارے نوجوان قارئین پڑھ کر مذاق اُڑاتے ہوں گے کہ یہ بُڈھا پچاس سال پُرانی کہانیاں سُنا کر بڑا خوش ہوتا ہوگا کہ لوگ اسے ہیرو کہیں گے۔ نہیں جناب! مَیں محمد علی، وحید مراد اور دلیپ کمار نہیں ہُوں۔ ہمارے وقتوں میں ہر کوئی ہیرو ہوتا تھا لیکن فلموں کا نہیں روزمرّہ زندگی کا ہیرو۔

ایسا ہی ایک ہیرو مجھے آج کی نسل کا یہ ہیرو دیکھ کر یاد آگیا ہے جو میرے گاؤں کا ہی ایک لڑکا ہے۔ تقریباً ایک مہینہ گزرا مَیں نے سترہ اٹھارہ سال کی عمر کے ایک لڑکے کو اپنے گاؤں میں دیکھا۔ میری طرف اُس کی پیٹھ تھی۔ اُس کے سر کے بال گردن سے نیچے تک آئے ہُوئے تھے۔ اُس کے کان بھی ڈھکے ہوئے تھے۔ مَیں سمجھا کہ کسی کے گھر شہر سے مہمان آیا ہے۔ قریب جا کے دیکھا تو وہ مجھے کسی کا مہمان ہی لگا۔ اُس کی قلمیں ہونٹوں تک پہنچی ہوئی تھیں۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی ہاتھ آگے کیا اور کہا —— "سالا ما لیکم بابا جی!" —— تب مَیں نے اُسے پہچانا۔ وہ میرے ایک گھر سے دوست اور میری شکاری ٹیم کے سرگرم رُکن راجہ دلاور خان کا پوتا تھا۔ اسی سال راولپنڈی کے کسی کالج میں داخل ہُوا ہے۔ اس لڑکے کو دیکھ کر مجھے راجہ دلاور خان کا لڑکپن اور جوانی یاد آگئی۔ اُس کے جسم سے اس لڑکے کے سائز کے چھ لڑکے نکلتے تھے۔ اس دادے کے پوتے کا یہ حال تھا کہ شہر کے ماحول نے، فلموں نے اور بے حیائی نے اس کا جسم کھا لیا تھا۔ دُبلا پتلا، چھوٹے سے قد کا لڑکا

شہر سے بھوت بن کر آیا تھا اُسے دیکھ کر دُکھ یہ ہُوا کہ ہمارا گاؤں جس میں کشمیر کی جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ اور دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ کے شہید دفن ہیں، اب دفن کرنے کے لیے اور شہید کہاں سے لائے گا؟ پاکستان کے رکھوالے کہاں سے آئیں گے؟

اس لڑکے نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا تو ایسے لگا جیسے کسی لڑکی نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا ہو۔ اس ہاتھ پر گوشت نہیں تھا اُس میں جان نہیں تھی۔ اس میں حرارت نہیں تھی۔ مَیں نے دوسرا ہاتھ اُس کے سر پر پھیرنے کے لیے اُوپر کیا مگر ہاتھ واپس آ گیا۔ مجھے اس کے بالوں سے گھن آئی جیسے اس مرد نے کسی لڑکی کے بال اپنے سر پر چپکا لیے تھے۔ مَیں رسمی طور پر اسے دُعائیں دیتا آگے چلا گیا۔ میری شکاری پارٹی کا ایک ہی آدمی راجہ شہباز خان زندہ ہے۔ باقی سب رخصت ہو گئے ہیں۔ اب دیکھتے ہیں کہ مَیں پہلے رخصت ہوتا ہوں یا شہباز خان۔ مَیں ٹہلتا ٹہلتا شہباز کے گھر تک چلا گیا۔ اُسے آواز دے کر باہر نکالا اور ہم دونوں قبرستان کی طرف نکل گئے۔ مَیں نے اُس سے پوچھا —— "تم نے خانو کا پوتا دیکھا ہے؟" —— راجہ دلاور خان کو ہم خانو کہا کرتے تھے۔ شہباز خان کو باز اور مجھے صابو کہتے تھے۔ خانو کا نام سُن کر شہباز نے سر ہلایا اور بوڑھی آواز میں کہا —— "ابھی معلوم نہیں خدا اور کیا کچھ دکھائے گا" —— ہم قبرستان میں چلے گئے۔ اپنے اُن دوستوں کی قبریں جھاڑیں جو ہمارے ساتھ جوانی میں کُتوں کا شکار کھیلتے مارے گئے تھے اور اُن کی بھی جو زندگی کی راہ پر ہمارے ساتھ چلتے ایک ایک کرکے قبرستان میں جا سوئے۔ ان میں دلاور خان کی قبر بھی ہے۔ مَیں اور شہباز اس قبر کے قریب کھڑے ہو گئے اور میری یادیں مجھے بہت دُور پیچھے لے گئیں۔

اُس وقت میری عمر بیس سال اور کچھ مہینے اور دلاور کی عمر مجھ سے شاید ایک آدھ

سال زیادہ تھی۔ ہم شکار کو نکلے۔ ہمارے ساتھ گیارہ کتے تھے اور لڑکوں کی تعداد چودہ تھی۔ اُس روز ہم نے ایسے علاقے میں جانے کا پروگرام بنایا تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہاں چڑیلیں رہتی ہیں اور وہاں جنوں کی ایک ایسی نسل رہتی ہے جو کبھی کبھی دو فٹ قد کے انسانوں کے رُوپ میں نظر آتی ہے۔ وہ علاقہ اِتنا خطرناک سمجھا جاتا تھا کہ دن کے وقت وہی انسان اُدھر سے گزرتا تھا جو بھولے بھٹکے وہاں چلا گیا ہو یا کسی مجبوری کی وجہ سے اسے وہاں سے گزرنا پڑے۔ لوگ سناتے تھے کہ دن کے وقت اگر کوئی وہاں سے گزرے تو نہایت خوبصورت اور جوان لڑکیاں دیہاتی لباس میں اُسے روک لیتی ہیں اور اتنا اچھا سلوک کرتی ہیں کہ وہ آدمی اُن کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ وہ لڑکیاں اس کے ساتھ بڑی اچھی اچھی باتیں کرتی ہیں۔ ایک لڑکی چلی جاتی ہے اور پراٹھے اور میٹھا دودھ لے آتی ہے۔ نادانستہ آدمی دودھ پی لیتا ہے اور مر جاتا ہے۔ پھر اس کی لاش نہیں ملتی بلکہ ہڈیوں کا پنجر ملتا ہے اور جو آدمی جانتا ہے کہ یہاں چڑیلیں رہتی ہیں، وہ لڑکیوں کو دیکھ کر کلمہ شریف پڑھنے لگتا ہے۔ لڑکیاں اُسے بلاتی ہیں۔ اس کا راستہ روکتی ہیں۔ اسے طرح طرح کے لالچ دیتی ہیں مگر وہ آدمی کلمہ شریف پڑھتا وہاں سے نکل آتا ہے۔ پھر اُسے پیچھے سے آواز آتی ہے ــــ "خوش قسمت ہو۔ بہت خوش قسمت ہو"۔ یہ بھی مشہور تھا کہ اگر اس آخری آواز پر کوئی پیچھے دیکھ بیٹھے تو اُس کا جسم پتھر بن جاتا ہے اور پھر وہ ہڈیوں کا پنجر بن جاتا ہے۔

بعض لوگوں نے دعویٰ کیا تھا کہ انہوں نے دو فٹ کے انسان دیکھے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کسی گاؤں کا ایک آدمی جو سفر میں تھا ذرا ستانے کے لیے ہمارے گاؤں میں رُکا۔ اس نے سُنایا کہ وہ اس علاقے میں سے گزرا ہے۔ اُس نے دو فٹ کے دس بارہ انسان دیکھے۔ سب ننگے تھے اور پانی میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ جن

ہیں۔ وہاں رُکا نہیں۔ حضرت سلیمان کو یاد کرتا تیز تیز چلنے لگا۔ ایک درخت کے نیچے سے گزرا تو اُوپر سے آواز آئی ــــ "ٹھہرو دوست! پانی پی کر جاؤ" ــــ اس نے اُوپر دیکھا۔ پانچ چھ دو فٹے انسان درخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ رُکا نہیں۔ حضرت سلیمان کا کوئی وظیفہ پڑھتا رہا اور چلتا رہا۔ اُسے اپنے اُوپر شاں شاں کی آوازیں سُنائی دیں۔ اُس نے اُوپر دیکھا۔ دو فٹے انسان بازو ہوا میں اس طرح مارتے اُڑتے جا رہے تھے جس طرح پانی میں تیرتے ہیں۔ وہ سب اگلے درخت کی ٹہنیوں پر کھڑے ہو گئے اور ایک نے کہا ــــ "ٹھہرو دوست! دودھ پی کر جانا" ــــ وہ چلتا رہا اور جب دُور نکل گیا تو اُسے آواز سُنائی دی "تم ہمارے پیغمبر کا نام نہ لیتے تو یہاں سے تمہاری ہڈیاں جاتیں"۔

ایسی کچھ اور بھی کہانیاں سُنی تھیں جو ڈراؤنی تھیں۔ ایک کہانی مزیدار بھی تھی۔ ایک چڑیل ایک آدمی کو دل دے بیٹھی تھی۔ رات کو اس کے پاس آجاتی اور اُسے مجبور کرتی تھی کہ یہ آدمی اس کے ساتھ شادی کرلے لیکن یہ آدمی چڑیل کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بڑی ہی حسین لڑکی کے رُوپ میں اُسے ملتی تھی۔ ایک رات یہ آدمی چھت پر سویا۔ آنکھ کھُلی تو اس کی چارپائی اُس ویران جگہ پر پڑی تھی جہاں چڑیلیں رہتی تھیں۔ یہ آدمی بہت ڈرا اور سوچنے لگا کہ اُسے چارپائی سمیت یہاں کون اُٹھا لایا ہے۔ اتنے میں وہی چڑیل لڑکی کے روپ میں اُس کے سامنے آئی اور کہا کہ مَیں تمہارا پورا مکان یہاں اُٹھا لاؤں گی میرے ساتھ شادی کرلو۔ مَیں وعدہ کرتی ہُوں کہ ساری عمر انسان کے رُوپ میں رہوں گی اور تمہاری خدمت کروں گی۔ اس آدمی نے مجبور ہو کر اس کے ساتھ شادی کرلی۔ آٹھ سال بعد یہ آدمی مر گیا۔ اس کے مرتے ہی چڑیل جو اُس وقت تک عورت کے روپ میں رہی تھی خاوند کی چارپائی کے نیچے چلی گئی۔ عورتوں نے نیچے دیکھا تو وہ وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔

اُس دور میں ہم جنّوں اور چڑیلوں کے وجود کو اور ان کی ہر ایک کہانی کو سچ مانتے تھے۔ ہمارے والدین کی بدقسمتی کہ ہم جوان ہو گئے تھے۔ ہم مہم جُو تھے اور ہمیں خطروں سے محبت تھی۔ بہت دنوں سے ہم چڑیلوں کی بستی میں جانے کے ارادے باندھ رہے تھے۔ ہمیں دو دائتیں حوصلہ دے رہی تھیں۔ ایک یہ کہ ہاتھ میں چاقو، چھُری، تلوار یا کلہاڑی ہو تو چڑیل قریب نہیں آتی۔ وہ چمکتے لوہے سے ڈرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کلمہ شریف یا حضرت سلیمان کا کوئی وظیفہ پڑھتے جاؤ تو نہ جنّ قریب آتا ہے نہ چڑیل۔ البتہ کُتّوں کے متعلق ہمیں ڈر تھا۔ ہم نے سُنا تھا کہ جنّ اور چڑیلیں انسان کو نظر نہ آئیں تو کُتّوں کو نظر آجاتی ہیں۔ رات کو کُتّے بھونکتے ہیں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ بلاوجہ بھونک رہے ہیں لیکن ان کا بھونکنا بلاوجہ نہیں ہوتا۔ وہ فضا میں سے گزرتے کسی جنّ یا چڑیل کو دیکھ کر بھونکتے ہیں۔ ہم ڈرتے تھے کہ کُتّے مارے جائیں گے۔ ہم نے گاؤں کے پیش امام سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ جنّ اور چڑیلیں کُتّوں سے نفرت کرتی ہیں اس لیے اُن کے قریب نہیں آتیں اس سے ہمیں تسلّی ہو گئی کہ کُتّے محفوظ رہیں گے۔ کلہاڑیاں اور چاقو تو ہمارے پاس ہوتے ہی تھے۔

ہم ایک صُبح چل پڑے۔ جس جگہ ہمیں جانا تھا وہ کم سے کم چھ اور زیادہ سے زیادہ سات میل دُور تھی۔ اُس زمانے میں لوگ اس جگہ کو رکھ سلیمان کہا کرتے تھے۔ وہ زمانہ پیدل چلنے کا یا گھوڑے سواری کا تھا۔ ہمارا علاقہ چونکہ دشوار گزار ہے۔ کھڈ نالے چٹانیں اور ندی نالے زیادہ ہیں اس لیے آج بھی وہاں موٹر یا لاری نہیں چل سکتی۔ لوگ پیدل سفر کرتے ہیں۔ اُس دور میں تو چھ سات میل دُور جگہ کوہِ قاف جتنی دُور لگتی تھی۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ جس جگہ لوگ نہیں پہنچ سکتے تھے وہ پُراسرار بن جاتی تھی۔ ہم جہاں جا رہے تھے وہ تو تھی

ہی پُراسرار اور خطرناک جگہ۔ نتائج سے بے نیاز وہاں کے خطروں سے بے پرواہ ہم جا رہے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ہم چودہ نوجوانوں میں سے کس کس کے دل میں یہ خواہش تھی کہ کوئی حسین چڑیل اُس پر فدا ہو جائے اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اندر سے کون کون ڈر رہا تھا۔

ہم سحر کی تاریکی ذرا سلیٹی ہوتے ہی نکل کھڑے ہوئے تھے۔ افضل کا خونخوار بُوبلی بھی ساتھ تھا۔ دو تازی کُتّے تھے اور زیادہ تعداد بُل ٹیریر نسل کے تھے۔ ہمارے پاس دو کلہاڑیاں چھ چاقو اور پانچ چھ ڈنڈے تھے۔ صبح سفید ہونے تک ہم گاؤں سے تین میل دُور چلے گئے۔ کُتّوں کو ہم نے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ہم راستے میں کسی جانور کا تعاقب نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ ہماری مہم کچھ اور تھی۔ وہاں جو جانور تھے ان میں گیدڑ، خرگوش، گوہ اور سہ قابل ذکر ہیں۔ کُتّوں کو کھلا چھوڑنے کی غلطی کا احساس ہمیں اُس وقت ہُوا جب ہمارا ایک تازی کُتّا غرا کر سرپٹ دوڑ پڑا۔ ہمیں دُور ایک خرگوش بھاگتا نظر آیا۔ تازی کُتّے کے پیچھے تمام کُتّے دوڑ پڑے۔

ہمارے سارے کُتّے دوڑ پڑے تو ہم بھی اُن کے پیچھے دوڑے۔ ہم کھڈ نالے پھلانگتے چلے گئے۔ خرگوش بہت دُور تھا۔ کہیں غائب ہو گیا تھا۔ بُوگیر کُتّے اس کی بُو پر باؤلے ہوئے جا رہے تھے۔ ہاتھ نہیں آتے تھے۔ بڑی مشکل سے ان کے پٹوں میں زنجیریں ڈالیں۔ خرگوش نے ہمیں یہ فائدہ دیا کہ ہم نے ڈیڑھ دو میل فاصلہ دوڑ کر طے کر لیا۔ یہ فاصلہ میدانی نہیں تھا۔ زمین پانی سے کٹی پھٹی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کھڈ اور گہری دراڑیں تھیں۔ نشیب بھی تھے اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے بھی۔ آگے ایک خشک نالہ بھی تھا جو زمین کی سطح سے نیچے تھا۔ پوٹھوہار کا علاقہ جس نے دیکھا ہے وہی سمجھ سکتا ہے کہ یہ کتنا دشوار گزار ہے۔ ہم

دس پندرہ منٹ ستانے کے لیے رکے اور چل پڑے۔ ہمیں بڑی گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور ان کے ساتھ گھنگھروؤں کی چھنکار بھی سنائی دے رہی تھی۔ ہم سب پر سناٹا طاری ہوگیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی انسان، کوئی مویشی نظر نہیں آرہا تھا۔ ہم رک گئے اور سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"ڈرو نہیں یار!" ــــ دلاور خان نے کہا ــــ "کلمہ شریف پڑھو۔ چاقو کھول کر ہاتھوں میں لے لو اور کلہاڑیاں اوپر کرلو۔ یہ جن ہیں اور کیا ہے۔"

ہم نے یہ بھی سنا تھا کہ جب جن آتے ہیں تو گھنگھروؤں کی چھنکار سنائی دیتی ہے اکثر اوقات جن نظر نہیں آتے۔ صرف گھنگھرو بجتے رہتے ہیں اور ہوا میں سے گزر جاتے ہیں۔ یہ جن ہی ہو سکتے تھے۔ آوازیں قریب آرہی تھیں۔ ہماری ٹیم کے ایک کتے نے منہ آسمان کی طرف کرکے لمبی آواز نکالی۔ اس آواز کو ہماری زبان میں "روڑ" کہتے ہیں۔ اردو میں اسے کتے کا رونا کہتے ہیں۔ کتے کی اس آواز کو منحوس سمجھا جاتا ہے۔ یہ کسی مصیبت کی پیشین گوئی ہوتی ہے۔ ہمیں یقین ہوگیا کہ اس کتے نے جنوں کو دیکھ لیا ہے، لیکن دوسرے کتے خاموش تھے۔ ہم نے کلمہ شریف کا ورد شروع کردیا۔ جن کے پاس چاقو تھے انہوں نے چاقو کھول کر اوپر کرلیے اور جن کے پاس کلہاڑیاں تھیں انہوں نے کلہاڑیاں اوپر کرلیں۔ سورج نکلنا شروع ہوگیا تھا۔ کلہاڑیاں اور چاقو چمکنے لگے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ جن چمکتے لوہے کو دیکھ کر بھاگ جاتے ہیں۔

گھنگھروؤں اور گھنٹیوں کی آوازیں بلند ہوگئیں۔ ایسے پتہ چل رہا تھا کہ ہم سے تیس چالیس گز دور زمین کے نیچے ہیں۔

خانو دلاور خان، نے مجھے اور شہباز خان سے کہا ــــ "صابو! بازے، آؤ آگے

آؤ آگے چلیں"۔ دوسرے لڑکوں نے ہمیں روکا۔ ہم تینوں کُتّے ساتھ لیے آگے چلے گئے۔ ہمارے پیچھے ساری شکاری پارٹی آگئی۔ بیس پچیس قدم گئے ہوں گے کہ زمین کے اندر سے کوئی بیس گز دُور ایک آدمی کا سر باہر آیا۔ پھر چہرہ، کندھے اور پھر پورے کا پورا آدمی اُبھر آیا۔ وہ دیہاتی تھا اور اُس کا قد دو فٹ نہیں چھ فٹ کے قریب تھا۔ اُس کے پیچھے ایک ایک کر کے چھ اُونٹ باہر آئے۔ اُن پر اناج کی بوریاں لدی ہُوئی تھیں۔ ساتھ تین آدمی تھے۔ یہ قافلہ ہمارے پاس رُک گیا۔ اُونٹوں کی گردنوں میں بڑی گھنٹیاں اور گھٹنوں کے اُوپر گھنگھرو بندھے ہوئے تھے۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ قافلہ کہاں سے برآمد ہُوا ہے۔ ہمارے علاقے میں بہت سی جگہیں ایسی ہیں کہ چلتے چلتے آپ رُک جاتے ہیں کیونکہ آپ کے سامنے ایک گہری جگہ آگئی ہے۔ آپ یوں محسوس کرتے ہیں جیسے آپ دو منزلہ یا سہ منزلہ مکان کی منڈیر پر کھڑے ہیں۔ نیچے آپ کو کسی برساتی نالے کا خشک پاٹ نظر آئے گا۔ اس کے دوسرے کنارے پر آپ کو مٹی کی ایسی ہی ایک دیوار سیدھی کھڑی نظر آئے گی جیسی دیوار پر آپ کھڑے ہیں۔ کسی نہ کسی جگہ ایک ڈھلانی اور تنگ راستہ نظر آئے گا جس پر سے آپ نیچے جا سکیں گے اور ایسا ہی راستہ دوسرے کنارے پر ہوگا۔

یہ قافلہ ایسی ہی ایک جگہ سے اُوپر آیا تھا۔ اُونٹوں والوں نے ہم سے پوچھا کدھر جا رہے ہو؟ ہم نے بتایا کہ شکار کو نکلے ہیں اور رکھ سلیمان کی طرف جا رہے ہیں۔ رکھ سلیمان اُس جگہ کا نام تھا جہاں جنّ اور چڑیلیں رہتی تھیں۔ بہت عرصہ گزرا لوگ اس نام کو بھول گئے ہیں۔ اسے رکھ سلیمان اس لیے کہتے تھے کہ وہاں حضرت سلیمان کی اُمت (جنّ اور چڑیلیں) رہتی تھیں۔ رکھ ہماری زبان میں جنگل کو کہتے ہیں۔ ایسا جنگل جو غیر آباد ہو... شُتر بانوں نے جب یہ سُنا کہ ہم رکھ سلیمان کی طرف جا رہے ہیں تو یقین کیجیے کہ اُن تینوں کے رنگ زرد

ہو گئے اور وہ ہمیں اس طرح آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگے جیسے ہم انسان نہیں جن ہیں۔ اُن میں سے ایک نے سخت خوفزدہ آواز میں پوچھا۔ "تم کون ہو؟ کونسے گاؤں کے رہنے والے ہو؟" ــــ خانُو شرارتی لڑکا تھا۔ وہ منہ سے مینڈک کی آواز بالکل مینڈک کی طرح نکالا کرتا تھا۔ نقل پر اصل کا گماں ہوتا تھا۔ اس نے سوال پوچھنے والے شُتر بان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مینڈک کی آواز نکالی۔ شُتر بان نے اُونٹ کی مہار چھوڑ دی اور بہت ہی تیز دوڑ پڑا۔ اس کے ساتھی بھی اُونٹوں کو چھوڑ کر بھاگ اُٹھے۔ ہم نے ایک کو پکڑ لیا۔ مَیں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا کہ اُس کی حالت کیا ہُوئی۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں اور وہ سر سے پاؤں تک اس طرح کانپ رہا تھا جیسے اُسے مرگی کا دَورہ پڑ گیا ہو۔

اس سے آپ اندازہ کریں کہ لوگوں پر رکھ سلیمان کی کتنی دہشت سوار تھی۔ یہ شُتر بان ہمیں جِن چڑیلیں سمجھ بیٹھے تھے۔ بڑی مشکل سے ہم نے اس آدمی کو منوایا کہ ہم انسان ہیں اور جو دو بھاگ گئے تھے انہیں تو جیسے ہمارے علاقے کی زمین نے نگل لیا تھا۔ جو آدمی ہمارے قبضے میں رہ گیا تھا اُس نے رکھ سلیمان کی خوفناک کہانیاں سنائیں۔ ان میں ایک اُس کے شتر بانوں کی تھی۔ اُس نے سُنایا کہ اُن کی ایک اُونٹنی کا بچّہ پیدا ہوتے ہی مر گیا۔ اونٹنی ہر وقت بے چین رہنے لگی۔ ایک روز یہ لوگ اپنے اُونٹوں پر بوریاں لادے اِدھر سے گزرے۔ اُونٹنی بھی ساتھ تھی۔ انہوں نے تھوڑی دُور اونٹنی کا ایک بچّہ دیکھا۔ اُونٹنی مہار تڑوا کر سامان سمیت اس کی طرف دوڑ گئی۔ بچّہ اس کی طرف آنے کی بجائے پیچھے کو دوڑتا گیا پھر بچّہ بھی غائب ہو گیا اور اُونٹنی بھی۔ شتر بان اُس طرف گئے۔ ایک بلند جگہ سے دیکھا کہ وہاں ایک اُونٹ کا پنجر پڑا تھا اور بوریاں اس کے قریب پڑی تھیں۔ شُتر بان نے کہا کہ وہ بچّہ جن تھا اور اُن کی اونٹنی کو جنّوں نے کھا لیا تھا۔

اس نے ہمیں اُدھر جانے سے روکا اور کہا کہ وہ رکھ سلیمان سے بچنے کے لیے تین کوس کا چکّر کاٹ کر گزارا کرتے ہیں۔ وہ اُونٹ لے کر چلا گیا۔ ہم اسے دیکھتے رہے۔ وہ پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھ رہا تھا کہ ہم کس طرح غائب ہوتے یا اپنا رُوپ بدلتے ہیں۔ یہ شُتر بان ہماری تفریح کا سبب بنے لیکن اُن کی دہشت کے متعلق سوچا تو ہمارا ارادہ متزلزل ہو گیا۔ وہ جگہ تو بہت ہی خطرناک معلوم ہوتی تھی۔ یہ شُتر بان ہمیں بتا گیا تھا کہ وہ جگہ کہاں ہے۔ یہی برساتی نالہ (جسے ہماری زبان میں کَس کہتے ہیں) آگے جا کر رکھ سلیمان میں سے گزرتا ہے۔ جن لوگوں کے راستے میں یہ جگہ آتی تھی وہ چکّر کاٹ کر گزارا کرتے تھے۔ ہم ڈھلانی راستے سے نالے میں اُتر گئے۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ رکھ کے اندر نہیں جائیں گے۔ باہر سے یا کہیں اُوپر سے دیکھیں گے۔ نالے میں ساون کی بارشوں میں سیلاب آیا کرتا تھا۔ اب سردیوں کا موسم تھا اس لیے نالہ خشک تھا۔ کسی کسی جگہ جہاں نالے کا موڑ تھا پانی جمع تھا اور وہاں سے پانی کی ایک لکیر سی بہتی نظر آتی تھی۔ نالے کے دونوں طرف مٹی کی اُونچی اُونچی دیواریں کھڑی تھیں۔ ہم ریت پر چلتے گئے اور آپس میں اس قسم کی باتیں کرتے گئے کہ جن یا چڑیلیں مِل گئیں تو ہم کیا کریں گے۔ نالہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مُڑتا جا رہا تھا۔ کہیں مٹی کی دیواریں قریب آ جاتی تھیں اور کہیں دُور دُور تھیں۔ ہم اپنے علاقے سے بڑی اچھی طرح واقف تھے۔ صرف یہ ایک حصّہ تھا جہاں ہم کبھی نہیں گئے تھے۔ وجہ بتا چکا ہوں... اس حصّے کے خدوخال ہمارے علاقے کی ہی طرح تھے لیکن اجنبیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم شُتر بان کی بتائی ہوئی نشانیوں کے مطابق اُس جگہ تک پہنچ گئے جسے رکھ سلیمان کہتے تھے۔ ہم نالے کا ایک اور موڑ مُڑے۔ یہاں مٹی کی دیواریں بہت قریب آ گئی تھیں۔ اُوپر دیکھا تو مٹی کے بہت بڑے بڑے تودے لٹک رہے تھے۔ یہ موڑ مُڑا تو آگے کا منظر دیکھ کر ایسے لگا جیسے فلم کا سین یکلخت بدل گیا ہو۔

طرف کی دیوار جو بالکل عمودی تھی ڈھلانی ہو گئی تھی اور آگے جا کر یہ بالکل ہی لیٹ گئی تھی یعنی ڈھلان میدان بن گئی تھی۔ اس میدان میں کیکر، پھلاہی اور شیشم کے بہت سے درخت تھے جو ڈھلان کے نیچے سے اوپر تک چلے گئے تھے۔ اوپر جہاں ڈھلان ختم ہوتی تھی وہاں بہت بڑے بڑے تودوں کی شکل کی پہاڑی سی تھی۔

دائیں طرف کی دیوار پیچھے ہٹ گئی تھی اور اس سے علاقہ کشادہ ہو گیا تھا۔ نالے کا پاٹ چوڑا نہیں ہوا تھا۔ نالے اور دیوار کے درمیان نالے سے چند گز بلند ایک میدان تھا۔ میدان کے ساتھ مٹی کی دیوار کھڑی تھی اور ایک جگہ سے یہ دیوار کٹی ہوئی تھی۔ یہ عمودی شگاف تھا جو اتنا چوڑا تھا کہ دو گھوڑے پہلو بہ پہلو اندر جا سکتے تھے۔ ہم ایسے شگافوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے اندر چلے جاؤ تو آگے کھلی جگہ آ جاتی ہے۔ بعض جگہیں اوپر سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ اس طرح ان کی شکل وسیع اور بلند غار کی سی ہو جاتی ہے۔ بعض جگہیں اوپر سے ننگی ہوتی ہیں۔ ان کی شکل کنوئیں کی سی ہوتی ہے۔ مٹی کے عمودی ٹیلوں کے اندر قدرتی طور پر بنی ہوئی یہ جگہیں عموماً خطرناک ہوتی ہیں۔ قتل کر کے لاش وہاں پھینک دی جاتی ہے۔ رہزنی کے لیے یہ جگہ رہزن استعمال کرتے ہیں اور وہاں چھپ کر کئی جرم کیے جاتے ہیں۔۔۔

ہم نے علاقے کا جائزہ لیتے ہوئے وہ شگاف دیکھا۔ اس کے سامنے نالے کے بلند کنارے تک جو میدان تھا وہاں مختلف درخت تھے وہاں سے نالہ گھومتا تھا اور وہاں پانی جمع تھا۔ ہم آگے جانے کی بجائے گھوڑوں کو قابو میں کیے بائیں طرف والی ڈھلان پر چلے گئے۔ وہاں کچھ جگہ نشیبی تھی۔ اس میں بیٹھ گئے۔

نالے کے موڑ پر جو پانی جمع تھا وہ اس قدر شفاف تھا کہ اس کی تہہ بھی نظر آتی تھی۔ یہ تالاب سا بنا ہوا تھا۔ پانی کا رنگ ہلکا نیلا تھا۔ دائیں طرف والی دیوار جس میں شگاف تھا،

نیم دائرے میں آگے چلی گئی تھی اور بلند بھی ہوگئی تھی۔ جہاں تک ہم دیکھ سکتے تھے ہمیں نالے کے کنارے سے دُور اُوپر تک درخت نظر آتے تھے اور اُوپر آسمان دکھائی دیتا تھا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ وہاں کوئی ایسی ہیبت تھی جو میرے دل پر طاری ہوگئی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں انسان قتل ہُوئے ہیں یا پُراسرار موت مرے ہیں۔ وہ جگہ مٹی کی اُونچی دیواروں کے گول دائرے میں قلعہ یا قید خانہ بنی ہُوئی تھی۔ اس میں ضرور روحیں قید تھیں۔ اچانک ہمارے اُوپر "شاں" کی آواز آئی اور کوئی چیز ہمارے آگے گری۔ ہم سب سہم گئے۔ ڈر کے مارے کسی نے اُوپر نہ دیکھا۔ ہمارے ایک لڑکے نے اپنے کُتے کی زنجیر ذرا ڈھیلی پکڑی ہوئی تھی۔ کُتا زنجیر چھڑا کر اُس چیز کی طرف بھاگا جو اُوپر سے گری تھی۔ ہم نے دیکھا کہ وہ ایک جنگلی چُوہا تھا اور وہ تڑپ رہا تھا۔ ہمارے کُتے نے دَوڑ کر اسے سُونگھا تو ہمیں اپنے سروں پر ایک بار پھر "شاں" کی آواز سُنائی دی اور پھر جیسے ہوائی جہاز نے غوطہ لگایا ہو، ایک بہت بڑا گدھ کُتے پر جھپٹ پڑا۔ اُس نے اتنی طاقت سے کُتے کو پنجوں سے دھکا دیا کہ کُتا چیخ مار کر پرے جا پڑا۔ گدھ اُوپر چلا گیا۔

یہ گدھ بہت بڑا تھا۔ چوہا اسی کے پنجوں سے گرا تھا اور جب ہمارا کُتا اٹھانے گیا تو گدھ نے اس پر حملہ کر دیا۔ کُتا تو چیختا چلّاتا بھاگ گیا۔ گدھ اُوپر سے پھر غوطے میں آیا۔ ہمارے دُوسرے کُتے چوکنے ہو گئے تھے۔ افضل نے اپنے خونخوار لُوبلی کو چھوڑ دیا۔ دو اور لڑکوں نے بھی کُتے کھول دیئے۔ یہ تینوں کُتے چوہے کی طرف گئے۔ جنگلی چُوہا بلّی کے بچے جتنا بڑا تھا اور ہل رہا تھا۔ اِدھر سے کُتے گئے اُدھر سے گدھ آیا۔ ایک کُتے نے گدھ کو دیکھ لیا۔ وہ جونہی اِس کی زد میں آیا کُتے نے اُچھل کر اس کا ایک پَر پکڑ لیا۔ گدھ گر کر بڑی زور سے پھڑپھڑایا۔ مَیں وثوق سے کہہ سکتا ہُوں کہ گدھ اتنا بڑا تھا کہ اس کُتے کو پنجوں میں

پکڑ لیتا تو اسے اُٹھا کر اُڑ جاتا۔ گدھ نے بڑی زور سے چڑچڑ کی آوازیں نکالیں اور کُتّے کو اُوپر سے چونچ اور نیچے سے پنجے مارے۔ کُتّے نے اُس کا پر منہ میں لے لیا۔ بُوبلی اور دوسرا کُتا بھی اپنے ساتھی کی مدد کو آئے۔ تینوں نے گدھ پر حملہ کر دیا۔

گدھ کی جو چیخیں نکلیں وہ کسی انسان کی چیخیں معلوم ہوتی تھیں۔ اتنی بلند اور کرخت کہ دل پر ہَول طاری ہوتا تھا۔ اِن چیخوں کے ساتھ ہی وہ ساری پُراسرار جگہ جو مٹی کی اُونچی اُونچی دیواروں کے وسیع گول دائرے میں گھری ہُوئی تھی چیخوں سے کانپنے لگی۔ جانے کہاں کہاں سے بے شمار گدھ ایسی پھڑپھڑ کی آواز پیدا کر کے اُڑے جیسے رُکے ہوئے پانی کا بند ٹوٹ جائے تو تھوڑے سے شگاف میں سے سیلاب اُمڈ آئے۔ اتنی چیخیں جیسے سینکڑوں بچے کسی تکلیف سے رو رہے ہوں۔ یہ تمام گدھ درختوں میں سے اور دیواروں کے شگافوں کے اندر سے اپنے ایک ساتھی کی چیخیں سُن کر نکلے تھے۔ ہمارے کُتّے گدھ کو ختم کر چکے تھے۔ فضا میں گدھوں نے قیامت بپا کر دی تھی۔ تین چار گدھ ہم پر غوطے میں آئے، لیکن مرے ہُوئے گدھ کے پاس بیٹھ گئے۔ انہوں نے اس طرح چیخیں ماریں جیسے خطرے کا الارم بجایا ہو۔ دوسرے گدھ باری باری ہم پر جھپٹنے لگے لیکن دس بارہ گز اُوپر سے گزر جاتے تھے۔ ان کے پروں کی ہوا جھکڑ کی طرح لگتی تھی۔ وہ ہمیں یہاں سے بھگانا چاہتے تھے۔ دو لڑکوں کے پاس کلہاڑیاں تھیں وہ ہوا میں لہرانے لگے۔ کُتّوں کو ہم نے مضبوطی سے پکڑ لیا کیونکہ وہ جھپٹتے ہوئے گدھوں کی طرف اُچھلتے تھے۔

ذرا سی دیر بعد فضا گدھوں سے بھر گئی۔ چونکہ چاروں طرف مٹی کی اُونچی دیواریں تھیں اِس لیے ان کی چیخوں کی گونج بھی پیدا ہوتی تھی جو بڑی ڈراؤنی تھی۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ جگہ گدھوں کا بسیرا ہے۔ یہ بھی مشہور تھا کہ گدھ دُور ویرانوں میں رہتے ہیں اور وہاں رات کو یہ چڑیلیں

بن جاتے ہیں۔ ہم ابھی نوجوان تھے اس لیے ایسی ہر سنسنی خیز اور پُراسرار بات کو سچ مانا کرتے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے سے کہا کہ یہی چڑیلیں ہیں اور اب یہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گی۔ بھاگنا خطرناک تھا کیونکہ ڈر تھا کہ گدھ تعاقب کر کے ہمیں ختم کر دیں گے۔ ڈر تو ہم پر طاری ہو ہی چکا تھا۔ ہم نشیب میں دبک گئے اور اپنے اُوپر اُڑتے گدھوں کو دیکھتے رہے

شہباز نے دُور سامنے دیکھتے ہوئے مجھے کہا — "صابر! وہ دیکھو۔ کوئی آدمی کھڑا ہے۔" مَیں نے دیکھا۔ دیوار کے عمودی شگاف میں ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ پگڑی میں چھُپا ہُوا تھا۔ اس نے شلوار اور کُرتہ پہن رکھا تھا۔ ہم نشیب میں تھے۔ سامنے درخت بھی تھے، اس لیے وہ آدمی شاید ہمیں نہیں دیکھ سکا۔ فاصلہ دو سو گز ہوگا۔ وہ نشیب کے اندر چلا گیا۔ شہباز نے کہا — "انسان نہیں ہو سکتا۔" مَیں نے بھی کہا — ہاں، انسان نہیں ہو سکتا۔ یہاں کوئی انسان نہیں آسکتا۔" دلاور خان ہمارے قریب آگیا۔ ہم نے اُسے بتایا کہ ہم نے ایک آدمی دیکھا ہے۔ اتنے میں دو آدمی شگاف میں نمودار ہوئے۔ دوسرے نے بھی سر اور چہرہ پگڑی میں چھپا رکھا تھا۔ دونوں کے کپڑے ایک جیسے تھے۔ وہ شگاف میں کھڑے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ اچانک اُن کے درمیان سے ایک عورت دوڑ کر باہر نکلی۔ دونوں آدمیوں نے تین چار قدموں پر اُسے پکڑ لیا۔ عورت لیٹ گئی۔ وہ آدمی اُسے گھسیٹ کر اندر لے گئے۔ یہ کیا تھا؟ انسان یا جِنّ؟ ہم نہیں سمجھ سکے۔ شہباز نے ایک بار پھر کہا — "یہ انسان نہیں ہو سکتے" — مَیں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ ہلکا سا خیال آیا کہ یہ انسان ہو سکتے ہیں مگر میرے ذہن میں جِنّ سمائے ہُوئے تھے۔

دلاور خان شرارتی بھی تھا اور دلیر بھی۔ آپ اس کی دلیری کو قصور میں نہیں لا سکتے۔ اُس نے کہا — "وہ جِنّ ہیں یا انسان، جا کر دیکھیں گے ضرور... لیکن دوستو! یہ جِنّ

نہیں ہیں۔ انسان ہیں۔ یہ عورت انہوں نے اغوا کر کے یہاں چھپا رکھی ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کسی راہ جاتی عورت کو پکڑ لیا ہو" ــــ میں نے کہا کہ یہاں کوئی انسان نہیں آسکتا۔ یہ انسان نہیں ہو سکتے۔ غرض ہماری بحث چلتی رہی۔ گدھ فضا میں اُڑ رہے تھے۔ ان کا شور بہت کم ہو گیا تھا اور وہ ایک ایک کر کے اپنے گھونسلوں میں غائب ہوتے جا رہے تھے۔ اُن کا مرا ہُوا ساتھی ہمارے سامنے پڑا تھا اور چوہے کو اس کا ایک اور ساتھی اُٹھا لے گیا تھا، مگر اِن گدھوں نے ہم پر جو خوف طاری کیا تھا وہ کم نہیں ہُوا تھا۔ دوسرے لڑکوں نے بھی اُن دو آدمیوں کو اور عورت کو دیکھا تھا۔ ان میں سے کوئی کہتا تھا کہ گھر چلو اور کوئی کہتا تھا کہ آگے چلو اور دیکھو کہ وہ کون ہیں۔

ہمارا ایک دوست اللہ داد تھا، لیکن یہ اُس کا وہ نام تھا جو ماں باپ نے رکھا تھا اور جو شادی کے وقت نکاح کے رجسٹر میں لکھا گیا تھا۔ ہم نے اس کا جو نام رکھا تھا وہ اسی نام سے پہچانا اور پکارا جاتا تھا۔ یہ نام تھا موٹر۔ وہ غیر معمولی رفتار سے تیز دوڑتا تھا۔ پھرتیلا تھا اور ریحید شیطان۔ اس کی رفتار اور پھرتی کی وجہ سے ہم اُسے موٹر کہتے تھے اور پھر اس کا یہی نام مستقل ہو گیا تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اُس نے کہا ــــ "جن ہیں یا انسان، میں تو دیکھوں گا" ــــ اس طرح صورت یہ پیدا ہو گئی کہ ہم چار لڑکے جو پارٹی کے لیڈر تھے متفق ہو گئے کہ ہم شگاف کے اندر نہیں جائیں گے۔ باہر نہیں گے پھر جو خدا کو منظور ہو گا دیکھا جائے گا۔ آج جب میں عمر کی آخری منزل میں داخل ہو گیا ہوں میں عقل کی باتیں کر سکتا ہوں اور شگاف تک جانے کے کئی جواز پیش کر سکتا ہوں لیکن اُس وقت جب میری عمر بیس سال اور میرے دوستوں کی عمریں بھی اسی کے لگ بھگ تھیں، ہمارے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ ہم نے عقل سے کوئی کام نہیں لیا تھا۔ ہم جوانی کے نشے سے بدمست

تھے، ہم مرد تھے اور ہم ایڈونچر کے دلدادہ تھے۔ خطروں میں کود جانے میں لذت محسوس ہوتی تھی۔

ہم کتوں کو ساتھ لے کے چل پڑے۔ گدھ اپنے گھونسلوں اور درختوں پر بیٹھ چکے تھے۔ ہمیں اور کتوں کو دیکھ کر انہوں نے ایک بار پھر چیخ و پکار شروع کر دی۔ بہت سے گدھ ہمارے اوپر اڑنے لگے۔ یہ ان کی بستی تھی جہاں سے انسانوں کا گزر نہیں ہوا کرتا تھا۔ اب انسانوں نے ان کی پرسکون دنیا میں کتوں کے ساتھ دخل اندازی کی اور ان کے ایک ساتھی کو مار ڈالا تھا۔ وہ اب ہمیں بخشنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہم ڈرتے تھے کہ یہ خونخوار پرندے ہم پر جھپٹ پڑے تو ہماری انتڑیاں اور آنکھیں نکال دیں گے ہم کلہاڑیاں اور ڈنڈے اوپر کر کے زور زور سے لہراتے جا رہے تھے۔ ہم درختوں میں سے گزرتے ڈھلان اتر گئے۔ نالے میں جہاں پانی جمع تھا اس سے تھوڑی دور پانی بہت ہی کم تھا اور ایک جگہ سے نالے کا کنارہ کٹا ہوا تھا۔ ہم وہاں سے اوپر چڑھنے لگے۔ میں اور دلاور آگے تھے۔ اس جگہ مٹی کچی تھی۔ مٹی پر ہمیں گھوڑے کے کھروں کے نشان دکھائی دیئے۔ یہ نشان پرانے نہیں تھے۔ کنارے پر چڑھے تو اوپر مٹی اور ریت تھی۔ وہاں بھی گھوڑے کے کھروں کے بڑے صاف نشان تھے۔ ان سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے یہاں سے گھوڑا گزرا ہے۔ آگے درخت تھے اور وہ شگاف جس میں ہمیں آدمی نظر آئے تھے تیس چالیس قدم دور رہ گیا تھا۔

قریب گئے تو ہم نے دیکھا کہ شگاف کے اندر گلی تھی جو فوراً ہی دائیں طرف مڑ گئی تھی۔ ہم نے آگے جانے کی جرأت نہیں کی۔ دلاور اور موٹر غیر معمولی دلیری کی باتیں کرتے تھے، کہتے تھے کہ کتوں اور کلہاڑیاں کے ساتھ اندر چلیں۔ ہم ایسی دلیری کے قائل نہیں تھے۔

شگاف ہم سے دس بارہ قدم دُور تھا۔ دلاور اور موٹر آگے چلے ہی گئے۔ انہوں نے کلہاڑیاں لے لی تھیں۔ ہمارے دم خشک ہو رہے تھے کیونکہ ہم اُن دونوں آدمیوں کو جنّ سمجھ رہے تھے اور اُس عورت کو چڑیل جسے وہ گھسیٹ کر اندر لے گئے تھے۔ اگر یہ یقین ہوتا کہ اندر بیس انسان ہیں تو ہم بے خوفی سے اندر چلے جاتے۔ دلاور اور موٹر آگے گئے تو شہباز نے کہا ــــ "خانو! سنبھل کر" ــــ افضل کے پاس بُوہلی کُتا تھا جو بہت خونخوار تھا۔ اس کی کہانیاں آپ کو پہلے بھی سُنا چکا ہوں۔ افضل نے کہا ــــ "یہاں میرے بُوہلی کی ضرورت ہوگی" ــــ وہ اُن کے پیچھے چلا گیا۔ مَیں نے باقی لڑکوں کو دیکھا۔ کئی لڑکوں کے رنگ صاف طور پر زرد ہو گئے تھے اور سب کے ہونٹ ہل رہے تھے وہ کلمہ شریف اور حضرت سلیمان کا وظیفہ پڑھ رہے تھے۔

دلاور اور موٹر شگاف سے تین چار قدم دُور تھے کہ اندر سے ایک آدمی آیا اور ٹھٹھک کر شگاف میں رُک گیا۔ اُس کا سر اور چہرہ نسواری رنگ کی پگڑی میں لپٹا ہُوا تھا اور وہ قد آور آدمی تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ یہاں جنّ دو فٹے انسانوں کے رُوپ میں نظر آتے ہیں۔ یہ آدمی چھ فُٹ کے قریب تھا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں انسانوں کی طرح تھے۔ اس کے کپڑے انسانوں کی طرح تھے۔ اس میں کوئی ایک بھی چیز انوکھی نہیں تھی۔ البتہ ہمارے دلوں پر یہ ڈر ضرور تھا کہ یہ جنّ ہو سکتا ہے۔ دلاور اور موٹر رُک گئے۔ وہ اُس آدمی کو اور وہ آدمی ہمیں دیکھتا رہا۔ اُس کی ناک اور آنکھیں ننگی تھیں۔ اُس نے آخر ایک حرکت کی۔ ہمیں وہیں رُکے رہنے کا ہاتھ سے اشارہ کیا اور اندر چلا گیا۔ فوراً ہی وہ اپنے ہی حُلیے کے ایک اور آدمی کو ساتھ لے آیا۔ اس کا بھی سر اور چہرہ پگڑی میں لپٹا ہُوا تھا۔ کپڑے دونوں کے ایک جیسے تھے اور دونوں کے ہاتھوں میں ایک ایک کلہاڑی تھی۔ کلہاڑی کے متعلق یاد رکھیے کہ آپ نے شہروں میں

لکڑیاں چیرنے والی کلہاڑی دیکھی ہو گی۔ دیہات میں لڑائی والی کلہاڑی مختلف ہوتی ہے۔ اس کا دستہ لمبا اور بلیڈ ذرا چھوٹا لیکن لمبا ہوتا ہے۔ دونوں آدمی شگاف میں آکر رُک گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آگے آگئے۔ مجھے وہ وقت آج بھی یاد ہے۔ میرا دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا کہ مَیں اس کی آواز سُن سکتا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

وہ ہمارے درمیان آرُکے۔ ہم سب نیم دائرے میں اُن کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ایک نے ہم سے پوچھا — "کونسے گاؤں کے ہو؟" — ابھی ہم میں سے کسی نے جواب نہیں دیا تھا کہ شگاف کے اندر سے عورت کی آہ و زاری سُنائی دی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دلاور کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ عورت کی آواز سُن کر وہ شگاف کی طرف چل پڑا۔ ایک آدمی تیزی سے اُس کے آگے ہو گیا اور کہا — "پیچھے رہو۔ اندر تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔" یہ دونوں آدمی پوٹھوہاری زبان بولتے تھے۔ دلاور نے پوچھا — "یہ عورت کون ہے؟ کس کی ہے؟"

"یہ چڑیل ہے" — اس آدمی نے جواب دیا۔ "تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ یہاں چڑیلیں رہتی ہیں؟ ہم نے اسے بڑی مشکل سے ایک عمل پڑھ کر قابو کیا ہے۔ اسے ہم گاؤں لے جا رہے ہیں۔"

"تم سب یہاں سے چلے جاؤ" — دوسرے نے کہا — "ورنہ ہمارا عمل تباہ ہو جائے گا اور یہ چڑیل ہاتھ سے نکل جائے گی پھر ساری چڑیلیں آجائیں گی اور ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا" — وہ بول ہی رہا تھا کہ اندر گھوڑا ہنہنایا اور ایک بار پھر عورت کی آواز سُنائی دی۔ وہ بَین کر رہی تھی۔

"ہم چڑیلیں دیکھنے آئے ہیں"۔ افضل نے کہا ـــــ "ایک نظر یہ چڑیل دیکھ لینے دو"۔

"خود بھی مرو گے، ہمیں بھی مرواؤ گے"۔ اُن میں سے ایک نے کہا اور ہم سب نے دیکھا کہ شگاف کے منہ میں ایک جوان لڑکی آئی۔ اس کے پیچھے ایک گھوڑا تھا۔ لڑکی کی دونوں کلائیاں گھوڑے کی باگ سے بندھی ہوئی تھیں۔ مَیں نے اُسے دیکھا۔ اس کا سر ننگا تھا۔ اُس کا دوپٹہ اس کے ٹخنوں سے بندھا ہوا تھا لیکن ڈھیلا تھا۔ شاید اس لڑکی نے کسی طرح ڈھیلا کر لیا ہوگا۔ ہاتھ لگام کے ساتھ بندھے ہوئے تھے اور وہ گھوڑے سمیت باہر آگئی تھی۔ مَیں آپ کو کس طرح بتاؤں کہ وہ کتنی خوبصورت لڑکی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی اُس نے چلّا کر کہا ـــــ "اپنے اللہ کا واسطہ ہے تمہیں۔ مجھے ان ظالموں سے چھڑاؤ۔ یہ دونوں مجھے گھر سے اُٹھا لائے ہیں"۔

ایک آدمی دوڑتا گیا اور اُسے دھکیل کر اندر لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر آیا تو مَیں نے اُن سے کہا ـــــ "یہ چڑیل نہیں ہے۔ تم اسے اُٹھا لائے ہو"۔

"تمہیں کیا ہے؟" ایک آدمی نے دوستی کے لہجے میں کہا ـــــ "تم جاؤ اپنا کام کرو"۔

"ہم اب یہی کام کریں گے کہ اس لڑکی کو جہاں سے تم اُٹھا لائے ہو وہاں پہنچائیں گے"۔ موٹر نے کہا ـــــ "تم نے اسے اغوا کیا ہے"۔

تھوڑی دیر یہ بحث چلی کہ یہ لڑکی چڑیل ہے۔ آخر دوسرا آدمی بھی باہر آگیا اور دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں اصل بات بتا دیں۔ انہوں نے ہمیں یہ بتایا کہ وہ دونوں مسلمان ہیں اور یہ لڑکی ہندو ہے۔ ان میں سے ایک نے جب یہ کہا ـــــ "مَیں موجا ڈاکو ہوں"۔ تو میرا دل ایک بار تو رُک ہی گیا۔ شاید ہر لڑکے کی یہی حالت ہوتی ہوگی۔ موجا ڈاکو ایک محدود علاقے کا اشتہاری ڈاکو تھا۔ اُس زمانے میں کچھ رہزن اور ڈاکو مشہور تھے اور یہ باقاعدہ

پیشہ تھا۔ ایک تو سلطانہ ڈاکو کی طرح وہ ڈاکو تھے جو ملک میں دُور دُور تک مشہور تھے اور جن کا ذکر تاریخ میں بھی آیا ہے۔ دوسرا گروہ محدود علاقوں کے ڈاکوؤں کا تھا۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے جو صوبے میں مشہور تھے۔ بعض صرف اپنے ضلعے میں مشہور ہوئے اور کچھ ایسے تھے جنہیں صرف تحصیل میں شہرت حاصل تھی۔ یہ لوگ فخر سے ڈاکو یا رہزن کہلاتے تھے۔ انہیں پولیس کی طرف سے آج کل کی طرح کوئی پُشت پناہی نہیں ملتی تھی اور نہ کوئی جاگیردار وغیرہ ان کی مدد کرتا تھا۔ یہ ڈاکو جنّوں کی طرح آتے اور صفایا کر جاتے تھے۔ یا رہزنی کرتے تھے۔ پولیس پریشان ہو جاتی تھی۔ ان میں سے بعض کی نشاندہی یا گرفتاری کے لیے انگریزوں نے انعام مقرر کر رکھے تھے۔ موجا کے لیے کوئی انعام مقرر نہیں تھا۔ البتہ اس نے بہت دہشت پھیلا رکھی تھی۔ رہزنی بھی کرتا تھا۔ ہمارا علاقہ ایسا ہے کہ دن کے وقت بھی رہزنی آسان تھی۔

ہم کئی سالوں سے موجا ڈاکو کا نام سُن رہے تھے اور اس کی سنسنی خیز اور حیرت انگیز کہانیاں بھی سُنی سُنائی جاتی تھیں۔ اب اس نقاب پوش نے جب کہا کہ مَیں مَوجا ڈاکو ہوں تو ہم سب سُن ہو گئے۔ ہم دراصل اس سے خوفزدہ نہیں ہوئے تھے۔ ہم چودہ لڑکے تھے اور وہ دو۔ اسی لیے مَوجا صلح صفائی پر اُتر آیا تھا۔ ہمارے سُن ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے سامنے ایسا ڈاکو بیٹھا تھا جس کے متعلق سُنا تھا کہ وہ گھر سے باہر آجائے تو وہ زمین میں غائب ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ اس کے پاس کسی "پہنچ والے" مُرشد کا تعویذ ہے۔ بہرحال موجا ڈاکو پُراسرار شخصیت تھا اور ہمارے سامنے کھڑا تھا۔

"تم مسلمانوں کے بچّے ہو" مَوجے ڈاکو نے کہا "مَیں بھی مسلمان ہوں۔ تم بتاؤ، تم نے کبھی سُنا ہے کہ موجے نے کبھی کسی غریب کو لُوٹا ہے یا کسی کی بہو بیٹی پر ہاتھ ڈالا ہے؟ .... مَیں للکار کر ڈکیتی کرتا ہوں۔ لڑکی کبھی اغوا نہیں کی۔ یہ لڑکی ہندوؤں کی ہے ..." مَوجے ڈاکو نے لڑکی

کا گاؤں بتایا جو ہمارے گاؤں سے چار میل دُور تھا۔ ہمارے دیہاتی علاقے میں کہیں کہیں ہندو بھی رہتے تھے۔ بہت مالدار تھے۔ شہروں میں اُن کی تجارت چلتی تھی۔ کسانوں سے غلّہ خرید کر منڈی میں بھیجتے تھے اور ساہوکارہ کرتے تھے۔ ہم مسلمان لوگ بیاہ شادیوں پر ان سے سُود پر قرض لیا کرتے اور زمین گروی رکھ دیا کرتے تھے پھر ہماری نسلیں قرض ادا کرتی رہتی تھیں جو ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ دیہاتی مسلمان ان کے غلام ہو گئے تھے۔ یہ لڑکی جسے مَوجا ڈاکو اُٹھا لایا تھا ایسے ہی ایک ہندو ساہوکار کی بیٹی تھی۔ موجے نے کہا ــــ "اس لڑکی کے باپ نے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ مَوجے، میرے گاؤں سے دُور رہنا۔ اگر تم نے میرے گاؤں میں واردات کی تو بچ کے نہیں جا سکو گے۔ میرے پاس دولت ہے، مَیں تم جیسے چھ ڈاکو خرید کر تمہیں قتل کرا دوں گا۔"

مَوجے نے یہ نہیں بتایا کہ اس ہندو ساہوکار نے اُسے یہ چیلنج کیوں بھیجا تھا۔ اُس نے کہا ــــ "مَیں نے اس ہندو بنیئے کو جواب بھیجا کہ اپنی لڑکی کو ٹرنک میں بند کر کے رکھو یا اُسے شہر بھیج دو۔ پھر نہ کہنا مَوجا میری لڑکی لے گیا ہے۔ مَیں جانتا تھا کہ اس کی ایک لڑکی جوان ہے۔ یہ ہے وہ لڑکی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے گھر گروی رکھے ہوئے زیورات بھی ہیں۔ مَیں نے اُسے جواب دینے کے پانچ روز بعد رات کے وقت اُس کے گھر ڈاکہ ڈالا۔"

ہم مَوجے کے پیچھے پڑ گئے اور اسے کہا کہ وہ ہمیں سُنائے کہ لڑکی کو اس نے کس طرح اغوا کیا ہے۔ ہمارا یہ اصرار بچّوں کی ضد کی طرح تھا۔ مَوجا ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ تم بچّے ہو۔ سُن کر کیا کرو گے مگر ہم نے ضد کی کہ ہم سُنیں گے ورنہ یہاں سے اُٹھیں گے نہیں۔

اُس نے کہا ــــ "یہ آج رات کی بات ہے۔ ہم دونوں دیوار پھلانگ کر اس ہندو کے گھر میں داخل ہوئے۔ گھر والے سردی کی وجہ سے اندر سوئے ہوئے تھے۔ کمروں کے

دروازے اندر سے بند تھے۔ باورچی خانہ برآمدے میں تھا۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اپنے مخبروں سے گھر کے کمروں وغیرہ کے متعلق اور گھر والے کہاں سوتے ہیں، اور تمام بھید معلوم کر لیے تھے۔ ایک طریقہ دروازہ کھلوانے کا جو میں نے سوچا تھا وہ کامیاب ہو گیا۔ میرے دوست نے باورچی خانے میں جا کر دو تین پلیٹیں گرا دیں۔ میں نے کمرے کے دروازے کے ساتھ کان لگائے۔ اندر کچھ ہلچل ہوئی۔ میں نے منہ سے بلی کی آواز نکالی اور میرے دوست نے برتنوں کی آواز ایک بار پھر پیدا کی۔ اندر سے آواز آئی۔ 'بلی ہے'۔ میں نے پیچھے ہٹ کر بلی کی طرح پھر میاؤں کی۔ دروازہ کھلا۔ اندھیرا تھا۔ ایک آدمی باہر آیا۔ میں دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس آدمی کو میں نے پیچھے سے بازو اس کی گردن کے گرد لپیٹ کر دبوچ لیا اور کہا کہ اونچی آواز نکالو گے تو مارے جاؤ گے...

"یہ ہندو کا بڑا بیٹا تھا۔ اندر سے آواز آئی۔ 'باہر کون ہے'۔ میں نے کہا —— 'موجا ڈاکو۔ کسی نے بھی اونچی آواز نکالی، مارا جائے گا۔ گھر کو آگ لگا دوں گا، بتی جلاؤ'۔ لالٹین جلی۔ ہندو، اس کی بیوی، بڑا بیٹا، یہ جوان لڑکی اور اس سے چھوٹا لڑکا جس کی عمر سولہ سترہ سال ہے، اسی کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ ہمارے پاس کلہاڑیاں تھیں۔ سب کو جگا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور ایک بار پھر کہا —— 'کسی کی آواز نہ نکلے' —— ساہوکار نے میرے کہنے پر زیورات اور نقدی نکال دی۔ یہ مال تھوڑا تھا۔ وہ میرے پاؤں میں گر پڑا۔ پھر اس نے میرے اس دوست کے پاؤں چاٹنے شروع کر دیئے اور کہا کہ اسی پر راضی ہو جاؤ اور چلے جاؤ۔ میں اس کا صفایا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ہٹے کٹے بیٹے کھڑے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ میں نے کلہاڑی آگے کر کے ہندو لالے سے کہا —— "ساری نقدی

اور سارا زیور لے کر ٹلوں گا۔" اُس نے بہت سارے زیورات اور نقدی نکال دی۔ مَیں نے اس کی بیٹی کو بازو سے پکڑا۔ وہ رونے چیخنے لگی۔ میرے دوست نے ایک کپڑا اس کے منہ میں ٹھونس کر اسے کندھے پر اُٹھا لیا۔ مَیں نے سب سے کہا کہ جب تک ہم گاؤں میں ہیں کسی کی آواز نہ نکلے۔ ہم دونوں کمرے سے نکل آئے اور دروازہ باہر سے زنجیر چڑھا کر بند کر دیا۔ ہمارے گھوڑے ذرا پرے کھڑے تھے۔ گھوڑوں پر بیٹھے اور یہاں آ گئے۔"

ہم نے ان سے پوچھا کہ وہ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ مُوجے نے کہا۔ "ایسی باتیں ہم کسی کو نہیں بتایا کرتے۔ یہ تو تمہاری ضد پوری کرنے کے لیے سُنا دیا ہے کہ ہم نے یہ واردات کس طرح کی ہے۔ تم لڑکی سے پوچھ لو۔ ہم نے اسے اپنی بیٹیوں کی طرح رکھا ہُوا ہے۔ اگر یہ کہہ دے کہ ہم نے اس کے ساتھ ذرا سی بھی چھیڑ چھاڑ کی ہے تو تمہاری کلہاڑیاں اور میرا سر۔ تین چار دنوں بعد ہم لڑکی کو رات کے وقت اُس کے گاؤں چھوڑ آئیں گے۔ یہ تو مَیں نے اس ہندو ساہوکار کے پیغام کا جواب دیا ہے۔ اب مَیں اس سے پُوچھوں گا کہ مجھے قتل کب کراؤ گے؟"

موجے نے ہمیں کہا ——— "یہ ہندو مسلمانوں کی چمڑی اُدھیڑتے رہتے ہیں۔ مَیں نے اس سے انتقام لیا ہے۔ تم سب مسلمان ہو۔ جاؤ ہنسو کھیلو۔ لڑکی سے پوچھ لو کہ یہ ہندو ہے یا مسلمان جاؤ بچو!" مَیں نے اسے کہا کہ اپنا چہرہ دکھا دو لیکن اس نے چہرہ ننگا نہیں کیا۔ اس کا لہجہ بہت پیارا تھا۔ کوئی دھمکی نہیں تھی، کوئی رُعب نہیں تھا۔ وہ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرتے تھے۔

افضل نے ہم سب سے کہا ——— "اٹھو یارو! انہیں موج میلہ کرنے دو۔ آؤ چلیں۔"

ہم سب اُٹھے اور چل پڑے۔ یہ واقعہ ایسا تھا کہ ہم جنّوں اور چڑیلوں کو بھول گئے۔ موجا ڈاکو اپنے دوست کے ساتھ شگاف کے اندر چلا گیا۔ ہم نالے میں اُترے تو دلاور خان نے بڑے

غصّے سے کہا ـــــ "تم سب بے غیرت ہو۔ لڑکی ہندو ہے یا مسلمان، ہے تو عورت ذات۔ تم میں سے کوئی لڑکا قسم کھا سکتا ہے کہ ان ڈاکوؤں نے اُسے بیٹی بنا کے رکھا ہُوا ہے؟" ـــــ ہم نے دلاور کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ ہندو لڑکی ہے۔ جائے جہنّم میں، مگر دلاور وہیں رُک گیا، اور طنزیہ لہجے میں بولا ـــــ "اس لڑکی نے ہمیں للکارا تھا کہ مجھے ان ظالموں سے چھڑاؤ۔ وہ کیا کہے گی؟ ـــــ مسلمان اتنے بُزدل اور بے غیرت ہوتے ہیں؟ ڈوب مرو ہیجڑو، ڈاکوؤں سے ڈر گئے ہو۔ آؤ، مَیں اکیلا اندر جاؤں گا اور لڑکی کو چھڑا لوں گا۔ اگر نہ چھڑا سکا تو میری لاش گاؤں میں لے جانا۔"

ہم نے اس کی نہیں مانی۔ موٹر اور شہباز لڑکی کو چھڑانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ زیادہ تر لڑکے اس کے حق میں نہیں تھے۔ اس بحث مباحثے میں بہت سے لڑکے آگے نکل گئے۔ مَیں، شہباز اور موٹر ذرا پیچھے تھے۔ دلاور سخت غصّے میں تھا۔ نالے سے گزرتے ہُوئے لڑکے بکھر گئے۔ کُتّے زنجیروں میں تھے۔ نالے سے پار گئے تو معلوم نہیں کس نے پوچھا۔ خانو کہاں ہے؟" ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ خانو (دلاور) نظر نہ آیا۔ وہ جگہ اتنی اُونچی نیچی تھی کہ دس قدم پر آدمی غائب ہو جاتا تھا۔ ہم سمجھے کہ کسی ضرورت سے پیچھے رہ گیا ہے۔ ہم رُک گئے۔ پھر اُسے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ موٹر نے کہا "اُوپر چل کے دیکھو۔" مجھے یاد آگیا کہ اس کے پاس کلہاڑی تھی۔ مَیں اس کی طبیعت اور مزاج سے واقف تھا۔ مجھے کچھ شک ہُوا۔ ہم تین چار لڑکے نالے سے گزر کر کنارے پر چڑھ گئے۔ دلاور اُوپر بھی نہیں تھا۔ سگاف نظر آ رہا تھا۔ مجھے اس کے اندر آوازیں سی سُنائی دیں۔ مَیں نے گھبرا کر شہباز سے کہا ـــــ "دلاور اندر ہے" ـــــ ہم سگاف کی طرف دوڑے۔ ابھی ذرا پیچھے ہی تھے کہ اندر سے ایک گھوڑا نکلا۔ اس پر ایک ڈاکو سوار تھا۔ اُس نے گھوڑا ایک طرف موڑا اور ایڑ لگا دی۔

اس کے پیچھے دوسرا گھوڑا نکلا۔ اس پر بھی ایک ڈاکو سوار تھا۔ اس نے اپنے آگے لڑکی کو بٹھا رکھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ اگلے ڈاکو کے کپڑے بھی خون سے لال تھے اور دوسرے کے بھی۔ اس گھوڑے کے ساتھ ہی ہمارا عزیز دوست دلاور ہاتھ میں کلہاڑی اٹھائے باہر نکلا۔ اس کے کپڑے اوپر سے نیچے تک خون میں لال تھے۔ اس نے کلہاڑی کا وار کیا لیکن گھوڑا دوڑ پڑا اور وار خالی گیا۔ دلاور کا کتا گھوڑے کے پیچھے دوڑا۔ یہ تین چار سیکنڈ کا منظر تھا۔ گھوڑے نکلے، دوڑے، دلاور نکلا، اس کا کتا گھوڑے کے پیچھے دوڑا۔ دلاور ان کے پیچھے دوڑا مگر اس میں تو چلنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ میرے پاس بل ٹیریر کتا تھا۔ شہباز اور موٹر کے کتے بھی ان کے ساتھ تھے۔ ہم نے کچھ نہیں سوچا۔ دلاور کو لہولہان دیکھا اور کتوں کی زنجیریں پٹوں سے الگ کر دیں۔ اچھا ہوا کہ دلاور کا کتا گھوڑے کے پیچھے جا رہا تھا۔ وہ ہماری ٹیم کا کتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہمارے تین کتے گولیوں کی طرح گھوڑے کے پیچھے گئے۔ ہمارے دوسرے ساتھی نالے میں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ موٹر نے بلند آواز سے کہا ـــــ "کتے کھول دو" ـــــ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ اوپر کیا ہو رہا ہے۔ سب نے کتوں کی زنجیریں کھول دیں۔ کتوں نے ہمارے کتوں کی غراہٹ سن لی تھی۔ یہ سب ایک ٹیم کے کتے تھے۔ ایک دوسرے پر جانیں قربان کر دیتے تھے۔ ایک دوسرے کے اشارے سمجھتے تھے۔ تمام کتے بے حد تیز ہماری طرف آئے۔

دلاور گر پڑا تھا۔ ہم نے اس کی پروا نہیں کی۔ ہم گھوڑوں کے پیچھے بھاگے۔ علاقہ بڑا سخت مشکل تھا۔ آگے چڑھائی تھی۔ کتے آگے نکل گئے۔ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم چڑھائی چڑھ گئے اور جب اوپر گئے تو آگے میدان تھا۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ جس گھوڑے پر لڑکی تھی اس تک ہمارے تین کتے پہنچ گئے تھے۔ دوسرا گھوڑا دور نکل

گیا تھا۔ ہمارے قریب سے پچھلے کُتے ہوا کی رفتار سے آگے نکل گئے۔ ان میں افضل کا ٹوہلی بھی تھا۔ مجھے صرف اس کُتے پر بھروسہ تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا (اور آخری) کہ ہم نے کسی انسان پر کُتے چھوڑے تھے۔ ہمارے دو کُتوں نے آگے ہو کر گھوڑے کو روک لیا۔ گھوڑے نے رُخ بدلا اور گھوڑا پھر سرپٹ دوڑا۔ ہم کھڈ اور اُونچی نیچی زمین پھلانگتے جا رہے تھے۔ کُتوں نے گھوڑے کا نیا رُخ بھی بدل دیا۔ ٹوہلی تیز نہیں دوڑ سکتا تھا کیونکہ اس کا جسم وزنی تھا۔ اُس نے جب گھوڑے کو گھومتے دیکھا تو اس نے بھی رُخ بدل لیا۔ ہمارا ایک کُتا گھوڑے کی ٹانگوں میں آگیا اور کچلا گیا۔ گھوڑے کا پاؤں اس کے پیٹ پر آگیا تھا۔ وہ تو وہیں ختم ہو گیا۔

اس سے گھوڑا اور زیادہ بدکا اور بے قابو ہو گیا۔ اب وہ دائیں بائیں بھاگ رہا تھا۔ ڈاکو کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی وہ کلہاڑی گھما کر کُتوں کے نرغے سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ شہسوار معلوم ہوتا تھا۔ اس نے لڑکی کو بھی دبوچ رکھا تھا۔ گھوڑا چکر میں آیا تو ٹوہلی پہنچ گیا۔ یہ خونخوار کُتا ذرا سا گھوڑے کے ساتھ دوڑا اور اُچھل کر نیچے سے گھوڑے کی شاہ رگ منہ میں لے لی۔ گھوڑا تیز دوڑ رہا تھا۔ زمین ہموار نہیں تھی۔ گھوڑے کی اگلی ٹانگیں دوہری ہوئیں اور وہ بُری طرح گرا۔ ہم سمجھے کہ ٹوہلی کچلا گیا لیکن وہ گرنے سے پہلے ہی گھوڑے سے الگ ہو چکا تھا۔ ڈاکو چھوٹے سے پتھر کی طرح دُور آگے جا پڑا۔ لڑکی بھی دُور جا پڑی ڈاکو کے ہاتھ سے کلہاڑی چھوٹ گئی۔ ہم ابھی پچاس ساٹھ گز دُور تھے۔ ڈاکو ایک طرف دوڑ پڑا کُتے گھوڑے پر ٹوٹ پڑے۔ گھوڑا اُٹھ کر دوڑ پڑا۔ اس نے دولتی سے ایک اور کُتا مار ڈالا ہم تک تھے لیکن ڈاکو نکل گیا تھا۔ موڑا اس کے پیچھے گیا۔ اُس نے اپنے کُتے کو پکارا۔ ہم سب نے اپنے کُتے کو پکارا۔ تین چار کُتے ہماری آواز پر آگئے۔ انہیں ہم نے ڈاکو کے پیچھے ڈال دیا۔

وہ دلاور کی کلہاڑیوں سے اور گھوڑے سے گرنے سے زخمی تھا۔ خالی ہاتھ بھی تھا۔ کتوں نے اسے دُور نہیں جانے دیا۔ وہ بیٹھ گیا اور دونوں بازوؤں میں سر اور منہ ڈھانپ لیا۔ اُدھر دوسرے لڑکوں نے گھوڑے کو پکڑ لیا۔

مُوجا ڈاکو جس سے سارا علاقہ ڈرتا تھا، ہمارے سامنے شکست کھا کر بیٹھا ہُوا تھا۔ اس نے ہماری بہت منّتیں کیں کہ اُسے چھوڑ دیں لیکن وہ ہمارے ایک دوست کو زخمی کر آیا تھا۔ ہمیں ابھی یقین نہیں تھا کہ دلاور زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ ہم نے مُوجے کے ہاتھ اس کی پگڑی سے پیٹھ کے پیچھے باندھ دیئے۔ اُس کا خون جاری تھا۔ دو گہرے زخم اس کی پیٹھ پر تھے اور ایک بائیں ران پر۔ اُس کا ساتھی بھاگ گیا تھا۔ لڑکی پر غشی طاری ہُوئی جا رہی تھی۔ اُسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ وہ بولتی ہی نہیں تھی۔ آنکھیں پھاڑے ہم سب کو دیکھتی تھی۔ صرف ایک بار اُس نے مری ہُوئی آواز میں پوچھا ــــ "وہ کہاں ہے؟" ــــ وہ دلاور کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ ہمارے تین چار دوستوں نے یہ عقل مندی کی کہ وہ دلاور کے پاس رُک گئے تھے۔ انہوں نے اس کے زخموں پر اپنی پگڑیاں باندھ دی تھیں۔ ہم نے مُوجے ڈاکو اور لڑکی کو ساتھ لیا اور دلاور کی طرف چل پڑے۔ گھوڑے کو کتوں نے زخمی کر دیا تھا لیکن یہ کھال کے زخم تھے۔ گہرے زخم نہیں تھے۔

شہباز گھوڑے پر سوار ہو گیا اور ایڑ لگائی۔ گھوڑا بڑی اچھی نسل کا تھا اور شہباز اچھا سوار تھا۔ وہ ایک دو منٹوں میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم جب اُس جگہ پہنچے جہاں دلاور گرا تھا تو وہاں دو لڑکے کھڑے تھے۔ انہوں نے دلاور کو گھوڑے پر سوار کرا دیا تھا اور شہباز اس کے ساتھ سوار ہو کر گھوڑا گاؤں کی طرف دوڑا لے گیا تھا۔ لڑکوں نے بتایا کہ دلاور کے کندھوں پر کلہاڑیوں کے گہرے زخم تھے [redacted] دو زخم پیٹھ پر تھے۔ ہم نے زمین پر

اس کا خون دیکھا تو یہ اُمید مر گئی کہ دلاور زندہ رہے گا۔ لڑکی نے خون دیکھ کر پوچھا ـــــ "یہ اُس کا خون ہے؟" ـــــ اور اس کے آنسو بہنے لگے۔ موجے ڈاکو نے کہا ـــــ "یہ لڑکا میرے ہاتھوں حرام موت مرا ہے" ـــــ لڑکی نے چلّا کر کہا ـــــ "مرے تیرا باپ۔ مریں تیرے جننے والے۔ خدا تجھے میرے سامنے کوڑھی کرے" ـــــ اور لڑکی رونے لگی۔

ہمارا گاؤں وہاں سے چھ سات میل دُور تھا۔ موجے ڈاکو نے ہمیں اس قسم کی دھمکیاں دینی شروع کر دیں کہ میرے ساتھی تمہارے سارے گاؤں کو جلا دیں گے۔ خون خرابہ کریں گے وغیرہ۔ ہم نے اُس کی دھمکیاں سُن لیں۔ کوئی جواب نہ دیا۔ ہمیں دلاور کا غم کھا رہا تھا اور ہم بہت جلدی گاؤں پہنچنا چاہتے تھے۔ بئیں اور شہباز لڑکی کو دوسروں سے الگ لے گئے اور اسے یہ یقین دلا کر کہ اُسے اس کے گھر چھوڑ آئیں گے پوچھا کہ ان ڈاکوؤں نے اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ انہوں نے اُس کے ساتھ کوئی بے جا حرکت نہیں کی۔ وہ اسے گھوڑے پر بٹھا کر یہاں لے آئے تھے۔ وہ ساری رات آہ و زاری اور منّت سماجت کرتی رہی۔ انہوں نے اُسے کہا کہ وہ اطمینان رکھے، وہ اُسے واپس چھوڑ آئیں گے لیکن لڑکی اُٹھ اُٹھ کر بھاگتی تھی۔ موجے ڈاکو نے خدا کی قسم کھا کر بھی اُسے کہا کہ وہ اُس کے باپ کی دھمکی کا انتقام لے رہا ہے۔ وہ زیورات اور نقدی واپس نہیں کرے گا لیکن لڑکی واپس کر دے گا۔ لڑکی نے اس لحاظ سے ان دونوں ڈاکوؤں کی بہت تعریف کی کہ انہوں نے اُسے پکڑنے کے سوا اُس کے جسم کو بُری نیّت سے ہاتھ نہیں لگایا۔ ایک ڈاکو نے اُسے یہ بھی کہا کہ تم ہمارے پاس خدا کی امانت ہو۔ ہم تمہیں جس طرح پاک صاف لائے تھے اسی طرح پاک صاف واپس کر دیں گے لیکن لڑکی انہیں گالیاں دیتی تھی، منّت کرتی تھی اور روتی چیختی تھی۔

لڑکی صحیح کہہ رہی تھی۔ اُس دَور کے نامی گرامی پیشہ ور ڈاکو عورت اور بچے پر ہاتھ نہیں

اُٹھاتے تھے۔ بعض اوقات کسی کی لڑکی یا بچے کو انتقاماً اٹھالے جاتے تھے یا اغوا کر کے قیمت بتاتے اور اس رقم کے عوض لڑکی یا بچے کو واپس کر دیتے تھے، لیکن ایسی وارداتیں کم ہوتی تھیں۔ زیادہ تر ڈاکہ اور رہزنی ہوتی تھی۔ آج کل کے چور اُچکے تو مسجدوں میں بھی چوری کرنے سے باز نہیں آتے اور راہ جاتی عورتوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ہمارے وقتوں میں پیشہ ور ڈکیت للکار کر واردات کرتے تھے۔ اوچھی حرکت نہیں کرتے تھے۔۔۔ میں نے مَوجے ڈاکو سے پوچھا کہ تم اس لڑکی کی اس کے باپ سے قیمت لینا چاہتے تھے؟ اس نے جواب دیا۔ "نہیں میں دن چڑھے اس کے گاؤں جاکر لڑکی واپس کر دیتا اور اس کے باپ سے کہتا کہ آئندہ کسی ڈکیت کو دھمکی نہ دینا۔"

ہم گاؤں کی طرف چل پڑے۔ آدھے راستے میں تھے کہ ہمارے گاؤں کے تین گھوڑ اسوار سرپٹ دوڑتے آئے۔ دلاور گاؤں پہنچ چکا تھا۔ وہاں سے شہر کا سرکاری ہسپتال پانچ میل دُور تھا۔ اُسے چارپائی پر ڈال کر لوگ دوڑتے ہوئے شہر چلے گئے تھے۔ اس کے متعلق بتایا گیا کہ ہوش میں تھا۔ یہ گھوڑ اسوار ہمارے گاؤں کے پیچھے آئے تھے۔ انہیں شہباز نے سارا واقعہ سُنا دیا تھا۔ وہ بہت خوش تھے کہ گاؤں کے لڑکوں نے معرکہ مارا ہے۔ ایک سوار نے مَوجے ڈاکو کو اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا، اور خود اس کے پیچھے بیٹھ کر گاؤں کو چل پڑا۔ ایک گھوڑے پر لڑکی کو بٹھایا گیا۔ باگیں گھوڑے والے نے تھام لیں اور وہ پیدل چلنے لگا۔ ہم ڈیڑھ دو گھنٹے بعد گاؤں میں داخل ہوئے۔ سارا گاؤں موجے ڈاکو اور لڑکی کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا۔ ہندو لڑکی کو میرے والد صاحب مرحوم اپنے گھر لے گئے۔ ہمارے گاؤں میں صرف ایک ہندو گھرانہ تھا۔ انہیں کہا گیا کہ وہ لڑکی کو کچھ کھلائیں پلائیں۔ ہندو قوم مسلمانوں سے اتنی نفرت کرتی تھی کہ ہمارے ہاتھ سے پانی بھی نہیں پیتی تھی۔ مسلمان خواہ ان کی عزت کی خاطر جان پر کھیل جائیں

ہندو اُن کے قریب سے بھی نہیں گزرتے تھے۔ کہتے تھے کہ مسلمان کے چھُونے سے جسم ناپاک ہوجاتا ہے۔

لڑکی کا گاؤں چار میل دُور تھا۔ لڑکی کے باپ کو اطلاع دینے کے لیے ایک آدمی بھیج دیا گیا۔ ہم تو صبح سویرے گاؤں سے نکل آئے تھے۔ واپس آئے تو یہ خبر ہمارے گاؤں میں پہنچ چکی تھی کہ فلاں گاؤں میں ڈاکہ پڑا ہے اور ساہوکار کی لڑکی اغوا ہوگئی ہے۔ پھر شہباز دلاور کو خون میں نہایا ہُوا گھوڑے پر ڈالے گاؤں میں پہنچا۔ اور جب گاؤں والوں کو پتہ چلا کہ یہ گھوڑا مَوجے ڈاکو کا ہے اور اسے لڑکی سمیت پکڑ لیا ہے تو وہاں اس خبر نے اور دلاور کی حالت نے کچھ اور ہی رنگ پیدا کر دیا... جو لوگ دلاور کو شہر لے گئے تھے انہوں نے وہاں تھانے میں رپورٹ بھی دے دی۔ ہمارا تھانہ شہر میں تھا۔ شام سے بہت پہلے تھانیدار گھوڑے پر سوار پہنچ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے پولیس کی گارد بھی آگئی۔ لڑکی کا باپ بھی آگیا۔ رات بہت دیر تک بیان ہوتے رہے۔ ہمیں دلاور کے متعلق بہت فکر تھا۔ رات کو شہر سے دو آدمی واپس آئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اب خطرے سے باہر ہے۔

مَوجا ڈاکو کئی اور وارداتوں میں مطلوب تھا۔ تھانیدار بہت ہی خوش تھا کہ اس کے علاقے کا ایک ڈاکو پکڑا گیا ہے۔ ڈاکو کا گھوڑا گاؤں میں ہی تھا۔ تھانیدار نے گھوڑے کی زین کے ساتھ وہ تھیلا بندھا دیکھا جس میں گھوڑے کو دانہ کھلایا جاتا ہے۔ اس تھیلے میں زیورات اور نقدی تھی۔ مَوجے اور لڑکی کے بیانوں سے، اور بعد میں دلاور کے بیان سے پتہ چلا کہ ہم جب اس شگاف سے چل پڑے تھے تو کچھ دُور جا کر دیکھا کہ دلاور ہم میں نہیں تھا۔ وہ دبے پاؤں پیچھے رہا اور غیرت کے جوش میں آکر اکیلا ہی کلہاڑی اٹھائے شگاف

میں چلا گیا۔ اندر جگہ کھلی تھی اور اُوپر سے قدرتی طور پر نصف ڈھکی ہوئی تھی۔ دونوں ڈاکو لڑکی کو بٹھاتے ہوئے کچھ کہہ رہے تھے۔ انہوں نے اُس کے ہاتھ اور پاؤں کھول دیئے تھے۔ لڑکی رو رہی تھی۔ دلاور نے انہیں للکارا — "لڑکی میرے حوالے کر دو" — ڈاکوؤں نے اُسے پیار سے کہا — "کاکا! گھر چلا جا" — مگر کاکا" بڑا گرم تھا۔ اُس نے آگے ہو کر لڑکی کا بازو پکڑ لیا۔ تب مَوجے نے اُسے دھکا دیا۔ دلاور نے لڑکی کو چھوڑ کر کلہاڑی کا وار کیا۔ اُس نے اپنا کُتا کھول دیا تھا۔ کُتا سدھایا ہُوا تھا۔ ڈاکوؤں نے کلہاڑیوں سے دلاور پر ہلہ کر حملہ کیا۔ مَوجے نے اپنے بیان میں کہا کہ اُس نے اتنا دلیر اور پھرتیلا لڑکا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے جم کر مقابلہ کیا۔ کُتّے نے بھی ڈاکوؤں پر حملے کیے لیکن ڈاکو بھی کلہاڑی باز تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا — "نکلو اُستاد! یہ سارے لڑکے آگئے تو پھنس جائیں گے۔ ان کے پاس کُتّے بھی ہیں" — ایک نے دلاور پر حملہ کیا۔ دوسرے نے لڑکی کو دبوچ لیا۔ اس موقع پر دلاور نے اس کی پیٹھ پر کلہاڑی کا وار کیا۔ یہ مَوجا تھا۔ وہ لڑکی کو اُٹھا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

اُس وقت تک مَوجا بھی زخمی ہو چکا تھا، دوسرا ڈاکو بھی زخمی ہُوا لیکن زیادہ زخم دلاور کو آئے۔ دوسرا ڈاکو بھی گھوڑے پر سوار ہو گیا اور دونوں بھاگ نکلے۔ دلاور اور اُس کے کُتّے نے پیچھا کیا مگر دلاور میں اب دم نہیں رہا تھا۔ وہ گر پڑا لیکن اُس کے کُتّے نے تعاقب جاری رکھا۔ اتنے میں ہم سب پہنچ گئے۔ لڑکی بیان دیتے وقت دلاور کا نام اس طرح احترام اور پیار سے لیتی تھی جیسے اپنے کرشن مہاراج یا کسی دیوتا کا نام لے رہی ہو۔ دلاور نے اُسے ڈاکوؤں سے چھڑایا تھا۔ لڑکی نے یہ بھی کہا — "میرے بھائی کھا کھا کر بھینسے بنے ہُوئے ہیں لیکن عورتوں سے بدتر ہیں۔ ڈاکو مجھے اُٹھا کر لے گئے اور میرے بھائی کھڑے

تھر تھر کانپتے رہے۔ گھر میں شکاری بندوق بھی تھی۔ ان سے اتنا بھی نہ ہُوا کہ کسی بہانے بندوق ہی اُٹھا لیتے۔ نہیں تو لڑ جاتے۔ مر جاتے۔ کنواری بہن کو اپنی آنکھوں ڈاکوؤں کے قبضے میں گھر سے جاتا نہ دیکھتے۔ یہ بھی انسان ہی تھا جو اکیلا دو سے لڑ گیا اور اس نے اپنا جسم قیمہ کرا لیا۔"

پولیس کی تفتیش کا بڑا لمبا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ لڑکی کو اس کے باپ کے سپرد کر دیا گیا۔ اسے اور اُس کے باپ کو تھانیدار نے اگلے روز تھانے آنے کو کہا۔ ہم سب کو بھی تھانے آنے کو کہا اور پولیس نے موجے ڈاکو اور اس کے گھوڑے کو اپنے ساتھ لیا۔ گاؤں کے نمبردار، چوکیدار اور ہم سب لڑکوں کو بھی ساتھ لیا۔ لالٹینیں جلا کر ساتھ لے لیں اور موقعہ واردات پر گئے۔ ہم رکھ سلیمان میں داخل ہوئے۔ لوگ کہتے تھے کہ یہاں سے دن کے وقت بھی کوئی نہیں گزرتا۔ جن اور چڑیلیں کھا جاتی ہیں لیکن آدھی رات کے وقت بھی ہمیں کوئی جن نظر نہ آیا۔ لالٹینوں کی روشنی میں سگاف کے اندر گئے۔ موجے کی نشاندہی پر ایک جگہ کھودی گئی۔ زمین سے ایک ٹرنک برآمد ہُوا جس میں زیورات نقدی اور کپڑے پڑے تھے۔ موجا ڈاکو بڑی بُری حالت میں تھا۔ اس کی پیٹھ اور ران پر کلہاڑیوں کے زخم تھے۔ اس نے کئی بار تھانیدار سے کہا کہ مجھے ہسپتال لے چلو۔ تھانیدار نے اُسے بڑی بُری گالیاں دے کر کہا — "تم میری نظروں کے سامنے مر جاؤ۔ اپنے ہاتھ سے تمہیں پانی نہیں پلاؤں گا" — گاؤں والوں نے کورے سوت کی اٹیاں جلا کر ان کی راکھ اس کے زخموں میں بھر دی اور دارو (دیسی شراب) ڈال دیا تھا۔ ہمارے گھر میں زخموں کا ایک مرہم تھا، وہ لگا کر اس کے زخموں پر کپڑے باندھ دیئے تھے۔ اُسے روٹی کھلائی اور دودھ بھی پلایا تھا۔ زخموں نے اُسے بہت تنگ کر رکھا تھا۔ تھانیدار نے

اسے کہا تھا کہ پورا اقبالِ جُرم کرو۔ مال کی نشاندہی کرو۔ اپنے ساتھیوں کی نشاندہی کرو۔ ہیرا پھیری کرو گے تو بھوکا رکھوں گا۔ ایک ٹانگ پر کھڑا رکھوں گا۔ اور پیاسا مار ڈالوں گا مَوجے نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور اس نے مال کی نشاندہی بھی کر دی۔ رات اسی طرح گزر گئی۔ صبح ہم نے ساری پولیس کو اور مَوجے کو ناشتہ کھلایا اور ہم سب اُن کے ساتھ تھانے گئے۔ وہاں لڑکی، اس کا باپ اور دونوں بھائی پہنچ چکے تھے لیکن بہت پریشان تھے کہتے تھے کہ لڑکی ان کے ساتھ آئی تھی۔ معلوم نہیں کہاں غائب ہو گئی ہے۔ ہم سب نے اِدھر اُدھر ڈھونڈا۔ وہ کہیں بھی نہ ملی۔ تھانیدار نے کہا کہ مَوجے کے ساتھی فرار کر گئے ہیں لیکن ہم حیران تھے کہ تھانے میں سے وہ لڑکی کو کس طرح لے اُڑے۔ دلاور ہسپتال میں تھا جو تھانے سے دو تین سَو گز دُور تھا۔ تھانیدار اُسے دیکھنے کے لیے چلا تو ہم بھی ساتھ چلے گئے۔ وہاں گئے تو یہ ہندو لڑکی دلاور کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ دلاور کی والدہ مرحومہ اور والد صاحب مرحوم بھی وہیں تھے۔ لڑکی سے پوچھا کہ وہ یہاں کس طرح آئی ہے۔ اس نے بتایا کہ اُس کا باپ اور بھائی تھانے میں گئے تو وہ چپکے سے کھسک آئی اور کسی سے پوچھا کہ ہسپتال کہاں ہے۔ اس طرح وہ ہسپتال پہنچی اور ہسپتال والوں سے دلاور کے متعلق پوچھ کر اُس کے پاس جا بیٹھی۔ دلاور خون زیادہ نکل جانے کی وجہ سے بہت کمزور اور پیلا ہو گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کی جان بچ گئی۔

یہاں سے پولیس اور قانون کی کارروائی شروع ہو گئی۔ دس بارہ روز بعد کا ذکر ہے کہ صبح سویرے لڑکی کا باپ ہمارے گاؤں میں آیا۔ اس نے ہمارے بزرگوں کو بتایا کہ اس کی لڑکی رات کو لاپتہ ہو گئی ہے۔ اس ہندو کو چونکہ ہمارے گاؤں سے ایک سہارا ملا تھا اس لیے وہ فریاد لے کر ہمارے ہی گاؤں میں آیا۔ اس نے بتایا کہ لڑکی شام کے وقت کسی بہانے باہر

نکلی پھر واپس نہیں آئی۔ اُسے یہی ڈر تھا کہ رات کو موجے کے ساتھی اُسے اُٹھا لے گئے ہیں۔ اس ہندو کو ہمارے بزرگوں نے تھانے جانے کا مشورہ دیا، لیکن وہ اکیلا جانے سے ڈرتا تھا۔ کہتا تھا کہ راستے میں ڈاکو اُسے قتل کر دیں گے۔ مجھے اور شہباز کو اس کے ساتھ بھیجا گیا۔ افضل اور موٹر بھی ساتھ ہو گئے۔ ہم شہر تھانے میں گئے۔ تھانیدار کو بتایا تو وہ بولا ــــ "لڑکی ہسپتال میں ہے۔ تھوڑی دیر گزری دلاور کا باپ اُسے تھانے میں لایا تھا اور کہتا تھا کہ یہ لڑکی رات کو گاؤں سے ہسپتال میں آئی ہے۔ کہتی ہے کہ واپس نہیں جاؤں گی۔ دلاور ٹھیک ہو جائے گا تو اس کے ساتھ جاؤں گی۔ مَیں اسے اس لیے تھانے میں لایا ہوں کہ ہم پر حرف نہ آئے۔ مَیں نے لڑکی کو دلاور کے باپ کے ساتھ بھیج دیا ہے اور اسے کہا ہے کہ وہ فکر نہ کرے۔ لڑکی چونکہ دلاور کی ممنون ہے اس لیے اس کی تیمارداری کرنا چاہتی ہے۔" دلاور کا باپ دلاور کے ساتھ ہسپتال میں تھا۔

ہم ہسپتال گئے۔ دلاور اتنا بہتر ہو گیا تھا کہ اُٹھ بیٹھا تھا۔ لڑکی وہیں تھی۔ باپ نے اسے گھر چلنے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ ہم سب حیران تھے کہ لڑکی (اور وہ بھی ہندو لڑکی) رات کے وقت اتنی دُور گاؤں سے تن تنہا پوٹھوہار جیسے علاقے میں پیدل شہر تک پہنچی اور وہ ڈری نہیں۔ اُس وقت مَیں نوجوان تھا۔ مَیں انسانی نفسیات کو نہیں سمجھتا تھا۔ آج اُس بڑھاپے میں مجھے وہ لڑکی یاد آتی ہے تو اُس وقت کی جذباتی کیفیت بیان کر سکتا ہوں جو مختصراً یہ ہے کہ لڑکی نارمل نہیں رہی تھی۔ دلاور کو وہ فرشتہ سمجھتی تھی۔ اس کا ذہن اپنے قابو سے نکل گیا تھا۔ ہم سب نے اسے کہا کہ گھر چلو تو اس نے معصوم سے بچے کی طرح کہا ــــ "اس کے ساتھ جاؤں گی" ــــ آخر دلاور نے اسے کہا ــــ "اپنے باپ کا کہا مان جاؤ اور چلی جاؤ" لڑکی نے کہا ــــ "نہیں۔ مَیں تمہارا کہا مانوں گی" ــ دلاور نے کہا ــــ "پھر چلی جاؤ۔"

اور وہ باپ کے ساتھ چل پڑی۔

ایک مہینے بعد دلاور بالکل تندرست ہو کر گھر آ گیا۔ اس دوران لڑکی ایک بار اپنے باپ کے ساتھ شہر دلاور کو دیکھنے گئی اور جب دلاور گھر آیا تو وہ ماں کے ساتھ دلاور کو دیکھنے آئی مگر ماں نے واپسی کی تیاری کی تو لڑکی نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگی ـــ "یہیں رہوں گی اور اس گھر کی خدمت کروں گی"۔ ـــ اُسے بڑی ہی مشکل سے ماں کے ساتھ بھیجا گیا۔ چند دنوں بعد وہ اکیلی آ گئی۔ اتفاق سے مَیں، چند ایک لڑکے اور دلاور گاؤں سے باہر دھوپ میں بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔ لڑکی چار میل پیدل چل کر آئی تھی۔ سخت تھکی ہوئی تھی۔ ہم دیکھ کر حیران ہوتے۔ وہ ہم سے ذرا دُور رُک گئی اور دلاور کو اشارے سے بلایا۔ دلاور گیا اور ہم سے دُور کھڑے ہو کر انہوں نے بہت دیر باتیں کیں۔ لڑکی واپس نہیں جا رہی تھی۔ اتنے میں ہم نے دیکھا کہ لڑکی کا باپ اور دونوں بھائی بڑی تیز تیز چلے آ رہے تھے۔ لڑکی دلاور کے پیچھے ہو گئی۔ اس کا باپ اور بھائی اُسے پکڑ کر گھسیٹنے لگے۔ لڑکی نے چیخنا چلّانا شروع کر دیا۔ گاؤں کے لوگ آ گئے اور عجیب تماشہ بن گیا۔ دلاور بہت پریشان تھا۔

لڑکی کو، اس کے باپ اور بھائیوں کو ہمارے بزرگ گاؤں میں لے آتے۔ انہیں دھوپ میں چار پائیوں پر بٹھایا۔ پتہ چلا کہ لڑکی چوری چھپے گھر سے نکلی اور ہمارے گاؤں کا رُخ کر لیا۔ کسی نے اسے دیکھ لیا اور اس کے گھر جا بتایا۔ اس کا باپ اور بھائی اس کے تعاقب میں آتے۔ دلاور نے بتایا کہ لڑکی اسے کہتی تھی کہ مَیں گھر سے بھاگ آئی ہوں۔ مجھے مسلمان کر لو اور میرے ساتھ شادی کر لو۔ شادی نہیں کرتے تو جس کلہاڑی سے تم نے مجھے ڈاکوؤں سے چھڑایا تھا اس سے مجھے قتل کر دو۔ دلاور نے اسے کہا کہ مَیں نے

تمہیں اس لیے نہیں چھڑایا تھا کہ تم جوان اور خوبصورت ہو۔ یہ میری غیرت اور مردانگی کا مسئلہ تھا کہ ایک لڑکی کو دو مردوں کے ظلم سے چھڑاؤں۔ یہ میرا فرض تھا، لیکن لڑکی نہیں مان رہی تھی۔ کہتی تھی کہ شادی نہ کرو، مجھے اپنے گھر رکھ لو۔۔۔ لڑکی کو ہمارے بزرگوں نے سمجھایا کہ بیٹی! تم غیر مذہب کی ہو۔ اپنے ہوش ٹھکانے کرو اور اپنے بھائیوں کے ساتھ چلی جاؤ۔ تم ان کی عزت ہو۔

لڑکی نے کہا — "یہ میرے بھائی نہیں ہیں۔ یہ بے غیرت ہیں۔ یہ (دلاور) غیرت والا ہے۔ یہ میرا بھائی نہیں تھا پھر بھی اس نے اپنا خون کرالیا۔ مَیں اسی کے پاس رہوں گی۔"

آپ اسے محبت کی انتہا کہہ سکتے ہیں جہاں انسان پاگل ہو جاتا ہے۔ لڑکی دراصل پاگل ہو چکی تھی۔ اس پاگل پن میں وہ کسی بھی ڈر یا خوف کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ وہ واپس نہیں جاتی تھی۔ آخر اس کے ساتھ یہ جھوٹ بولا گیا کہ مقدمے سے دونوں بعد اسے مسلمان کریں گے اور دلاور کے ساتھ شادی کرا دیں گے۔ یہ سُن کر اُس نے دلاور سے کہا — "تم اجازت دو تو مَیں جاؤں گی" — دلاور نے کہا — "ہاں، چلی جاؤ۔" وہ چل پڑی لیکن رُک کر دلاور سے کہا — "یاد رکھو۔ تم نہ آئے تو مَیں پھر آجاؤں گی" — وہ باپ اور بھائیوں کے ساتھ چلی گئی۔

دلاور کی حالت بہت بُری تھی۔ اس نے بتایا کہ ہسپتال میں لڑکی نے اسے کئی بار کہا تھا کہ مَیں اب ہندو نہیں مسلمان ہو، تم مجھ سے بھاگو گے تو قبر تک تمہارا پیچھا کروں گی۔ دلاور نے یہ بھی بتایا کہ لڑکی کا باپ ایک روز ہسپتال گیا تو دلاور کو پانچ سو روپیہ پیش کیا تھا۔ دلاور نے نہیں لیا تھا۔ یہ ہندو بہت مالدار تھا۔ وہ نیکی کا صلہ دے رہا تھا۔ اُس وقت کا پانچ سو روپیہ آج کے پانچ ہزار کے برابر تھا۔ دلاور نے کہا تھا کہ یہ میرا فرض تھا۔

اس دوران ایک عجیب و غریب اور بڑا ہی دلچسپ انکشاف ہُوا۔ پولیس سے پتہ چلا کہ مَوجے ڈاکو نے بتایا ہے کہ رَکھ سلیمان میں کوئی جِنّ اور چڑیل نہیں ہے۔ اس جگہ کو اس کا باپ اور اس کے ساتھی ڈکیتی کا مال چھپانے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ مَوجے کا باپ بھی ڈکیت تھا۔ وہ مَوجے کی طرح مشہور نہیں ہُوا تھا۔ اس نے دو دفعہ قید بھی کاٹی تھی۔ بیس سال گزرے مر گیا تھا اُس وقت موجا پندرہ سولہ سال کا تھا۔ اس نے باپ کا پیشہ اختیار کیا اور ڈاکو کی حیثیت سے شہرت پائی۔ رَکھ سلیمان ایسی جگہ تھی جہاں مال چھپایا جا سکتا تھا۔ اس کے باپ نے یہ جگہ مَوجے کو دکھائی تھی۔ اُس کے باپ کو اُس کے اُستاد نے دکھائی تھی۔ مَوجے کے بیان کے مطابق، اُسے باپ نے بتایا تھا کہ یہ جگہ بڑی ہی مُدت سے اِرد گرد کے علاقے کے لیے ڈراؤنی بنی ہُوئی تھی۔ لوگ سمجھا کرتے تھے کہ یہاں جِنّ اور چڑیلیں رہتی ہیں۔ سَو سال سے زیادہ عرصہ گزرا کسی ڈاکو نے یہ جگہ استعمال کی اور دیہات میں مشہور کر دیا تھا کہ یہ جگہ خطرناک ہے۔ اس کے بعد ڈاکوؤں اور رہزنوں نے اپنے مخبروں کی زبانی اس جگہ کے متعلق بڑی ڈراؤنی کہانیاں مشہور کر دیں۔ وہ جاہلیت کا زمانہ تھا۔ ایسی ہر کہانی کو جو مَیں نے آپ کو اس کہانی کے شروع میں سنائی ہے لوگ سچ مانا کرتے تھے۔ اب بھی دیہات میں جِنّوں بھُوتوں اور چڑیلوں کی یہ کہانیاں سچ مانی جاتی ہیں۔

ڈاکوؤں نے ابتدا میں اس جگہ سے گزرنے والے لوگوں کو چھُپ کر اور طرح طرح کی آوازیں نکال کر ڈرایا بھی تھا۔ کچھ تو یہ جگہ شکل و صورت سے ہی ڈراؤنی تھی۔ باقی کسر جِنّوں کی کہانیوں نے پوری کر دی۔ کرتے کرتے اس جگہ کو لوگ رکھ سلیمان کہنے لگے اور انہوں نے اُدھر سے گزرنا چھوڑ دیا۔ ڈاکو یہی چاہتے تھے کہ کوئی اُدھر سے نہ گزرے۔ پھر یہاں گِدھوں اور بڑے چمگادڑوں نے گھونسلے بنانے شروع کر دیئے۔ یہاں ڈاکوؤں اور رہزنوں کے

سوا اور کوئی نہیں آتا تھا۔ وہ یہاں چھپتے تھے اور مال چھپاتے تھے۔ موہا ڈاکو بھی اسی جگہ کو استعمال کرتا رہا تھا۔۔۔ یہ روئیداد بھی بہت دلچسپ ہے کہ ابتدا میں ڈاکوؤں نے کیسے کیسے طریقوں سے لوگوں کو اس جگہ سے ڈرایا تھا لیکن یہ بہت لمبا قصّہ ہے۔ ہم نے اپنے گاؤں والوں کو رکھ سلیمان کی حقیقت بتائی تو کسی نے بھی نہ مانی۔ انہوں نے سُنی سنائی کہانیاں دہرانی شروع کر دیں۔ بہرحال ہم نے رکھ سلیمان سے ڈرنا چھوڑ دیا اور تین چار ماہ بعد پھر وہاں گئے تھے۔ وہاں گدّھوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

اِس ہندو لڑکی نے دلاور کو بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ اگر آج کا کوئی نوجوان ہوتا تو اس لڑکی کے گاؤں کے چکّر کاٹتا رہتا لیکن دلاور وہ نوجوان تھا کہ اتنی خوبصورت لڑکی اس کے لیے پاگل ہُوئی جا رہی تھی اور وہ چھُپتا پھرتا تھا۔ اکثر پریشان رہتا اور کہتا تھا کہ لوگ نہ جانے کیسی کیسی باتیں بناتے ہوں گے۔ یہ بھی اچھا ہُوا کہ لڑکی نے بڑوں کے سامنے کہہ دیا تھا کہ وہ مسلمان ہو کر دلاور کے ساتھ شادی کرے گی۔ یہ معاملہ چوری چھُپے کا نہیں تھا۔ ایک موقعہ ایسا بھی آیا کہ گاؤں کے دو بزرگوں نے دلاور کے والد صاحب مرحوم سے کہا کہ ایک ہندو لڑکی مسلمان ہو جاتے تو ثواب کا کام ہے۔ اسے مسلمان کر لو اور بہُو بنا لو۔ والد صاحب کسی حد تک مان گئے تھے لیکن دلاور نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ سارا علاقہ کہے گا کہ خانو نے لڑکی کی خوبصورتی دیکھ کر اسے ڈاکوؤں سے چھڑایا تھا۔

لڑکی کے متعلق اُس کے گاؤں کے مسلمانوں سے پتہ چلتا رہا۔ معلوم ہُوا کہ اس نے ماں باپ کو پریشان کر رکھا ہے اور ایک روز وہ مسجد میں چلی گئی تھی۔ مولوی صاحب سے کہا کہ مجھے مسلمان کر لو اور خانو کے پاس چھوڑ آؤ۔ مولوی صاحب نے دو بزرگوں کو بلایا اور لڑکی کو اس کے گھر چھوڑ آئے۔ لڑکی کے باپ اور بھائیوں نے اُسے مارا پیٹا۔ یہ فساد

بڑھ بھی گیا کیونکہ لڑکی کو وہ جب مارتے تھے تو وہ گھر سے بھاگ کر کسی مسلمان کے گھر چلی جاتی تھی۔ ایک روز اُس کے باپ نے مسلمانوں کے سامنے کہا۔ "مَیں اسے زہر دے دوں گا مسلمان کے ساتھ شادی نہیں کرنے دوں گا۔" لڑکی کہتی تھی کہ مَیں مسلمان ہو گئی ہوں۔ اُس نے سُنا ہے کہ یہ بھی کہا تھا کہ مسلمان اگر ڈاکو ہو تو بھی اچھا ہوتا ہے۔ اُس نے موجے ڈاکو کی بھی تعریفیں شروع کر دیں اور کہنے لگی کہ وہ ڈاکو تھا، مجھے ساری رات اپنے پاس رکھا لیکن اُس کی نیت خراب نہیں ہوئی۔ اُس نے مجھے میرے باپ کی دھمکی کی وجہ سے اُٹھایا تھا۔ پھر وہ کہتی تھی کہ میرا خاوند خانو ہے اور میں مسلمان ہوں۔

باپ نے اُسے اپنے گاؤں کے ایک ہندو کے ساتھ زبردستی بیاہ دیا۔ شادی کے چند روز بعد لڑکی ایک بار پھر چوری چھپے ہمارے گاؤں میں آگئی اور سیدھی دلاور کے گھر گئی۔ بعد میں دلاور نے بتایا کہ لڑکی نے اُسے کہا تھا کہ تم نے مجھے قبول نہیں کیا۔ اب میری ایک خواہش پوری کر دو۔ میرے پہلے بچے کے باپ تم ہو گے۔ دلاور ایسی بات ماننے والا کہاں تھا۔ دلاور کے گھر والوں نے لڑکی کو بہت سمجھایا مگر وہ جاتی ہی نہیں تھی۔ اس نے سب کے سامنے کہنا شروع کر دیا ــــ "میرا پہلا بچہ خانو ہو گا" ــــ شام سے ذرا پہلے اس کا باپ اور خاوند آگئے، اور وہ اسے زبردستی لے گئے۔ وہ اب بالکل ہی پاگل ہو چکی تھی۔ مَیں آج محسوس کرتا ہوں کہ اس کے دماغ پر اغوا اور ڈاکوؤں کی دہشت کا بھی اثر تھا اور اس دہشت میں دلاور کی محبت شامل ہو گئی تھی اور راستے میں مذہب آگیا تھا جس سے اُسے نفرت ہو گئی تھی۔ اُسے اپنے باپ اور بھائیوں سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ خاوند کو تو اُس نے قبول ہی نہیں کیا تھا۔ ان سارے عناصر نے مل کر اسے دیوانہ بنا ڈالا تھا۔

پھر یہ اطلاع ملی کہ اُس کے خاوند نے اُس کے والدین سے کہہ دیا ہے کہ وہ اس لڑکی

کو گھر میں نہیں بسا سکتا لیکن ہندوؤں کے قانون بڑے سخت تھے۔ طلاق ممکن ہی نہیں تھی... اور ایک صبح ہمارے گاؤں میں شور اُٹھا — "دو لاشیں جا رہی ہیں" — ہم دوڑتے گئے۔ دو چارپائیاں ہمارے گاؤں کے قریب سے گزر رہی تھیں جو مسلمانوں نے اُٹھا رکھی تھیں۔ ساتھ اس ہندو لڑکی کا باپ، بھائی، خاوند اور دوسرے رشتہ دار تھے۔ پتہ چلا کہ لڑکی اور اس کے خاوند کو کسی نے زہر دے دیا ہے۔ خاوند مر چکا ہے اور لڑکی ابھی زندہ ہے۔ وہ بے ہوش تھی۔ وہ انہیں شہر لے جا رہے تھے۔ شہر کا راستہ ہمارے گاؤں کے قریب سے گزرتا تھا۔ ہم سوچنے لگے کہ دونوں کو کس نے زہر دیا ہے؟ شاید موجے ڈاکو کے ساتھیوں نے انتقام لیا ہو۔ دوسرے دن ہمیں پوری خبر مل گئی۔ نمبردار تھانے کسی کام سے گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ لڑکی ہسپتال میں زندہ پہنچی تھی۔ پولیس وہیں چلی گئی۔ ڈاکٹر لڑکی کو دوائیاں اور ٹیکہ دے کر ہوش میں لے آیا۔ اُس نے صرف اتنا سا نزعی بیان دیا کہ مَیں نے اس آدمی کو کبھی بھی خاوند نہیں سمجھا تھا۔ یہ مجھے زبردستی بیوی بنانا چاہتا تھا۔ مَیں اسے کہتی تھی کہ میرا خاوند خانو ہے، تم نہیں۔ خاوند مجھے مارتا پیٹتا تھا اور اس کا باپ بھی مجھے مارتا تھا۔ مَیں نے کل زہر لیا اور اسے دُودھ میں پلا دیا اور خود بھی زہر پیا ہے۔ لڑکی نے یہ وصیت کی کہ میری لاش ہندوؤں کو نہ دینا۔ لاش جلانا نہیں۔ خانو کے گھر چھوڑ آنا۔ مَیں مسلمان ہُوں۔ خانو سے کہنا کہ مجھے اپنے قبرستان میں دفن کرے۔

وہ مر گئی اور اس کی لاش ہندو لے گئے۔ رکھ سلیمان کی پہلی اور آخری حسین چڑیل جلا دی گئی اور رکھ سلیمان کی کہانی ختم ہو گئی۔ موجے ڈاکو کو بہت سی وارداتوں میں ستائیس سال سزائے قید ہو گئی... رکھ سلیمان سے لوگ بدستور ڈرتے رہے اور ایک نئی کہانی مشہور ہو گئی۔ لوگ وثوق سے کہنے لگے کہ ایشری (ہندو لڑکی) پر رکھ سلیمان کے ایک جن کا قبضہ

ہو گیا تھا۔ اِس جن نے اسے کہا تھا کہ خانُو کے ساتھ شادی کرو۔ یہ کہانی کچھ عرصہ سُنی سنائی جاتی رہی۔ دس بارہ سال بعد رُکھ سلیمان کی دہشت کم ہونے لگی۔ کرتے کہتے لوگ اِدھر سے گزرنے لگے اور پھر کسان وہاں کے درخت کاٹنے لگے۔ پھر ساون کی بارشوں سے مٹی کے ٹیلے شکلیں بدلتے گئے۔ آج وہاں کی دُنیا ہی بدلی ہوئی ہے۔ وہ جگہ جہاں موجے ڈاکو نے ایشری کو لے جا کر چھپایا تھا، ہموار ہو گئی ہے۔ لوگ ایک مدّت گزری بھول گئے ہیں کہ اس جگہ کا نام رکھ سلیمان ہُوا کرتا تھا۔ خانُو کو یاد کرنے کے لیے مَیں اور شہباز رہ گئے ہیں۔ خانُو کی اولاد اُس کی بہادری سے واقف ہے مگر اولاد کی اولاد کو دیکھا ہے۔ بال لڑکیوں کی طرح بڑھائے ہُوئے، فلموں اور شہر کی بے حیائی کا مارا ہُوا لڑکا۔ اس سے تو رُکھ سلیمان کی ایشری اچھی تھی۔

زلیوراں کا نیلا

میں جانتی ہوں تم سب کی نیّت خراب ہے۔ مجھے آگے جانے دو۔ نیلا میرے آگے نہیں ہلے گا۔ دشمنوں کو تماشہ نہ دکھاؤ۔

جنگلی بھینسے کے شکار کی کہانیاں تو آپ نے کئی پڑھی ہوں گی۔ ہر کہانی میں شکاری انگریز ہوتا ہے اور بھینسا افریقی۔ مجھے تو اب بھی معلوم نہیں کہ جنگلی بھینسے افریقہ کے علاوہ اور کون کون سے ملک میں ہوتے ہیں۔ میں یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے علاقہ پوٹھوہار میں جنگلی بھینسا نہیں پایا جاتا، نہ کبھی پایا گیا ہے۔ آپ نے افریقہ کے جنگلی بھینسوں کے متعلق پڑھا ہوگا کہ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ اگر آپ اس سے بچنے کے لیے درخت پر چڑھ جائیں تو یہ درخت کے نیچے بیٹھ جاتا ہے۔ بخشتا نہیں۔ اس سے ہاتھی اور درندے بھی ڈرتے ہیں۔ شکاری اسے بندوقوں اور رائفلوں سے مارتے ہیں۔

میں نے جنگلی بھینسوں کے شکار کی کہانیاں اُس وقت پڑھنی شروع کی تھیں جب ڈائجسٹ نکلنے شروع ہوئے تھے۔ شروع شروع میں ڈائجسٹوں کا گزارہ ایسی ہی کہانیوں پر چلتا تھا۔ اس کے بعد تو ان میں دوسرے شکار کی کہانیاں شائع ہونے لگی تھیں جو شہروں کی سڑکوں پر، باغوں اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں کھیلا جاتا ہے۔ میں نے جب جنگلی بھینسوں کے شکار کی کہانیاں پڑھنی شروع کیں، اُس وقت میرا پہلا بیٹا جوان ہو چکا تھا۔ یہ کہانیاں پڑھ کر مجھے اپنے علاقے کے چند ایک بھینسے یاد آگئے تھے جو جنگلی نہیں پالتو تھے مگر

جنگلیوں سے زیادہ خطرناک ہو گئے تھے۔ ان میں سے شاید ایک دو کی کہانیاں آپ کو سُنا چکا ہُوں۔ یہ بدمست ہو گئے تھے۔

آج ایک اور یاد آگیا ہے لیکن یہ بھینسا نہیں، سانڈ تھا۔ نوجوان بیل۔ ایسے سانڈوں کو ہم اپنی زبان میں ساہن کہا کرتے ہیں۔ آج کل تو ایسے سانڈ کم ہی نظر آتے ہیں۔ مصنوعی کھاد کے اُگائے ہوئے پٹھے کھا کھا کر سانڈوں میں وہ بات ہی نہیں رہی جو ہمارے وقتوں میں ہُوا کرتی تھی۔ نہ ہمارے نوجوانوں کے قدبُت رہے ہیں نہ سانڈوں اور بھینسوں میں وہ طاقت رہی ہے جو محاورے کے طور پر استعمال ہُوا کرتی تھی۔ اب یہ کہنا غلط ہے کہ بھینس کے آگے بین بجانا بیکار ہے۔ آج کل کی بھینسیں فلمی موسیقی کی رسیا ہو گئی ہیں۔ اب فلمی گانے جو دلائتی دھمال کی تال پر گائے جاتے ہیں، بھینسوں اور سانڈوں کو ہی پسند آسکتے ہیں۔ اگر صحن میں ٹرانسسٹر لگا ہُوا نہ ہو تو بھینس دودھ نہیں دیتی۔

اس دھماکہ چوکڑی والی فلمی موسیقی نے بھینسوں اور سانڈوں کے چال چلن پر ایسا بُرا اثر ڈالا ہے کہ ان کی وہ صحت اور تندرستی ہی نہیں رہی۔ ان کے لیے کوئی سلوتری قسم کا میم۔ الف درکار ہے۔

مدت گزر گئی ہے، بھینسے لڑتے نہیں دیکھے۔ دو بھینسے کبھی جوشِ رقابت میں ٹکرا جاتے تھے تو وہ ایک جگہ نہیں لڑتے تھے۔ لڑتے لڑتے گاؤں میں گھوم جاتے تھے اور پھر دُور نکل جاتے تھے۔ لوگ بچوں کو گھروں میں بند کر لیتے تھے۔ باؤلے کُتّے کا اور لڑتے ہوئے بھینسوں کا اعلان نما شور سب پر دہشت طاری کر دیا کرتا تھا۔ لڑتے بھینسوں کو کوئی چھڑانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ یہ بھینسے گاؤں کی کسی کچی دیوار سے ٹکرا جاتے تو

دیوار گر پڑتی تھی۔

بدمستی میں آیا ہُوا بھینسا اور زیادہ خطرناک ہوتا تھا۔ بدمستی میں آیا ہُوا دوسرا خطرناک جانور اُونٹ تھا۔ یہ تو اپنے مالک کو بھی مار ڈالتا تھا۔ ہمارے علاقے میں کھڈ نالوں، برساتی ندیوں، ٹیلوں اور نشیب و فراز کی وجہ سے پکی سڑکیں نہیں بن سکیں۔ بار برداری کے لیے اُونٹ اور گدھے استعمال ہوتے ہیں۔ شتربانوں کے ہاں کبھی کبھی کوئی اُونٹ بدمستی میں آجاتا ہے۔ ایسا اُونٹ آدمی کو منہ میں لے لیتا اور چبا چبا کر مار ڈالتا ہے۔

میری جوانی کا واقعہ ہے۔ ہمارے گاؤں میں دو آدمی آئے۔ انہوں نے چار میل دُور کے ایک گاؤں کا نام لے کر بتایا کہ وہاں کا ایک سانڈ بدمست ہو گیا ہے۔ اس نے دو بکریاں مار ڈالی ہیں اور ایک بیل کے پیٹ میں سینگ مار کر پیٹ پھاڑ ڈالا ہے۔ ان آدمیوں نے بتایا کہ وہ اس قدر بدمست ہے کہ جس آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھتا ہے، اُس کی طرف بہت تیز دوڑتا ہے۔ اسے گھیر کر پکڑنے کی کوشش کی گئی لیکن ایک آدمی اس کی زد میں آگیا۔ وہ پھر تیلا تھا۔ زخمی تو ہُوا لیکن مرنے سے بچ گیا۔

وہ دو روز گاؤں کے اردگرد گھومتا پھرتا رہا۔ لوگوں نے اس کے ڈر سے مویشی باہر نہ نکالے اور خود بھی گھروں میں دبکے رہے۔ تیسرے دن وہ گاؤں سے ایک میل دُور چلا گیا۔ اس کے لیے چارے کی کمی نہیں تھی۔ فصل کھڑی تھی۔ اس کے مالک اُس سے دور دور اُس کے تعاقب میں رہے۔ وہ بڑا قیمتی سانڈ تھا اور نوجوانی کی عمر میں تھا۔ ان آدمیوں کی اطلاع کے مطابق، ایک گھوڑ سوار بڑے مزے سے چلا جا رہا تھا۔ سانڈ پیچھے سے اس کی طرف دوڑا۔ گھوڑ سوار نے پیچھے دیکھا۔ اُسے "آگے سے ہٹ جاؤ۔ گھوڑے کو ایڑ لگاؤ" کی للکار سنائی دی لیکن سوار نے پروا نہ کی۔ وہ سمجھا ہوگا کہ یہ لوگ

سانڈ کو پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔

سانڈ نے بڑی ہی تیز رفتار سے آتے ہوئے پیچھے سے گھوڑے کو ٹکر ماری۔ گھوڑا منہ کے بل گرا۔ سوار دُور آگے جا پڑا۔ وہ خوش قسمت تھا کہ سانڈ کی توجہ گھوڑے پر تھی۔ گھوڑا ابھی اٹھا ہی تھا کہ سانڈ نے اسے ایک اور ٹکر ماری۔ سوار وہاں سے بھاگ گیا۔ گھوڑا دوسری طرف دوڑ پڑا لیکن وہ لنگڑا رہا تھا۔ سانڈ اُس کے پیچھے گیا۔

سانڈ کے مالک راہ جاتے لوگوں کو دُور سے خبردار کر دیتے اور لوگ راستہ بدل لیتے تھے۔ اب سانڈ (ان آدمیوں کی اطلاع کے مطابق) ایک برساتی نالے (کس) میں چلا گیا تھا جو خشک پڑا تھا۔ اس کے دونوں طرف عمودی ٹیلے دیواروں کی طرح کھڑے تھے۔ سانڈ وہاں بیٹھ گیا تھا۔

"تمہارے گاؤں کے کُتّے مشہور ہیں" —— اِن دونوں میں سے ایک آدمی نے کہا —— "اس سانڈ نے ابھی کسی آدمی کو تو جان سے نہیں مارا لیکن وہ وہاں سے نکل کر کسی گاؤں میں چلا گیا تو معلوم نہیں کتنے انسانوں کو مار ڈالے۔ تم اپنے تمام کُتّے لے جاؤ اور اس سانڈ کو ختم کر دو، ورنہ وہ بہت نقصان کرے گا۔"

ہم نے انہیں بتایا کہ کُتّے کسی سانڈ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کُتّے درندے نہیں ہوتے۔ یہ سانڈ کو بھگا سکتے ہیں یا زخمی کر سکتے ہیں۔ بدمست سانڈ سے تو یہ خطرہ تھا کہ کتّوں کو مار سکتا تھا۔ ہمارے ایک بزرگ نے کہا کہ یہ سانڈ اگر بدمست ہو گیا ہے تو شاید اس کی بدمستی ختم ہو جائے گی۔ اگر یہ باؤلا ہو گیا ہے تو اس کا ایک ہی علاج ہے کہ کسی بندوق والے کو بلا کر اسے گولی مار دی جائے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ چند سال گزرے، لاہور چڑیا گھر کا ایک ہاتھی بدمستی میں آ گیا

تھا۔ اس نے ایسا خطرہ پیدا کر دیا تھا کہ چڑیا گھر تماشائیوں کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔ آخر اسے گولی مار دی گئی تھی۔

ان آدمیوں نے بتایا کہ سانڈ کے مالکوں کو کہا گیا ہے کہ اسے گولی مار دیں، ورنہ اس نے کسی آدمی کو مار ڈالا تو پولیس تک رپورٹ پہنچے گی اور وہ مصیبت میں پھنس جائیں گے، مگر وہ نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ سانڈ ٹھیک ہو جائے گا۔ سانڈ کے مالکوں کو کسی عامل نے بتایا کہ دشمنوں نے اس پر تعویذ کر دیئے ہیں اور تعویذ کا اثر تعویذ یا ایک خاص عمل سے ہی دُور ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایک شاہ جی جو جن نکالنے اور الٹے تعویذوں کا توڑ کرنے میں مشہور تھے، اپنا دم درود کر رہے تھے۔

دیہات میں بعض آدمی مویشیوں کی بیماریوں کا علاج مہارت سے کرتے تھے۔ وہ دیسی دوائیاں بنا کر بیمار مویشی کو دیتے اور صحت یاب کر لیتے تھے۔ ایسے ہی ایک سیانے نے دعوے سے کہا تھا کہ سانڈ کسی طرح قابو میں آ جائے اور اس کے منہ میں دوائی ڈال دی جائے تو یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بانس کے ڈیڑھ دو فٹ لمبے ٹکڑے کے اندر دوائی ڈال کر بیمار مویشی کے منہ میں ڈالتے ہیں لیکن مویشی کو قابو میں رکھنا پڑتا ہے۔ بدمست سانڈ کے منہ میں دوائی ڈالنا ممکن نہیں تھا۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ مالک سانڈ کو جان سے کیوں نہیں مارتے تھے۔ اُس زمانے میں گوجر خان میں ہر سال مویشیوں کا میلہ لگا کرتا تھا جسے ہم لوگ کیٹی کہا کرتے تھے۔ عجیب رونق ہُوا کرتی تھی۔ تمام تر ضلع سے تماشا کے لیے خاص طور پر پالے ہُوئے سانڈ آتے تھے۔ کبڈی اور نیزہ بازی ہوتی تھی۔ انگریزوں کا دَور تھا۔ راولپنڈی سے انگریز کمشنر اور ڈپٹی کمشنر آتے تھے۔ سانڈوں کو اوّل دوم انعام دیئے جاتے تھے۔

انگریز افسر سانڈوں اور گھوڑوں کی اعلیٰ اور تندرست نسلیں پالنے والوں کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

دیہات میں کمیٹی میلے کے لیے پالے جانے والے سانڈوں کے متعلق رویہ اور رواج یہ تھا کہ سانڈ کو سارے گاؤں کی عزت سمجھا جاتا تھا۔ میلے کے لیے سانڈ گاؤں سے نکلتا تو گاؤں والوں کا جلوس ساتھ ہوتا تھا۔ ڈھول بجتے تھے۔ یہ سانڈ نوعمر ہوتے تھے۔ ان سے نمائش کے سوا کوئی اور کام نہیں لیا جاتا تھا، یا ان کا کام کھانا اور خدمت کرانا ہوتا تھا۔ انہیں صابن سے نہلایا جاتا اور سینگوں پر سونے یا چاندی کے ورق چڑھائے جاتے تھے۔ ان میں اکثر سانڈ صرف گھر والوں کا ادب لحاظ کرتے تھے کسی اور کو پلے نہیں باندھتے تھے۔ مارتے بھی تھے۔ بعض غصیلے اور منہ زور ہو جاتے تھے انہیں قابو میں رکھ کر میلے تک لے جانے کے لیے ایسے آدمی ساتھ ہوتے تھے جن میں سانڈوں جیسی طاقت ہوتی تھی۔

دیہات میں برادریوں کے درمیان بھی انعام جیتنے کا مقابلہ ہو جایا کرتا تھا۔ یہ سانڈ جس کی میں کہانی سنا رہا ہوں، کمیٹی میلے کے لیے پالا ہوا نوعمر سانڈ تھا۔ میلے میں صرف ایک مہینہ رہ گیا تھا۔ سانڈ تیار تھا لیکن بدمست (دیا باؤلا) ہو گیا۔ اس سے پچھلے سال اس گھرانے نے ایک اور سانڈ میلے میں مقابلے کے لیے پیش کیا تھا مگر اسی برادری کے ایک اور سانڈ نے انعام حاصل کر لیا تھا۔ اُن لوگوں نے گاؤں میں جشن منایا اور ہارنے والے سانڈ کے مالک گھرانے کو طعنے دیئے تھے۔ یہ ہارنے والوں کی غیرت کے لیے چیلنج تھا۔

دیہات میں غیرت پڑے خون خرابے کراتی ہے۔ ہارنے والے سانڈ کے مالکوں نے

غیرت مندی کا یہ مظاہرہ کیا کہ اپنے اتنی اچھی نسل کے سانڈ کو ذبح کر دیا اور گوشت سارے گاؤں میں تقسیم کر دیا اور انہوں نے اعلان کیا کہ اگلے سال انعام ہمارا سانڈ لے کر آئے گا۔ ایک مہینے کی تلاش سے انہیں سرگودھا کے کسی گاؤں سے یہ سانڈ ملا تھا۔ اسے انہوں نے مقوی غذاؤں کے علاوہ دودھ اور مکھن بھی کھلایا۔ ہمیں بتایا گیا کہ تین چار مہینوں بعد یہ نوعمر سانڈ جسامت میں چٹان بن گیا۔ پھنکارنے لگا اور اسے دو مضبوط رسّے ڈالے جانے لگے۔ اس کے مالک اسے ہر روز باہر نکالتے اور اپنے حریفوں کو دکھانے کے لیے اس کی نمائش کرتے تھے۔

سانڈ دن بدن فصیلا اور منہ زور ہوتا چلا گیا۔ ہم نے سنا کہ اس کے مالکوں سے کہا گیا تھا کہ اسے اتنی زیادہ غذا نہ دیں، اور اسے ٹھنڈا رکھنے کے لیے بھی کچھ دیتے رہیں۔ مالکان سانڈوں اور مویشیوں کے معاملے میں اناڑی تو نہیں تھے سب اونچ نیچ جانتے تھے مگر اب کے حریفوں کے چیلنج نے اُن کی سمجھ بوجھ پر پردے ڈال دیئے۔ وہ غذا ہی دیتے چلے گئے۔ اس کے نتیجے میں سانڈ منہ زور ہوتا چلا گیا۔ مالک بڑے فخر سے کہتے تھے کہ اُن کے سانڈ کو قابو میں رکھنے کے لیے چار پہلوانوں کی ضرورت ہے۔ اُن کے حریف بھی سانڈ پال رہے تھے۔

میلے میں صرف ایک مہینہ رہ گیا تو ایک روز سانڈ کو حسبِ معمول باہر نکالا گیا۔ اُسے ایک گائے نظر آگئی۔ سانڈ ایسا جھٹکا دے کر بھاگا کہ جن دو آدمیوں نے اُس کی رسیاں ناک کے قریب سے پکڑ رکھی تھیں، وہ چند قدم تو اُس کے ساتھ دوڑے لیکن سانڈ نے سر کو دائیں بائیں مار کر انہیں گرا دیا اور آزاد ہو گیا۔ سانڈ اپنے آپ کو شہزادہ سمجھتا تھا مگر جب گائے کے قریب گیا تو گائے نے اسے بالکل ہی لفٹ نہ کرائی۔ سانڈ نے جب دست درازی

کی کوشش کی تو گائے نے پیچھے مڑ کر اُس کے پیٹ میں ٹکر ماری۔ گائے بھی اعلیٰ نسل کی تھی اور یہ کوئی غیرت مند گائے تھی جو اپنے آپ کو اللہ میاں کی گائے نہیں سمجھتی تھی۔ اُس نے بڑی دلیری سے سانڈ کا مقابلہ کیا۔

دو چار ٹکروں سے سانڈ کی خوش فہمی اور طاقت کا گھمنڈ کافور ہو گیا۔ گائے نے اُسے ٹکر بھی پیٹ میں ماری۔ اس کا سینگ شاید زیادہ زور سے لگ گیا ہوگا۔ سانڈ کی وہ جس پھڑک اُٹھی جس کے تحت کوئی مایوس امیدوار رشتہ نہ ملنے پر لڑکی کے منہ پر تیزاب پھینک دیتا ہے۔ سانڈ نے گائے کی پسلیوں میں اتنی زور سے ٹکر ماری کہ گائے گر پڑی۔ وہ اُٹھی تو سانڈ نے اُسے ایک اور ٹکر ماری۔ تب گائے بھاگ اُٹھی۔ سانڈ غصے سے باؤلا ہو چکا تھا۔ اس نے گائے کا تعاقب کیا۔ لوگ سانڈ کو پکڑنے کو دوڑے لیکن قریب گئے تو اُس نے لوگوں پر حملہ کر دیا۔ گائے کو تو اُس کے مالک لے گئے، سانڈ بے قابو ہو گیا۔ اس کی پھنکار خوفناک تھی۔ اس نے یکے بعد دیگرے دو بکریوں کو مار ڈالا۔ ایک آدمی کو زخمی کیا اور گاؤں سے دُور چلا گیا۔ اب اس کی حالت یہ ہو گئی کہ جہاں کسی آدمی کو دیکھتا اُس کی طرف بڑی ہی تیز رفتار سے دوڑ پڑتا۔ یہ لوگوں کی پھرتی اور قسمت تھی کہ بچ کر اِدھر اُدھر ہو جاتے تھے۔

ان آدمیوں نے ہمیں بتایا کہ سانڈ مالکوں کے لیے بیکار ہو چکا ہے۔ نہ وہ کسی کے قابو میں آئے گا نہ اسے سیانے کی دوائی دی جا سکے گی۔ مالک اسے مارنے کی اجازت اس لیے نہیں دے رہے تھے کہ ان کے حریف مذاق اڑائیں گے بلکہ وہ یقین سے کہتے تھے کہ حریفوں نے ان کے سانڈ پر تعویذ کر دیئے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ عامل شاہ نے تعویذ کا توڑ کر دیا ہے۔ سانڈ کے مالک تو سانڈ پر قابو پانے کے لیے اپنا ایک آدمی بھی قربان کرنے کو تیار تھے۔

ہم نوجوان تھے۔ مہم جوئی اور تجسس کا خبط سوار رہتا تھا۔ ہم نے گتے ساتھ لیے اور

تماشا دیکھنے چلے گئے۔ شکار کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ گیارہ بارہ کتے اور پندرہ سولہ لڑکے تھے۔ ہم بدمست سانڈ کو دیکھنے چلے گئے۔ ہم نے یہ سوچا تھا کہ سانڈ نے ہم پر حملہ کیا تو اس پر کتے چھوڑ دیں گے۔ راستے میں تین چار آدمی ملے جنہوں نے ہمیں بتایا کہ ایک بدمست سانڈ کسی میں بیٹھا ہے اور لوگ اوپر کھڑے ہیں۔ ہر آدمی نے ہمیں سانڈ کی مختلف کہانی سنائی۔

وہ جگہ اڑھائی تین میل دور تھی۔ ہمیں سب سے پہلے وہ لوگ نظر آئے جو سانڈ کو دیکھ رہے تھے۔ ہم وہاں پہنچے۔ کسی (برساتی نالہ) جو اس وقت خشک تھی وہاں سے تنگ تھی جہاں سانڈ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے کنارے دیواروں کی طرح عمودی اور اونچے تھے۔ ان کی بلندی کم و بیش تیس تیس گز تھی۔ انہیں ہم دندیاں کہتے ہیں۔ ان پر کھڑے ہو کر نیچے دیکھو تو یوں لگتا ہے جیسے کسی اونچے مکان کی منڈیر پر کھڑے ہیں۔ یہ دندیاں بارش اور نالے میں سیلاب آنے کی وجہ سے گرتی رہتی ہیں۔

سانڈ ایک دندی کے دامن میں بیٹھا تھا۔ کسی دونوں طرف سے تنگ تھی۔ تماشائیوں نے ہمیں بتایا کہ سانڈ کو بیٹھا دیکھ کر دو تین آدمی اسے پکڑنے کو بڑھے۔ سانڈ پھنکار کر اٹھا اور یہ آدمی بھاگ آئے۔ انہوں نے بھی کہا کہ یہ سانڈ اب ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اسے ختم ہونا چاہیئے، ورنہ کوئی آدمی مارا جائے گا۔ انہوں نے سانڈ کو مارنے کے دو طریقے بتائے۔ ایک تھا بندوق کی گولی، اور دوسرا یہ کہ دندی کے اوپر سے اس کے آگے زہر آلود چارہ پھینک دیں، مگر سانڈ کے مالک ابھی تک توقع لگائے بیٹھے تھے کہ سانڈ نارمل ہو جائے گا۔

ہمیں سانڈ کے مالک کی بیوی کے متعلق بتایا گیا کہ اُسے سانڈ کے ساتھ اور سانڈ کو اس عورت کے ساتھ اتنا پیار ہے کہ وہ سانڈ کے قریب جاتی تھی تو سانڈ اپنا منہ اُس کے منہ کے ساتھ لگاتا اور اس کے ہاتھ چاٹتا تھا۔ اب وہ اس عورت کو بھی نہیں پہچانتا۔ اس

کے متعلق بتایا گیا کہ وہ سامنے عورتوں میں کھڑی رو رہی ہے۔ اسے آگے نہیں آنے دیتے۔ وہ کہتی ہے کہ اسے سانڈ کے سامنے جانے دیا جائے۔ سانڈ اس کے قابو میں آجائے گا، لیکن گھر کے مرد ڈرتے ہیں کہ سانڈ اس کی ہڈی پسلی کچل دے گا۔ یہ عورت جس کا نام زلیوراں تھا، سب سے کہہ چکی تھی کہ کسی نے سانڈ کو جان سے مارنے کی کوشش کی تو وہ اُس آدمی کو قتل کر دے گی۔

اتنے میں چار یا پانچ آدمی ہماری طرف آئے۔ وہ سانڈ کے مالک کے گھرانے کے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر پہلوان سا آدمی تھا جس کے ہاتھ میں ڈیڑھ دو فٹ لمبا بانس کا ٹکڑا تھا۔ اس میں دوائی ڈال کر بیمار مویشی کے منہ میں ڈالا کرتے تھے۔ کوئی جانور آرام سے دوائی نہیں لیتا۔ اسے رسّیوں سے جکڑنا اور منہ کھولنا پڑتا ہے، پھر بانس کی یہ نال (جسے ہماری زبان میں نَلا کہتے ہیں) اس کے حلق تک ڈال کر دوائی انڈیل دی جاتی ہے۔ یہ کام تجربے اور مہارت کا ہے۔

سانڈ کے مالکان ہمارے کُتّے دیکھ کر ہمارے پاس آئے تھے۔ ان کے ساتھ بانس کے نلے والا جو آدمی تھا، وہ مویشیوں کی بیماریوں کا "سیانا" تھا۔ ان لوگوں کا مسئلہ یہ تھا کہ سانڈ قابو میں نہیں آتا تھا، اس لیے اس کے منہ میں دوائی نہیں ڈالی جا سکتی تھی۔ سیانا پورے وثوق سے کہہ رہا تھا کہ اُس نے نلے میں جو چیزیں ملا کر ڈال رکھی ہیں، اگر سانڈ کے حلق سے اُتر گئیں تو آدھے گھنٹے کے اندر یہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور اس کا دماغ ٹھکانے آجائے گا۔ اُس نے یہ نہ بتایا کہ یہ چیزیں کیا ہیں۔ اُس زمانے میں انگریزی دوائیاں دیہات میں نہیں پہنچی تھیں۔ لوگ دیسی ٹوٹکے استعمال کرتے اور مویشیوں کو تندرست رکھتے تھے۔ سیانے کے دماغ میں ایک ترکیب آئی تھی۔ اُس نے ہمیں کہا "کُتّے سانڈ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے

اگر کسی کُتّے نے سانڈ کو منہ ڈالا بھی تو وہ کُتّے کو جھٹک دے گا۔ اگر سانڈ کو ایک دو خراشیں آ بھی گئیں تو ان کا علاج ہو جائے گا۔ کُتّوں سے ہم یہ کام لے سکتے ہیں کہ یہ سانڈ کو نہیں اتنا بھگائیں اور اسے اتنا پریشان کریں کہ یہ تھک کر چُور ہو جائے۔ تم دیکھنا کہ سانڈ گر پڑے گا، پھر ہم اسے جکڑ لیں گے۔ اس کے حلق سے میری دوائی اتر گئی تو سانڈ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بدمست سانڈ کسی کُتّے کو کچل دے گا۔" میرے ایک دوست نے کہا۔

"اس کُتّے کی جو قیمت مانگو گے، ہم اُس سے دگنی دیں گے" ـــــ سانڈ کے مالک نے کہا ـــــ "اور تم میں سے کوئی زخمی ہو گیا تو جو جرمانہ ہم پر ڈالو گے، ہم ہاتھ جوڑ کر تمہارے قدموں میں رکھ دیں گے۔"

"کُتّوں کے ساتھ تم سب کا ہونا ضروری ہے" ـــــ سیانے نے کہا ـــــ "ورنہ کُتّے بھاگ جائیں گے۔"

ہمارے دوست راجہ افضل کا بولی (بُل ڈاگ) بھی ساتھ تھا۔ افضل نے کہا کہ وہ بُولی کو نہیں چھوڑے گا۔ یہ خونخوار اور بڑا ہی طاقتور کتا تھا۔ کسی کُتّے سے اس کی لڑائی ہو جاتی تو وہ کُتّے کی گردن اُوپر سے منہ میں لے کر ایسا جھٹکا دیتا تھا کہ کُتّے کی گردن ٹوٹ جاتی تھی۔ اگر بڑے جانور پر چھوڑا جاتا تھا تو جانور کی شہ رگ منہ میں لے لیا کرتا تھا۔ ایک بار ایک بھینس اور ایک بار ایک گدھے کو اس نے اسی طرح پکڑا اور انہیں گھٹنوں بٹھا لیا تھا۔ اسے سانڈ پر چھوڑنا خطرناک تھا۔ سانڈ اسے مار ڈالتا یا سانڈ اس کے ہاتھوں مارا جاتا۔ سانڈ کی کھال اتنی نازک نہیں ہوتی کہ اسے کُتّا چیر پھاڑ سکے مگر شہ رگ کُتّے کے منہ میں آ جائے تو دم گھٹنے سے جانور مر جاتا ہے۔

ہم سب نے یہی بہتر سمجھا کہ بوہلی کو نہ چھوڑا جائے۔ ہم دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک پارٹی کو کستی کے ایک طرف سے اور دوسری کو دوسری طرف سے سانڈ کی طرف جانا تھا۔ میرے ساتھ چار لڑکے تھے اور سانڈ کے مالکوں میں سے دو آدمی۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ ہمارے پاس حسبِ معمول ڈنڈے اور چاقو تھے۔ گاؤں کے آدمی ہمیں خبردار کر رہے تھے کہ ہم سانڈ سے بچنے کی کوشش کریں۔

ایک جگہ دس بارہ عورتیں کھڑی تھیں۔ ہمیں ان کے قریب سے گزر کر نیچے جانا تھا۔ ان سے ہم ابھی کچھ دور ہی تھے کہ ایک عورت ان سے الگ ہو کر ہماری طرف آئی اور اُس نے ہمیں روک لیا۔ وہ بڑی اچھی شکل و صورت والی جوان عورت تھی۔ وہ سانڈ کے مالک کی بیوی زیوراں تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس کے دو بچے تھے۔ اُس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور ناک لال تھی۔ وہ روتی رہی تھی۔ یہی وہ عورت تھی جس کے متعلق بتایا گیا تھا کہ اسے سانڈ سے اور سانڈ کو اس سے بہت پیار ہے۔

"اگر تمہارے کتوں نے سانڈ کو زخمی کر دیا تو مَیں کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" اُس نے ہمیں کہا۔

ہمارے ساتھ اس گاؤں کے جو دو آدمی تھے، انہوں نے اُسے کہا کہ وہ فکر نہ کرے، لیکن زیوراں نے دانت پیس کر کہا۔ "مَیں جانتی ہوں تم سب کی نیت خراب ہو گئی ہے۔ مَیں اب بھی کہتی ہوں مجھے آگے جانے دو۔ نیلا میرے آگے نہیں ٹلے گا۔ دشمنوں کو تماشہ نہ دکھاؤ۔"

نیلا اس سانڈ کا نام تھا۔

"ہوش ٹھکانے رکھو زیوراں!" — ایک آدمی نے اُسے بازو سے پکڑ کر پرے لے

جاتے ہوئے کہا ــــ "نیلا اپنے پیدا کرنے والے کو بھی نہیں پہچانتا۔ ہم تمہیں کیسے مروا دیں۔"

"مجھے مرجانے دو پھر میرے نیلے کو مروا دینا" ــــ زیوراں نے کہا۔

وہ بہت جذباتی تھی۔ ان آدمیوں کے بلانے پر تین چار عورتیں آئیں اور اُسے اپنے ساتھ لے گئیں۔ ہم ذرا آگے جاکر ایک ڈھلانی راستے سے نیچے اُترے۔ دوسری طرف سے کُتّوں کا شور اُٹھا۔ اس کے ساتھ ہمارے ساتھیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ کُتّوں کو للکار رہے تھے۔ ہم نے کُتّوں کے پٹّوں سے زنجیریں اتار دیں۔ وہ اپنے ساتھی کتّوں کی آوازوں پر اُدھر کو دوڑ پڑے۔ ہم ان کے پیچھے گئے اور اُس جگہ پہنچ گئے جہاں سانڈ تھا۔ وہاں سے کتّے ذرا فراخ تھی۔ کتّوں نے سانڈ کو گھیر لیا تھا۔ وہ ایک کتّے کی طرف جاتا تھا تو دو تین پیچھے سے اس کی ٹانگوں کو منہ میں لینے کی کوشش کرتے تھے۔ سانڈ پیچھے مڑتا اور سر نیچے کر کے پھنکارتا ہوا کُتّوں کی طرف دوڑتا تھا۔

اتنے میں ہمارے کُتّے بھی پہنچ گئے۔ اب سانڈ دس گیارہ کُتّوں کے گھیرے میں تھا۔ ہم سب کتّوں کے ساتھ تھے۔ چھ سات آدمی گاؤں کے تھے۔ دو کے ہاتھوں میں رسّے تھے۔ سانڈ کا قہر الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ وہ بڑی ہی تیز رفتار سے اپنے سامنے والے کُتّوں کی طرف دوڑتا تھا مگر کُتّے آگے سے ہٹ جاتے تھے۔ تین چار بار اس نے ہم میں سے کسی پر حملہ کیا مگر کتّوں نے اسے دائیں بائیں یا پیچھے کو گھما لیا۔ دو بار تو اس نے ہمارے دو کُتّوں کو کچل ہی دیا تھا لیکن کُتّے آگے سے نکل گئے اور سانڈ کی ٹکر عمودی ٹیلے کو لگی۔

دو آدمیوں کے پاس رسّے تھے۔ ان کی انہوں نے کمندیں بنائی ہوئی تھیں۔ وہ

رسّے گھما گھما کر پھینکتے تھے مگر رسّے کا پھندا سانڈ کی گردن میں نہیں پڑتا تھا۔ اتنے میں زیوراں بھی ہم سے آ ملی۔ اُس کے ہاتھ میں بھی رسّہ تھا۔ آدمی اسے چلّا چلّا کر وہاں سے چلے جانے کو کہہ رہے تھے مگر وہ تو سانڈ کی طرح پاگل ہو چکی تھی۔ دو تین بار وہ سانڈ کے پہلو تک جا پہنچی لیکن اُس کے گلے میں رسّہ نہ ڈال سکی۔ کُتّے سانڈ کو ایک سیکنڈ کے لیے بھی رُکنے نہیں دے رہے تھے۔ کسی مرد نے ابھی سانڈ کے اتنی قریب جانے کی جرأت نہیں کی تھی۔

شاید نصف گھنٹہ گزرا ہوگا کہ سانڈ کا زور سرد پڑنے لگا۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ اس کی پھُرتی اور رفتار کم ہونے لگی تھی۔ کتوں کو وہ اپنے جسم پر منہ نہیں ڈالنے دے رہا تھا۔ ایک بار تو وہ عمودی ٹیلے (ڈنڈی) کے ساتھ جا کر رُک گیا۔ وہ اس قدر ہانپ رہا تھا کہ اُس کی زبان باہر نکل آئی تھی۔ کُتّوں نے اُسے زیادہ دیر رُکنے نہ دیا۔ وہ وہاں سے دوڑا تو سامنے والی ڈنڈی کے ساتھ ساتھ جا رکا۔ اس کے تھک جانے کی وجہ یہ بھی تھی کہ کسّی خشک تھا اور پاٹ ریتلا تھا۔ سانڈ کے پاؤں ریت میں دھنس جاتے تھے۔

وہ جب سامنے والی ڈنڈی کے ساتھ جا رُکا تو مَیں نے زیوراں کو دیکھا۔ وہ بے حد تیز رفتار سے سانڈ کی طرف دوڑی اور چلّائی ——— "کُتّوں کو باندھ لو۔ کُتّے ——— تیز رفتار سے دوڑتی سانڈ کے ساتھ جا لگی اور اس کی آواز سُنائی دی ——— "ٹیلے اب نہ ——— اور اُس نے رسّے کا پھندا سانڈ کے سر پر پھینک دیا۔ سانڈ سر کو جھٹکا دے کر ـ زیوراں نے رسّہ نہ چھوڑا۔ رسّے کا پھندا سینگوں سے نیچے اُتر گیا تھا۔ پھندا تنگ اور سانڈ کے سینگ جو نوکیلے اور کچھ پہلی کے چاند کی مانند تھے، رسّے میں جکڑے گئے۔ سانڈ دوڑا تو زیوراں نے رسّہ نہ چھوڑا۔ وہ گر پڑی اور سانڈ اسے گھسیٹنے لگا۔

ہم نے ابھی کتوں کو پکڑا نہیں تھا۔ کتوں نے سانڈ کو روک لیا۔ وہ پیچھے مڑا۔ زیوراں ریت پر پڑی تھی۔ سانڈ اس کے اُوپر سے گزر گیا۔ اُس کا ایک پاؤں زیوراں کی ران پر پڑا۔ معلوم نہیں یہ زیوراں کا کمال تھا یا یہ اپنے آپ ہی ہو گیا کہ زیوراں کا رسّہ سانڈ کی ٹانگوں میں اُلجھ گیا۔ زیوراں اُٹھی۔ مَیں نے دیکھا کہ اُس کی سفید شلوار لال سُرخ ہو گئی تھی۔ اُس نے پروا نہ کی۔ رسّہ زور سے کھینچا۔ سانڈ کا دم خم بھی ختم ہو چکا تھا۔ وہ پہلو کے بل گرا۔

دو آدمیوں نے یہ پھرتی دکھائی کہ سانڈ کی پچھلی ٹانگوں میں ایک رسّے کا پھندا ڈال دیا اور کھینچ کر ٹانگیں جکڑ دیں۔ ہم نے اُن کے کہنے پر کتوں کو زنجیریں ڈال دیں۔ سانڈ کی زبان باہر نکل آئی تھی اور اس کی سانسیں بُری طرح ہانپی ہُوئی تھیں۔ اس کی اگلی ٹانگوں میں زیوراں کا رسّہ اُلجھا ہُوا تھا۔ اسے کس کر باندھ دیا گیا۔ زیوراں اس کے منہ کے قریب جا بیٹھی اور بولی ــــ "نیلے! ہوش کر مجھے پہچان" ــــ اور زیوراں نے منہ سانڈ کے منہ کے ساتھ لگا دیا۔

اُس کے خاوند نے اُسے دھکا دے کر پیچھے کیا۔ زیوراں پیچھے کو گری مگر تیزی سے اُٹھی اور سیانے سے کہا ــــ "نلا مجھے دو۔ تم اس کا منہ کھولو"۔

سانڈ سینگوں سے بھی جکڑا ہُوا تھا۔ دو آدمیوں نے اس کا منہ کھول دیا۔ زیوراں نے بانس کا نلا اُس کے مُنہ میں ڈال کر دوائی انڈیل دی۔ سانڈ اب ہلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ زیوراں کی شلوار سے خون ٹپکنے لگا تھا۔ ساری شلوار خون سے لال ہو چکی تھی۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔

منٹ گزرتے گئے اور سانڈ بے حس ہوتا گیا۔ زیوراں اس کے منہ کے آگے بیٹھی اس

طرح باتیں کرتی رہی جیسے ماں بچے کے ساتھ پیار کی توتلی باتیں کیا کرتی ہے۔ نصف گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا۔ سانڈ کے جسم نے حرکت کی۔ سیانے نے کہا کہ اس کی ٹانگیں کھول دو۔ ٹانگیں کھول دی گئیں۔ سانڈ جو پہلو کے بل پڑا تھا، سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ زیوراں نے اس کے منہ پر ہاتھ پھیرا تو سانڈ نے آہستہ آہستہ منہ اس کی طرف کیا۔ زیوراں نے گال اس کی ناک پر رکھ دیا۔

زیوراں اٹھ کھڑی ہوئی تو سانڈ بھی اٹھا۔ مردے کر پیچھے ہٹ گئے۔ سانڈ نے کوئی حرکت نہ کی۔ زیوراں تیورا کر گری۔ سانڈ نے جھک کر اسے سونگھا۔ تین چار آدمیوں نے سانڈ کی نتھ پکڑ لی۔ سانڈ نارمل ہو چکا تھا۔ تب زیوراں کو دیکھا۔ ران سے اس کی شلوار پھٹ گئی تھی۔ اسے جو زخم آیا تھا وہ آج بھی مجھے یاد آتا ہے تو میں کانپ جاتا ہوں۔ اس کی ران پر سانڈ کا پاؤں پڑا تھا۔ پٹھا پھٹ گیا تھا۔ سفید ہڈی نظر آ رہی تھی۔ اس عورت نے اسی حالت میں سانڈ کو پکڑا تھا۔ وہ اس وقت گری جب اس کا نیلا نارمل ہو کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

سیانے نے زیوراں کا پٹھا اپنی جگہ کر کے اوپر دو پگڑیاں باندھ دیں۔ کچھ دیر بعد چارپائی آئی تو زیوراں کو اس پر ڈال دیا گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ کمیٹی میلے سے پہلے نیلا تیار ہو گیا تھا اور زیوراں گوجر خان سول ہسپتال سے واپس آ گئی تھی۔ ہم سب میلے پر گئے تھے اور نیلے کو اوّل انعام جیتتے دیکھا تھا، لیکن زیوراں ساری عمر ٹانگ کھینچ کر چلتی رہی۔

جُرم و سزا کے موضوع پر احمد یار خان کی ہمیشہ زندہ رہنے والی کتابیں

کار شلوار اور دوپٹہ	جب مجھے اغوا کیا گیا
بال ایک چڑیل کے	دلیر یا بیوقوف ؟
جب بہن کی چوڑیاں ٹوٹیں	دوسری بیوی
جنّات کے دربار میں	ملاقات اُس مکان میں
سُندری کا سودا	ایک رات کی شادی
روح کے رشتے	جب کالا برقعہ حل رہا تھا
پیار کا پُل صراط	لاش لڑکی اور گف بجے گناہگار
داستان ایک دامادکی	واردات اُس رات کی
رات کا راز	قاضی کی کوٹھڑی اور کنواری بیٹی
دام میں صیاد آگیا	جب پیار نے کروٹ بدلی

مکتبہ داستان پرائیویٹ لمیٹڈ ۲۶ پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور